اردو ناول میں کشمیر کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی

بحوالہ خصوصی آگ (عزیز احمد) اور شکست (کرشن چندر)

(مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

محقق:

ملک جمیل احمد

رجسٹریشن نمبر: 162-FLL/MSURDU/F15

نگران:

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD

Accession No. IH. 22508

اردو ناول میں کشمیر کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی

بحوالہ خصوصی آگ (عزیز احمد) اور شکست (کرشن چندر)

مقالہ نگار:

ملک جمیل احمد

رجسٹریشن نمبر:162-FLL/MSURDU/F15

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

شعبہ اُردو، کلیۂ زبان و ادب

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیوسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۹ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور ایم ایس اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **اردو ناول میں کشمیر کی تہذیب وثقافت کی نمائندگی** (بحوالہ خصوصی آگ (عزیز احمد) اور شکست (کرشن چندر)

مقالہ نگار: ملک جمیل احمد

رجسٹریشن نمبر: 162-FLL/MSURDU/F15

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ایاز افسر
ڈین
کلیہ زبان وادب

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

ڈاکٹر ذوالفقار احسن
شعبۂ اُردو
گورنمنٹ اصغر مال کالج، راولپنڈی
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر طاہر نواز
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
صدر شعبہ (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

2019ء

اقرار نامہ

میں، ملک جمیل احمد حلفاً بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ،اسلام آباد کے ایم ایس(اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹرعزیز ابن الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا اور میرا یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔

(ملک جمیل احمد)

مقالہ نگار

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۹ء

تصدیق نامہ

ملک جمیل احمد نے رجسٹریشن:162 -FLL/MSURDU/F15 کے تحت اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان ''**اردو ناول میں کشمیر کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی، بحوالہ خصوصی آگ (عزیز احمد) اور شکست (کرشن چندر)**'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحنین کو بھجوا دیا جائے۔

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست ابواب

نام ابواب	صفحہ نمبر
پیش لفظ	vi
باب اول: کشمیر کی تہذیب و ثقافت :پس منظری مطالعہ	۱
باب دوم: آگ اور شکست کا موضوع اور کشمیر کی تہذیب و ثقافت	۷۲
باب سوم: آگ اور شکست میں معاشی و معاشرتی تضادات کی عکاسی	۱۲۵
باب چہارم: شکست اور آگ میں کشمیر کی تہذیب و ثقافت کا تقابل	۱۶۴
باب پنجم: ماحصل	۱۹۱
سفارشات	۲۰۴
کتابیات	۲۰۶

پیش لفظ

کشمیر اپنے جغرافیائی محل وقوع، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور خوبصورت فطری مناظر کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کشمیر پاکستان کی شہ رگ اور ایک ایسا خطہ ارض ہے جس کے نام سے بچپن سے واقفیت ہوگئی۔ جس کی وجہ سے کشمیر سے ایک جذباتی تعلق ہے۔ ادب کا طالب علم ہونے کے ناطے میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کشمیر کے حوالے سے کچھ لکھا جائے۔ جس کی وجہ سے کشمیر پر لکھی گئی مختلف کتب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا جس میں ناول کی صنف بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ شوق اس وقت مزید طاقت ور ہوگیا جب استاد محترم ڈاکٹر ارشد معراج سے یہ معلوم ہوا کہ کشمیر کی تہذیب و ثقافت پر ابھی تک کام نہیں ہوا۔ پھر انہی کی مشاورت سے اس موضوع کا انتخاب کیا اور ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب کی نگرانی میں یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''کشمیر کی تہذیب و ثقافت : پس منظری مطالعہ'' کے عنوان سے ہے۔ جس کے تین حصے ہیں۔

الف: تہذیب و ثقافت کے مباحث و عناصر

ب: کشمیر: تاریخ و جغرافیہ

ج: کشمیر کی تہذیب و ثقافت

تہذیب و ثقافت کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کو انتہائی مختصر بیان کیا ہے۔ تاکہ ابتدائی واقفیت ہو جائے۔ اس کے بعد کشمیر کا تاریخ و جغرافیہ اور اس کی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ اس کے پس منظر سے واقف ہوئے بغیر لکھنا بہت مشکل ہے۔ اور نہ ہی مناظر فطرت سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

مقالے کا دوسرا باب ''آگ اور شکست کا موضوع اور کشمیر کی تہذیب و ثقافت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مکمل اور واضح طور پر کشمیر کی تہذیب و ثقافت کو سامنے لایا گیا جس طرح ''آگ'' میں عزیز احمد نے پیش کیا ہے اور ''شکست'' میں کرشن چندر نے کشمیر کی ایک مکمل تصویر سامنے لائی ہے۔ تاکہ قاری کو پڑھتے ہوئے سب کچھ سمجھ آ جائے۔

مقالے کا تیسرا باب ''آگ'' اور ''شکست'' میں معاشی و معاشرتی تضادات کی عکاسی'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں قدیم ہندوستان اور قدیم کشمیر کی معاشی صورت حال اور ''آگ'' میں پیش کردہ معاشی و معاشرتی

منظر نامے پر بات کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ''شکست'' میں پیش کردہ معاشی و معاشرتی منظر نامے کو بھی تفصیل سے دیکھا گیا ہے اور پھر اس باب کے آخر میں ''آگ'' اور ''شکست'' میں معاشی و معاشرتی اختلافات اور اشتراکات پر بات کی گئی ہے۔

مقالے کے چوتھے باب کا عنوان ''شکست'' اور ''آگ'' میں کشمیر کی تہذیب و ثقافت کا تقابل ہے۔ اس میں سب سے پہلے ''شکست'' اور ''آگ'' کی تہذیب و ثقافت کو دیکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ''آگ'' اور ''شکست'' میں پیش کیے جانے والے تہذیبی و ثقافتی عناصر کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کا پانچواں اور آخری باب ''ماحصل'' ہے۔ اس میں تاریخ کشمیر ''آگ'' اور ''شکست'' میں کس طرح کشمیر کو پیش کیا گیا ہے اور پھر ''آگ'' اور ''شکست'' کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔

ابواب بندی کے تعارفی جائزے کے بعد ان احباب کا شکریہ ادا نہ کرنا زیادتی ہوگی جنہوں نے مقالے کی تسوید میں معاونت کی ہے۔ کسی کے احسان کو یاد رکھنا اور مناسب الفاظ میں اسے خراج تحسین پیش کرنا ہماری تہذیبی روایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے آج ان محسنین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے میری معاونت فرمائی۔ اس سلسلے میں میں سب سے پہلے میں اپنے والدین کا ممنون اور احسان مند ہوں جن کی محبت اور شفقت میرے لیے سائبان کی طرح ہے۔ جنہوں نے مشکل حالات میں بھی اپنی دعاؤں کے ساتھ مجھے آگے بڑھنے کا مواقع فراہم کیا۔ میں ان کی صحت اور درازعمری کے لیے ہرلمحہ دعا گو ہوں۔

میں اپنے نگران مقالہ اور صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کا بے حد ممنون اور شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مختلف تحقیقی مشکلات میں آسانی پیدا کی اور میری لغزشوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے رہنمائی فرمائی۔ جس کی وجہ سے مقالہ وقت پر مکمل کرنے میں مدد ملی۔

ڈاکٹر طیب منیر (مرحوم) میرے محسن اور انتہائی شفیق استاد تھے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت میں خوبصورت باغ عطا فرمائے۔ کیونکہ ان کی شفقت اور دعاؤں سے میں آج اس مقام پر ہوں۔ اساتذہ میں ڈاکٹر ارشد معراج صاحب جن سے میرا تعارف بی ایس کے پہلے سمسٹر سے ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک جس قدر شفقت اور محبت کا سلوک کیا ہے اور ایم ایس کے مقالہ کے عنوان سے لے کر مکمل ہوے تک جس طرح رہنمائی فرمائی۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ڈاکٹر ارشد معراج صاحب جیسے اساتذہ کا سایہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے تاکہ ان کی گھنیری شفقت کی چھاؤں میں میرے جیسے طالب علم ادب کو سمجھ سکیں اور زندگی کی معنویت سے آشنا ہوسکیں۔ اس کے علاوہ میرے تین دوست ایسے ہیں جن کا ذکر ناگزیر ہے۔ ان میں امجد کلو، سید ماجد گردیزی اور محمد اسحاق خان جنہوں نے ہرلمحہ میرا حوصلہ بڑھایا یہاں تک

کہ اسحاق بھائی نے کمپوزنگ کے فرائض بھی احسن طریقے سے سرانجام دیے۔ میں ان کا بے حد ممنون اور شکر گزار ہوں۔

ملک جمیل احمد

باب اول

کشمیر کی تہذیب وثقافت : پس منظری مطالعہ

ا تہذیب وثقافت کے مباحث وعناصر

ب کشمیر: تاریخ وجغرافیہ

ج کشمیر کی تہذیب وثقافت

۱۔ ثقافت کیا ہوتی ہے؟

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے جس سے مُراد کسی قوم یا طبقے کی تہذیب ہے۔ ثقافت کسی معاشرے میں موجود ان رسم ورواج اور اقدار کے مجموعے کو کہا جاتا ہے۔ جس پر اسکے تمام افراد مشترکہ طور پر عمل کرتے ہوں۔ یعنی وہ رسم و رواج اور طور طریقے جو ہماری اور آپ کی زندگی پر حکم فرما ہیں۔

دنیا کی تمام قومیں اس بات پر متفق ہیں۔ کہ اگر کسی قوم نے اپنی ثقافت کو بیگانہ ثقافتوں کی یلغار کا نشانہ بننے اور تباہ و برباد ہونے دیا تو بربادی اس کا مقدر ہے۔ غلبہ اسی قوم کو حاصل ہوگا جس کی ثقافت غالب رہے گی۔

تہذیب و ثقافت کا غلبہ ممکن ہے۔ سیاسی، اقتصادی اور فوجی غلبے کی مانند ہمہ گیر برتری کا پیش خیمہ ہو۔ ثقافتی تسلط، اقتصادی اور سیاسی تسلط سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے کہ اگر ایک قوم نے دوسری قوم پر ثقافتی اور تہذیبی غلبہ حاصل کرلیا۔ تو قومی تشخص پر سوالیہ نشان لگ جانے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر کسی قوم کو اس کی تاریخ، اس کے ماضی، اس کی تہذیب و ثقافت اس کے تشخص، اس کے علمی، مذہبی، قومی، سیاسی اور اقتصادات سے جدا کر دیا جائے۔ ذہنوں سے محو کر دیا جائے۔ اس کی زبان کو زوال کی جانب دھکیل دیا جائے۔ اس کا رسم الخط ختم کر دیا جائے تو وہ قوم اعتبار کی مرضی کے مطابق ڈھل جانے کو تیار ہو جاتی ہے۔

طرز زندگی میں لوگوں کا رہن سہن، علوم وفنون، فکر وفلسفہ، معیشت و سیاست کے اصول، شعر ونغمہ، رسوم وعقائد زبان و ادب سبھی کچھ تہذیب و ثقافت میں شامل ہے۔ کچھ لوگ تہذیب و ثقافت کیلئے محض ''کلچر'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور اسے دو قسم کے عناصر یعنی مادی و روحانی کا مرکب قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی تہذیب و ثقافت اور کلچر میں کچھ اس طرح حدِ فاضل قائم کرتے ہیں:۔

> کلچر کے سلسلے میں اب تک ہمارے ہاں دو لفظ استعمال ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک لفظ تہذیب ہے اور دوسرا ثقافت، تہذیب کا لفظ صدیوں سے نہ صرف ہماری زبان بلکہ عربی اور فارسی میں بھی مستعمل ہے۔ جو شائستگی کے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار اور کردار کی شائستگی شامل ہے۔ جیسے کہا جائے کہ تہذیب یافتہ یا مہذب انسان ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اطوار و گفتار میں شائستہ ہے۔ لفظ تہذیب ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جن کا تعلق ہمارے ظاہر سے ہے۔ انسان جس طور پر اپنی معاشرت اور اخلاق کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اس کی تہذیب ہے۔ وہ تمام چیزیں جن کا تعلق ہمارے ذہن سے ہے۔ وہ ثقافت کے زمرے میں آئیں

گیں۔ گویا لفظ تہذیب کا زور خارجی چیزوں اور طرز عمل کے اظہار پر ہے۔ جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار اور کردار شامل ہیں۔ اور لفظ ثقافت کا زور ذہنی صفات پر ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے مجموعے کو کلچر کہیں گے۔ جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفاہیم شامل ہیں۔ اس کے معانی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے۔ جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا خواہ وہ ذہنی ہو یا مادی، خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کر لیتا ہے۔[۱]

لوک رسم و رواج مشترک ہونے کے باوجود ہر قبیلے ہر صوبے اور ہر ملک کی ثقافت مختلف ہے۔ ایک عام آدمی کسی بھی حتمی عقائد پر زندگی بسر نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اپنے قبیلے سماج یا مشترک گروہ میں مل جل کر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوک روایات کسی بھی ثقافت میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ عقیدہ یقیناً بہت اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن روایات بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم روز مرہ کی زندگی، بھائی چارہ، ایک دوسرے کے ساتھ لین دین باہمی تعلقات، رابطے، رفاقت، برادری، سماجی سنگت، صحبت، میل ملاقات اور بول چال کے اشتراک میں ایک دوسرے سے بندھے ہیں۔

عکسی مفتی لکھتے ہیں:

> لوک ریت عوامی ثقافت ہے۔ اس کا عملی زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ چونکہ جو ثقافت ورثہ میں نسل در نسل منتقل ہو وہ باہر سے حاصل کی گئی ثقافت سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ باقی کسی بھی بیرونی چیز سے زیادہ ہماری اپنی شناخت ہے۔[۲]

اگر دیکھا جائے تو آج دنیا کے حالات بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے علاقائیت کیلئے پسندیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ مقبول روایات اور مقامیت کی اہمیت کو نئے سرے سے سمجھا جا رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی ثقافتی رنگا رنگی کا احساس عام ہو رہا ہے۔ یہی احساس لوگوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی میں مضبوط تر ہو رہا ہے۔

کسی بھی ثقافتی ادارے کا تاریخ اور جغرافیہ کو دیکھنے کا رویہ بدل رہا ہے۔ پرانی سوچ تبدیل ہو رہی ہے۔ جس میں گھر بنانے کے طریقے، فن تعمیر، مادی اشیا، دستکاریاں، قدیم نوادرات کو تاریخی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ ان مظاہر کو محفوظ کرنے کی سوچ اب پرانی ہو چکی ہے۔ اب رسم و رواج لوک گیت اور کہانیاں زندگی کی متحرک علامات سمجھی جا رہی ہیں۔

عکسی مفتی اپنی کتاب پاکستانی ثقافت میں لکھتے ہیں:

دن بدن پھیلتی اس رنگ برنگی دنیا میں ہم سب کیلئے یہ لازمی ہو گیا ہے کہ ہم دوسروں کی مختلف ثقافتی شناخت اور زندہ روایات کو تسلیم کرتے ہوئے مل جل کر رہیں۔ ہم آہنگی اور میل ملاپ تو ایسے ہی بڑھے گا۔ معاشرے کے تمام افراد کی شرکت اور اتحاد کو مدنظر رکھ کر بنائی جانے والی پالیسیاں دراصل لوگوں کو ایک لڑی میں پروئے رکھنے کی کوشش ہے۔ سماج میں امن وسکون ایسی ہی پالیسیوں سے آئے گا۔[۳]

ثقافت کسی قوم یا معاشرے کی وہ مشترک خصوصیت ہے۔ جس سے نہ صرف اس کی پہچان ہوتی ہے۔ بلکہ دوسروں سے الگ بھی کرتی ہے۔ کوئی بھی ثقافت انسان کے اندر مختلف قسم کے عناصر کا اضافہ کر کے انسان میں ایسی اقدار کا اضافہ کر دیتی ہے۔ جس سے وہ سکون محسوس کرتا ہے۔ جس کا مقصد اور جہت، اصول اور اقدار کی شکل اختیار کر کے نئے معانی کے ذریعے نئی چیز متعارف کرواتی ہے۔ جس کو دیکھتے ہوئے سارا معاشرہ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ جہاں سے پھر نئی تخلیقات کا اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے میں معاشرہ فرد کی شخصیت کا جزو اور فرد معاشرے کی شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں۔ کسی بھی زندہ معاشرے میں یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ ثقافت ایک طرف فرد میں اور دوسری طرف بحیثیت مجموعی سارے معاشرے کے ہر شعبے میں تخلیق کی آگ روشن رکھتا ہے۔ تخلیق کی صلاحیت پھر معاشرے اور ملک کے ہر شعبے پر روشن نظر آتی ہے۔ جیسا کہ تجارتی مراکز، معاشی نظام، دفتری کاروبار، بڑھئی اور لوہار کی ہنر مندی، ملکی اشیاء، تعلیمی اداروں، ادبی تخلیقات، موسیقی، خوش آئند دُھنوں، غرض ہر جگہ اس کا وجود پایا جاتا ہے۔

پاکستانی کلچر میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:۔

ہر معاشرے میں معیار دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ معیار جو ہماری اور آپ کی باطنی شخصیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور جس کی مدد سے ہم سب اپنی زندگی میں پیدا ہونے والے چھوٹے بڑے مسائل کا حل آسانی سے تلاش کر لیتے ہیں۔ اور زندگی کے ہر موڑ پر فیصلہ کر کے اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کو دھوکا دینا بُری بات ہے۔ جب ایک ''مہذب'' شخص کسی کو دھوکا دیتا ہے تو اس کے اندر ایک ایسی خلش پیدا ہو جاتی ہے جو اُسے بے چین کر دیتی ہے۔ یہ معاشرے کا وہ معیار ہے۔ جو اس شخص کی باطنی شخصیت کا جزو ہے۔ اسی کا نام ''ضمیر'' ہے۔ اس ''معیار'' کے بنانے میں معاشرے کے عقائد، روایت اور رسم ورواج، خیر وشر کے تصورات بنیاد کا کام کرتے ہیں۔

دوسرا معیار وہ ''قانون'' ہوتا ہے۔ جو مملکت بناتی ہے۔ عام طور پر صحت مند معاشروں میں قانون

معاشرے کی باطنی شخصیت کی تدوین کا درجہ رکھتا ہے۔ معاشرے کی باطنی شخصیت اور ملکی قانون میں کسی قسم کا تصادم یا تضاد نہیں ہوتا۔ اسی لئے ایسے معاشروں میں قانون نظام اخلاق بن کر معاشرے کے اندر اخلاقی ولولہ پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے۔[۴]

کلچر کا مسئلہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے:

طرز زندگی جو کسی قانونی چیز کے بغیر، رضا کارانہ معاشرے کے سب افراد میں کم و بیش مشترک حیثیت رکھتی ہے۔ اور حسن کی شان رکھتی ہے۔ جس سے زندگی زیادہ بامعنی اور پُر راحت بن جاتی ہے۔ یہ کلچر ہے۔[۵]

کلچر کیلئے زبان کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ کیونکہ اگر زبان ہے تو کلچر ہے۔ اگر کلچر ہے تو زبان ہے۔ زبان ایک ایسی بنیادی چیز ہے۔ جسے انسان کی معاشرت پسند طبیعت نے تخلیق کیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو زبان اصل میں انسان کی معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے میں بہترین کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ اگر زبان نہ ہو تو سارے کا سارا معاشرہ گونگا تصور کیا جائے گا۔ کوئی کسی سے نہ تو بات کر سکے گا۔ اور نہ کوئی کسی کی بات سنے گا۔ اس سے نہ تو معاشرہ ترقی کرے گا اور نہ ہی کلچر۔ زندگی کا پہیہ رک جائے گا۔ کوئی کام نہیں ہو پائے گا۔ زبان ایک ایسا احساس ہے۔ جس کے ذریعے ایک انسان دوسرے انسان کے تجربات، خیالات، محسوسات اور جذبات میں شریک ہوتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جس کی وجہ سے طرز فکر و عمل میں مماثلت پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر یہی طرز فکر و عمل کی مماثلت کسی معاشرے میں تہذیبی و معاشرتی یک جہتی پیدا کرتے ہوئے مشترکہ کلچر جنم دیتی ہے۔ زبان کیونکہ ایک سماجی فعل ہے۔ اس لیے معاشرے کا پورے کا پورا کلچر زبان کے گرد گھومتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

وہ لوگ جو اس سلسلے میں یہ کہتے ہیں۔ کہ پہلے اپنی زبان کو اس لائق تو بناؤ۔ کہ وہ تعلیم کے اظہار کا وسیلہ بنائی جا سکے۔ وہ یہ بتانا ہمیشہ بھول جاتے ہیں۔ کہ آخر چلتی گاڑی میں پہیہ کیسے بدلا جا سکتا ہے؟ جب تک ہم اپنی زبان کو قبول نہیں کریں گے۔ اسے نہیں برتیں گے، اس میں اپنی صلاحیتوں کا خون شامل نہیں کریں گے، اسے معاش کا وسیلہ نہیں بنائیں گے، آخر وہ زبان کس طرح پروان چڑھے گی؟[۶]

تہذیب و ثقافت کیلئے ہر کسی نے اپنی اصطلاح استعمال کی ہے۔ کیونکہ یہ طرز زندگی کے متعلق ہے۔ اور طرز زندگی میں لوگوں کا رہن سہن، فکر و فلسفہ، علوم و فنون، اصول معیشت و سیاست، شعر و نغمہ، رسوم و عقائد اور زبان و ادب

سب کچھ شامل ہے۔ اس لیے یہ تعریف نہ صرف تہذیب کا احاطہ کرتی ہے۔ بلکہ تمدن و ثقافت پر بھی محیط ہے۔ کسی نے تہذیب و ثقافت کیلئے ''کلچر'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اور اسے دو قسم کے عناصر یعنی ''مادی و روحانی'' کا مرکب قرار دیا ہے۔

سبط حسن! تہذیب و ثقافت کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> کسی معاشرے کی با مقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنون لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد و افسوں، اخلاق و عادات، رسوم و روایات عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے متعلقہ مظاہر ہیں۔ ۷

ڈاکٹر سلیم اختر! دریا اور اس لہروں کی مثال دیتے ہوئے تہذیب اور کلچر کے درمیان فرق کچھ اس طرح سمجھاتے ہیں:۔

> تہذیب اور کلچر میں فرق یہ ہے کہ تہذیب ایک ایسا دریا ہے جس کا منبع کہیں دور ماضی بعید کی تاریکی میں پنہاں ہے اور اسی دریا کے مختلف مقامات پر ابھرتی اور ڈوبتی لہریں بھی نکلتی ہیں اور اس میں نئے دریا بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ مختلف تہذیبیں اور کلچرل اثرات ہیں۔ ہزار روپے بدلنے پر بھی کلچر پانی کی وہ لہر ہی رہے گا جو دریا کا ایک حصہ ہے۔ یہ الفاظ دیگر ہزار تنوع کے باوجود بھی تہذیب اور کلچر کی اساس ایک ہی ہوتی ہے۔ اور ہونی چاہیے۔ ورنہ عملی زندگی میں تضادات جنم لیتے ہیں۔ ۸

ڈاکٹر وزیر آغا، تہذیب اور ثقافت کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دیتے ہو لکھتے ہیں:۔

> تہذیب اور ثقافت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ثقافت تخلیقی رخ ہے اور تہذیب تنقیدی رخ۔ ثقافت فنون لطیفہ، سائنس کی دریافتوں اور ایجادات کے علاوہ عام زندگی میں اپج، تنوع اور روحانی آفت کی صورت میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ مگر تہذیب مزاجاً رجحان نقل کے تابع ہے۔ ۹

تہذیب، تمدن، ثقافت اور کلچر کے مباحث بہت دلچسپ اور طویل ہیں۔ مگر ان میں الجھنے کی بجائے ہم صرف تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے بات آگے بڑھائیں گے۔ کیونکہ جب بھی تہذیب و ثقافت کی بات کی جائے۔ تاریخ کو ضروری دیکھنا پڑتا ہے۔ روگردانی کی صورت میں مکمل حقائق سامنے نہیں لائے جا سکتے۔ تاریخ مشاہدے کی وسعت،

تجربات میں پختگی اور احساس وشعور کو نئی سمتوں سے آشنا کرتی ہے۔ تاریخ کے واقعات فطری طور پر ایک دوسرے کے باطن سے ابھرتے ہیں۔ خلا میں ایک دوسرے سے وقوع پذیر نہیں ہوتے۔ تاریخ روایات کہن اور نقوش پارینہ کا ہی خزینہ نہیں۔ بلکہ ہماری ذہنی، فکری، جذباتی وتہذیبی اور معاشرتی وثقافتی سفر کی ارتقائی داستان ہے۔ اور اگر فکر وعمل پر تاریخی وتہذیبی روایات کی گرفت کمزور پڑ جائے تو بے یقینی اور انتشار سے یہ سفر سست روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ آج اگر دیکھا جائے تو ہماری شخصیت اور کردار پسپا نظر آتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ اپنے ماضی کو بھلا دینا ہے۔ ماضی سے غفلت ہے۔ ثقافت سے روگردانی اور حقیقی تصورات سے دوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تخلیقی ذوق کمزور پڑ گیا ہے۔

انسانی تہذیب کائنات کی اہم ترین اصطلاح شمار ہوتی ہے۔ لیکن اس کی تعبیر ایسے مختلف انداز سے کی گئی ہے۔ کہ اس کے اپنے اساسی معانی غائب ہو کر رہ گئے ہیں۔ تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے مختلف معانی ہیں۔ جیسے کسی پودے یا درخت کو کاٹنا اور تراشنا تا کہ نئی شاخیں پھوٹیں۔ فارسی میں کسی شے کا آراستہ، پاک اور درست کرنا ہے۔ اردو زبان میں اس کے معانی مودب، بااخلاق اور شائستہ ہونا، روایت کا احترام وغیرہ اور انگریزی زبان میں کلچر کے لغوی معانی ریشم کے کیڑے پالنا، ذہنی اور جسمانی اصلاح وترقی وغیرہ۔

تہذیب کے متعلق محمد مجیب کا کہنا ہے:

> ہم جسے تہذیب کہتے ہیں۔ اس کے معانی ہیں دین، ایمان، دھرم، قانون اور علم کے سائے میں زندگی بسر کرنا اپنی محنت سے زندگی کو سرسبز رکھنا، نیک حوصلوں سے اس کو رونق دینا اور صنعت وتجارت کے ذریعے سے وہ چیزیں حاصل کرنا جن سے آرام پہنچتا ہے۔ ہر قوم اپنی زندگی اپنی طبیعت اور مذاق کے ڈھنگ پر بناتی اور سنوارتی ہے۔[۱۰]

کسی بھی ملک کی تاریخ اور سیاست کا اس وقت تک اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جب تک اس کی تہذیب کا مطالعہ نہ کر لیا جائے۔ تہذیب نام ہی ایسا ہے۔ جس کے ذریعے انسان اپنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو تربیت دیتے ہوئے کام میں لاتا ہے۔ جماعتوں کی تہذیب، افراد کی محنت، صلاحیت، ذوق یا فکر کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان جماعتوں کے اندر جو منصوبے بنتے ہیں۔ اور پھر حوصلوں کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ یہ اصل میں تہذیب پروان چڑھ رہی ہوتی ہے۔ کیونکہ انہی چیزوں سے تہذیب بڑھتی ہے۔ انسانی تہذیب میں بعض قوموں کا حصہ زیادہ اور بعض کا کم ہے۔ کچھ قومیں تہذیب کی علم بردار ہوتی ہیں۔ تو کچھ اپنی نا اہلی اور مجبوریوں کی وجہ سے محروم رہتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ترقی کا سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔تہذیب کی قدریں مٹتی نہیں ہیں۔صرف ان کے حامل بدل جاتے ہیں۔گھر تہذیبوں کی پرورش کیلئے ایک بہترین سکول کا درجہ رکھتا ہے۔کیونکہ گھروں میں ان افراد کی پرورش ہوتی ہے۔جو تہذیب کی داخلی قدروں کے حامل ہوتے ہیں۔رسم ورواج گھروں میں ہی برتے جاتے ہیں۔اس لیے خانگی زندگی کو قومی تہذیب کی جان قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

جب بھی کوئی تہذیب وجود میں آتی ہے۔تو اس کی افزائش خود بخود آگے نہیں بڑھتی بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک تہذیب وجود میں آتی ہے۔لیکن وہ آگے نہیں بڑھ پاتی۔لہذا تہذیب کا وجود میں آنا اور نشوونما پانا دو علیحدہ علیحدہ منازل ہیں۔اور پھر فطرت کی اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔کیونکہ جب کوئی ادارہ یا تہذیب وجود میں آتے ہیں تو انہیں ایک نہ ایک دن زوال پذیر ہونا ہی پڑتا ہے۔ادارہ یا تہذیب بھی ایک فرد کی طرح مختلف منازل سے ہوکر گزرتے ہیں۔جس طرح ایک فرد بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک کا سفر کرتا ہے۔اسی طرح تہذیب بھی انہی ادوار سے گزر کر اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔قدرت کا اصول تہذیب اور فرد کیلئے تقریباً ایک جیسا ہے۔

تہذیب وثقافت کے قافلے کا سفر تاریخ کا موضوع ہے۔کہانیوں اور افسانوں سے زیادہ دلچسپ تہذیب کی تاریخ افراد یا بادشاہوں کی تاریخ نہیں بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ ہے۔ایک قوم کا زوال دوسری قوم اور ایک سلطنت کا زوال دوسری سلطنت کیلئے ترقی کا سبب بنا۔اسی لیئے تہذیب وثقافت کا یہ قافلہ ابھی تک چل رہا ہے۔اور چلتا رہے گا۔

ہم کیونکہ تہذیب ثقافت کو دیکھ رہے ہیں۔اس لیے اسی کو آگے بڑھاتے ہیں۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ تہذیبیں زوال کا شکار کیوں ہوتی ہیں؟ اس سوال کے جواب میں رابرٹ بریفالٹ نے تہذیبی نشوونما، عروج وزوال کو سیاست، بربریت اور تہذیبی اشتراک واستفاد سے منسلک کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> کوئی سا مہذب ترین معاشرہ بھی دوسرے مہذب معاشروں سے آزادانہ ومتواتر ارتباط کے بغیر نشوونما نہیں جاری رکھ سکتا۔ ہر عظیم تہذیب خواہ وہ یونانی ہو یا رومی، عربی ہو یا یورپی، جتنی وسیع ہوتی گئی اسی قدر زیادہ مفید اور قابل قدر ہوتی گئی نیز جس تہذیب میں کہولت، انحطاط بدعنوانی اور زوال وتباہی کا میلان پایا جائے اس کا مطلب یہی ہے کہ اس میں دروغ گوئی اور بددیانتی راہ پا گئی ہے اور تہذیب کے پھیلاؤ کی جگہ جھوٹ، منافقت اور کرپشن اس کی بقا کیلئے اصل خطرہ ہے۔[۱۱]

یہاں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ قومیں اپنے ماضی سے سبق سیکھ کر حال اور مستقبل کو بہتر بنانے میں ہمہ

وقت کوشاں رہتی ہیں اور وہ قومیں قبل مسیح یعنی قدیم ماضی سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ اگر اس وقت اتنی مہذب اور ترقی یافتہ تھیں تو ہم آج سفر طے کرنے کے بعد ترقی کی بجائے تنزلی کی طرف کیوں گامزن ہیں۔ جبکہ ایک نسل جس ترقی پر سفر کا اختتام کرتی ہے دوسری نسل اس سے آگے یعنی اس عمارت کے اوپر اپنی عمارت تعمیر کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن تاریخ و تہذیب میں ایسا کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ کیوں؟

تاریخ اور تہذیب کی تلاش کا عمل دراصل انسان وجود کو جاننے اور سمجھنے کا عمل ہے۔ انسانی تاریخ کسی طرح اپنی منازل طے کرتی ہے۔ کیا اتار چڑھاؤ اسے دیکھنے پڑتے ہیں۔ یہ سوال آج بھی بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیوکہ کوئی بھی تہذیب ایک دن میں جنم نہیں لے لیتی اس کے لیے صدیوں پر محیط انسانی سفر درکار ہوتا ہے۔ اور یہی سفر بعد میں قواعد وضوابط وضع کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اور پھر یہی قواعد وضوابط تاریخ کا حصہ بن جایا کرتے ہیں۔

ثقافت کا مادی اور مذہبی نظریہ:

دنیا کی ابتداء سے لے کر موجودہ زمانے کا انسان مختلف ادوار سے گزر چکا ہے۔ ہر زمانے میں اس نے ترقی کی منازل طے کیں اور آگے بڑھا ہے۔ مثال کے طور پر اگر زندگی کے ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ انسان نے سب سے پہلے جنگلی اور وحشی زندگی سے آغاز کیا پھر وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ خانہ بدوشی کی طرف سفر کیا، پھر اس کے اندر قبائلی احساس پیدا ہوا بستیاں بسائیں، قصبوں اور شہروں کی بنیاد رکھی پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اس نے اپنی ضروریات خود پیدا کیں بلکہ ایجادات، اختراعات اور مختلف علوم وفنون پر دسترس حاصل کی اس سے اس کی فہم وفراست اور قوت ادراک میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ تہذیب وثقافت کا یہ سلسلہ بڑھتا رہا اور تاریخ بنتی رہی۔ انسان کا عروج وزوال اس کے قصے، کہانیاں، اس کی معاشی اور معاشرتی ترقیاں، اس کے علوم و مذاہب کے کارواں، تہذیب وتمدن کی کہانیاں تاریخ ہی کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ اسی لئے زمانہ ماقبل از تاریخ سے اب تک انسان نے جتنی ترقی کی ہے وہ ہمیں تاریخ ہی نے بتائی ہے۔ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' کے مصداق اگر دیکھا جائے تو انسان نے ہمیشہ مشکلات سے ٹکرا کر اپنے لئے آسانیاں پیدا کی ہیں۔ اور جوں جوں اس نے یہ کام کیا ہے۔ اس نے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ یہی وہ مشکل حالات تھے جن پر بہادری اور حوصلے سے انسان نے قابو پایا اور اپنے آپ کو متمدن بنا دیا۔ مذہب نے انسان زندگی میں تہذیب وتمدن، نظم وضبط، اصول، روایات، قوانین کی پاسدرری، مال وجان کی حفاظت اور ذمہ داری جیسی نمایاں صفات نے انسان کو تہذیب یافتہ بنا دیا۔ اسی کے بارے میں پروفیسر عمر زبیری کہتے ہیں:

وادی نیل، وادی دجلہ، فرات اور وادی سندھ کی زرخیزی نے انسانوں کو تہذیب وتمدن کے ابتدائی مدراج سے روشناس کرایا اور پھر ان ہی وادیوں میں حکومتیں قائم کیں۔ موہنجوداڑو اور بابل جیسے شہر آباد کیئے گئے۔ اہرام مصر کی حیرت انگیز تعمیرات بھی فن تحریر کی ایک ایجاد کا مقابلہ نہ کرسکیں اور انسان اپنا معلم آپ بن گیا کیوں کہ اس نے علوم وفنون ایجاد کیے اور قوانین بنائے۔[۱۲]

انسان کو سب سے پہلے اس ماحول کا احساس ہوا جو اس کے اردگرد تھا۔ اس کے بعد اُسے اُس رشتے کا شعور ہوا جو اسے دوسروں کے ساتھ کرنا پڑا چاہے وہ انسان ہوں یا اشیاء۔ اسی کے ساتھ اُسے اپنی ذات کا شعور حاصل ہوا اور تب اُسے موجودات عالم اور فطرت کا شعور ہوا۔ لیکن اس وقت تک فطرت کے ساتھ انسان کا رابطہ دراصل حیوانی تھا۔ لیکن جب انسان کی ضروریات بڑھیں تو اس نے اپنی تسکین کے لیے آلات و اوزار بنائے۔ اس سے تقسیم کار نے رواج پایا۔ جسمانی اور دماغی محنت کی تقسیم ہوئی تو ساتھ ساتھ اس غلط فہمی کی بنیاد بھی پڑی کہ شعور گردوپیش کے حالات سے الگ کوئی آزاد اور وجود بالذات حقیقت ہے۔ حالانکہ شعور انسان کے ذہن سے باہر کی حقیقتوں کا شعور ہوتا ہے۔ خواہ یہ مادی حقیقتیں ہوں یا غیر مادی اور سماجی حالات کا پابند ہوتا ہے۔

جمیل جالبی اپنی کتاب پاکستانی کلچر میں شاہ ولی اللہ کیا کہتے ہیں۔ رقمطراز ہیں:

منجملہ اس کے ایسے آلات کا حاصل کرنا ہے جن کے بغیر کھیتی کرنا، درخت لگانا، کنواں کھودنا اور چوپایوں کو مسخر کرنا وغیرہ نہیں ہوسکتا جیسے بھاڑا، ڈول، ہل، رسیاں اور اس کے علاوہ دوسرے آلات ہیں۔ منجملہ اس کے اشیاء کا تبادلہ اور دوسرے معاملات جو بعض امور میں ضروری ہیں، سیکھے۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑا احسان کیا کہ اس نے اپنی کتاب عظیم میں اس ارتفاقی کی تمام شاخوں کا الہام کردیا۔[۱۳]

جن چیزوں کی طرف شاہ ولی اللہ نے اشارہ کیا ہے۔ اس میں تمام چیزوں، آلات بنانے کے فن اور چوپایوں کو مسخر کر کے جو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اُسے مذہب کا ایک لازمی حصہ قرار دیا ہے۔ جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ اس نے مذہب کو زندگی اور اس کی ساری سرگرمیوں کے ساتھ وابستہ رکھنے کی تلقین کی ہے۔ تاکہ مسلمان اپنے مذہب کو درست اور صحیح طریقے سے آگے بڑھا سکیں۔ یہی تو وہ چیز ہے۔ جس سے ہم نے اپنے آپ کو دور کیا اور مذہب کو محض نام نہاد روحانیت کے زندان میں قید کر دیا۔ جس کے ہر طرف ضیف الاعتقادی، رہبانیت اور عادات کا کڑا پہرا ہے۔ یہاں پر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہر چیز ٹھہر گئی ہو اور زندگی نے اپنے آپ کو جامد کر دیا ہو۔ اب ایک طرف عقیدہ ہے

اور دوسری طرف جذبات آخر لوگ اس ذہنی فریب سے اپنے آپ کو کب نکالیں گے۔ ایسے میں ہر نئی چیز اور ہر نیا خیال نہ صرف شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ معاشرہ اس کی تکذیب کرنے کے ساتھ اس کے وجود کو بھی ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے کے اندر توازن اتنا بگڑ جاتا ہے کہ سارے رشتے زیر و زبر ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ تمام تر مسائل کو جذباتی بنیادوں پر حل کیا جانے لگتا ہے۔ اسی حوالے سے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> سر سید احمد خان نے جب مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کرنا چاہا اور سہارنپور میں انگریزی مدرسے کی بنیاد ڈالنا چاہی تو ''اہل زبان'' ڈنڈے لے کر ان کے پیچھے پڑ گئے اور سر سید کو بھاگ کر علی گڑھ میں پناہ لینا پڑی۔[۱۴]

اسی بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> یہی وہ نکتہ ہے جسے شاہ ولی اللہ نے پا لیا تھا۔ کوئی نظام حیات، کوئی مذہب اس سے مُنہ موڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جو معاشرہ توانائی کو اپنے تصرف میں آنے کی صلاحیت کا جتنا اظہار کرے گا اسی اعتبار سے وہ ترقی کی طرف آگے قدم بڑھا سکے گا۔[۱۵]

نئے اور جدید زرعی نظام نے انسان کو اس قدر کامیابی دی کہ غذا کے ساتھ دوسری اشیاء زیادہ مقدار میں آسانی سے پیدا کرنے کے طریقے سیکھ لیئے اور اپنے زندگی گزارنے کے عمل کو بھی جدید کیا۔ کیونکہ سب کچھ جنگلوں میں اور پتھر کے دور میں نہ ممکن تھا۔ مادی ثقافت دراصل ان تمام چیزوں کے ذریعے ترقی کا نام ہی تو ہے۔ انسان جب ان تمام چیزوں پر قابو پا چکا تو اس کی آبادی بڑھنے لگی اب اُسے ایک نیا چیلنج درپیش تھا کہ اس آبادی کو کیسے آباد کرنا ہے۔ اور اس کی غذائی ضروریات کو کیسے پورا کرنا ہے۔ اس کے لیے اس نے جدید طرز پر منصوبہ بندی کی جس سے معاشرے کی آبادی کے ایک حصے کو اس نے غذائی ضروریات پورا کرنے پر لگا دیا۔ اور دوسرے حصے کو اور مختلف کام دے دیئے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ صلاحیتوں اور پیشوں کے اعتبار سے طبقوں میں تقسیم ہونے لگا۔ اس طرح ایک طرف معاشرتی تہذیب کی ترقی کے راستے کھل گئے تو دوسری طرف اس نے نئی چیزیں پیدا کرنا شروع کر دیں۔ اس زرعی انقلاب کی وجہ سے جو معاشرہ خون کے رشتوں کی بنا پر اکٹھا جل رہا تھا۔ آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے جب مختلف قبیلے ایک دوسرے کے اندر ضم ہونے لگے تو یہ نظام بھی بکھرنے لگا۔ معاشرتی تنظیم جو زرعی انقلاب کے زیر اثر پروان چڑھ رہی تھی اس کا یہ عمل ایک مملکت کی صورت میں سامنے آیا۔ جس نے معاشرے کو ٹوٹنے سے بچایا۔ اور ایک معاشرتی نظام کی بنیاد رکھی۔ اس معاشرتی نظام نے آگے چل کر معاشرے کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حکمران طبقہ اور دوسرا محکوم

طبقہ۔محکوم طبقہ سارا دن کام کاج کے ذریعے دولت کماتا اور حکمران طبقہ مختلف طریقوں سے اسے جکڑ کر اپنے استعمال میں لے لیتا۔ یہ وہ عمل تھا جس کی وجہ سے محکوم طبقے کی دلچسپی دولت سے کم ہونے لگی۔ اس کی بڑی وجہ دولت کا محکوم اور بے بس طبقے پر خرچ نہ کرنا بنا۔ اس عدم مساوات کی وجہ سے دونوں طبقے اب صرف اپنی حفاظت اور بقا کی جنگ لڑنے لگے جس سے ترقی کی شرح کم ہوگئی اور وہ تمام ادارے جو انسانی ضروریات پورا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ معاشرتی حالت سے تنگ آ کر سب کچھ بند کر دیا۔ اب یہ سب صرف اور صرف اس وقت ممکن تھا جب توانائی کے نئے ذرائع دریافت کیے جاتے اور مساوات کا ایک نظام وضع کیا جاتا۔ کیونکہ معاشرے کی بقا اسی میں تھی۔

مشرق میں زرعی انقلاب کے ٹھہراؤ کے بعد مغرب نے توانائی کے نئے ذرائع دریافت کیے اور انہیں اپنے استعمال میں لے کے آیا۔ جیسا کہ تیل، کوئلہ اور گیس وغیرہ یہی وہ ذرائع تھے جس کی وجہ سے ۱۷۳۰ء میں انگلستان سے صنعتی انقلاب کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ صنعتی انقلاب ۱۸۰۰ء اور ۱۸۵۰ء میں پورے یورپ اور امریکہ میں پھیل گیا۔ جس سے انگلستان کی گرفت کمزور ہوئی۔ جب مصنوعات کی پیداوار میں اضافہ ہوا تو یہ محسوس کیا گیا کہ ان کی کھپت بھی تلاش کی جائے جس کے لیے ایشیاء اور افریقہ کی منڈیوں کو تلاش کیا گیا۔ جس سے دنیا کے اکثر ممالک پر اہل مغرب کا سیاسی اور اقتصادی تسلط قائم ہوگیا۔ جوں جوں تجارت بڑھی پیسے کی ریل پیل نے حالات بہت زیادہ گھمبیر بنا دیئے اس کے تحفظ کیلئے متعدد خونریز جنگیں لڑی گئیں۔ معاشی، عسکری اور آپس کی نااتفاقی نے اہل مشرق کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ وہ اہل مغرب کا مقابلہ نہ کر سکے اور خس وخشاک کی طرح بہہ گئے۔ انگریزوں نے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور یہاں کے رہنے والے لوگوں کو غلام بنا کر اپنی صنعتوں اور کارخانوں کو چلانے کے لیے اپنے ملک لے گئے اس کے علاوہ اپنی صنعتوں کو چلانے کے لیے بہت بڑی تعداد میں خام مال بھی لے جایا جانے لگا۔ اہل چین نے کچھ مذاہمت کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں پہلے تو غلام بنا کر اور دبا کر افیون خریدنے اور کھانے پر مجبور کیا پھر انہیں فوجی چڑھائی کے ذریعے دبا دیا اور الٹا انہیں تاوان دینے پر بھی مجبور کیا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مشرق کا خواب غفلت میں سونا تھا۔ لیکن جب حالات حد سے زیادہ بڑھے تو ان کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں۔ جس کی ابتداء جاپان سے ہوئی۔ اس کے بعد اہل مشرق نے اہل مغرب سے جان چھڑانے کیلئے خوب تگ ودو کی حالانکہ اہل مغرب نے بھی اپنی تمام تر توانیاں صرف کیں۔ تاکہ اجاری داری قائم رہے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ جو کچھ اہل مغرب نے اہل مشرق کے ساتھ کیا اس کی ایک تصویر علی عباس جلالپوری کی زبانی: ''اہل مغرب زبان سے انسانی برادری اور انسانیت عالیہ کا دم بھرتے ہیں، لیکن مشرق کی ''رنگ دار'' اقوام کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔''[۱۶]

برعظیم کے مسلمانوں کی زندگی نہ صرف مسلسل تبدیلیوں سے دوچار ہوتی رہی بلکہ اسلامی تہذیب کے اثرات بھی

دیگر مذاہب اوران کے ماننے والوں نے بہت حدتک قبول کیئے۔جس سے جذبہ ایثار،قربانی، رواداری اور احساسات کوتقویت حاصل ہوئی اس کے علاوہ یہاں کے رہنے والے لوگوں کے فکروخیال اورفہم وفراست میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ جہالت اور تاریکی کے بادل چھٹتے گئے۔صدیوں سے رائج حاکمیت کا تصورٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا۔ کیونکہ اسلام اللہ کی وحدنیت کے اندررہ کر مقامیت کوتسلیم کرتا ہے۔اور مقامی ہوتے ہوئے دنیا سے Intract اسلام خواہ مخواہ مقامی ثقافت کے اندر دخل اندازی نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام اپنے اندر آہستہ آہستہ جذب کرتا ہے۔اور اس کے فروغ کی کوشش کرتا ہے۔تا کہ مقامی اقدار اسلام کے بنیادی عقائد سے بالکل برعکس نہ ہوں۔اس لیے اسلام اس میں مداخلت نہیں کرتا۔ اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ اسلام جہاں جہاں گیا اس نے مقامی ثقافت کو اہمیت دی۔ اسلام ایک وسیع سوچ رکھنے والا مذہب ہے۔لیکن بدقسمتی ہے کہ اسلام کے تصورات کوخود مقامی ثقافتوں نے دھندلا کر دیا ہے۔اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام پرمنفی اثرات ڈالنے والے قبائلی اور جاگیردارانہ معاشروں کی علاقائی اور ثقافتی رسموں کوتبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔تا کہ اسلام کے تصورات کا درست چہرہ لوگوں کے سامنے لایا جاسکے۔

اب ہمارے سامنے دورویے ہیں ایک رویہ وہ جب انسان پتھر کے دور میں رہتا تھا پھرترقی کرتے کرتے وہ سائنس کے دورتک پہنچا۔ اورنئی نئی ایجادات کو دنیا کے سامنے لایا اور انسان کو ایک دوسرے کے اس قدرقریب کر دیا کہ شاید اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مذہب کو نئے معاشرے کے تہذیبی عوامل میں شامل کیا جانا چاہیئے یانہیں۔ کیونکہ جس دور میں انسان مادی لحاظ سے کمزور تھا اس وقت مذہب ٹھیک تھا۔لیکن اب جبکہ انسان ترقی کرتے کرتے کائنات کوتسخیر کرتے ہوئے چاند اور نئے سیاروں کی تلاش کا سفر کر رہا ہے۔ایسے میں بھلا مذہب کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ کیونکہ آج کا انسان اپنے آپ کو بہت زیادہ مہذب کہتا ہے۔ اور اس کے ذہنی رویے بلندیوں کو چھورہے ہیں۔لیکن افسوس ہے ان اقوام پر جو اپنے آپ کوآج مہذب اورترقی یافتہ کہہ رہی ہیں۔اپنی اقدار سے روگردانی کررہی ہیں۔ اوراپنی تاریخ کو دیکھ کرانہیں شرم محسوس ہورہی ہے۔ وہ تاریخ جسے ہمارے اسلاف نے رقم کرتے کرتے اپنی جانیں کھپادی تھیں۔لیکن اس سب کے باوجود کیا ہمیں اپنی منزل کا کوئی علم ہے کہ وہ کہاں ہے؟ ہم تیزی سے مغرب کے دیے گئے جدید اور سائنسی علم کی طرف بڑھ تو رہے ہیں لگ ایسے رہا ہے جیسے اس میں ہمارے شعور کا کوئی کردارنہیں ہے۔جس طرح ہم اسے قبول کررہے ہیں۔

دوسرا رویہ یہ ہے کہ کیا آج بھی مذہب کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی آج سے کئی سوسال پہلے تھی۔ جدید دنیا کی ترقی اورمختلف قسم کے مسائل سے نمٹنے کیلئے ضروری ہے کہ مذہب اور اس کی اقدار سے جڑا رہنا چاہیے۔ کیونکہ یہ

ہمارے لیئے اتنا ہی مفید اور کار آمد ہے جو آج سے کئی سو سال پہلے تھا۔ جمیل جالبی مذہب کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''مذہب مادیت کا دشمن اور روحانیت کا نام ہے۔ اسے ہمیں اسی شکل میں قبول کرنا چاہیے جس شکل میں اسلاف سے ہم تک پہنچا ہے'' ۱۷

اس ساری بحث سے اندازہ ہوا کہ ہمارا معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک طرف مذہب اور دوسری طرف جدید مغربی ترقی۔ حالانکہ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ سائنس کا تعلق بھی عقل انسانی سے ہے۔ لیکن آج مذہب کو محض عبادات تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اس پر کوئی خاص تحقیقی کام نہیں ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے آج مذہب معاشرے پر اثر انداز ہونا بند ہو گیا۔ اس کی جگہ جدید مغربی افکار نے لے لی ہے۔ کیونکہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ترقی کرنی ہے اور آگے بڑھنا ہے تو جدید دور کے ساتھ چلنا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ''مذہب'' کو محض روحانیت کا نام دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ جدید سائنس نے مذہبی عقائد کو بہت مجروح کیا ہے۔ علم الانسان، نظریہ ارتقاء، تقابلی مذہب اور تحلیل نفسی کے طلباء نے مذہب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مذہب آج کل انسان کو مطمئن کرنے سے قاصر ہے۔ اسی حوالے سے جمیل جالبی لارڈ برٹرنڈ رسل کا قول لکھتے ہیں:

> میں تمام مروجہ مذاہب کا منکر ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہر قسم کا مذہبی عقیدہ مٹ جائے گا۔ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ بحیثیت مجموعی مذہبی عقیدہ نیکی اور بہتری کا باعث ہوتا ہے۔ اگر چہ مجھے تسلیم ہے کہ بعض زمانوں میں اور بعض مقامات پر مذہب کے اثرات اچھے بھی ہوئے ہیں لیکن میرے خیال میں مذہب انسانی عقل فرد کے دور طفلی سے یادگار ہے۔ اور انسانی ارتقاء کے ایسے مراحل سے تعلق رکھتا ہے۔ جنہیں ہم بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ ۱۸

جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا ایک کلچر ہے۔ اسی کے مطابق ہمیں بنایا گیا ہے۔ اگر ہمیں خود کو بدلنا ہے۔ تو ہمیں دوبارہ اپنے کلچر کی تشکیل کرنا ہو گی۔ تا کہ نئے تناظر میں رکھ کر اس کے نئے معانی تلاش کیے جا سکیں جو ہمارے معاشرے کے سارے ذہنی، روحانی اور مادی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں کیونکہ ہر کلچر اور اس کا نظام اپنا ایک الگ تصور حقیقت رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے کلچر ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں۔ جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> اپنے تصور حقیقت کا جدید ذہنی و مادی تقاضوں کے پیش نظر از سر نو جائزہ لینے کا کام ایسا آسان کام نہیں ہے جسے ہم چند مہینوں میں انجام دے سکیں، لیکن اس کی ضرورت و اہمیت کے شعور کے ذریعے

ہمارے ہاں خیال کی تاریخ تخلیق کرنے کا عمل شروع ہوسکتا ہے۔ فی الوقت تو خیال کی سطح پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں اور صدیوں سے اسی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس میں بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا اگر ہم زمانے کو بھی اسی جگہ ٹھہرا لیتے۔ اسی لیے ہمارے ہاں ذہن کا عمل دو انتہاؤں پر ہو رہا ہے۔ ایک انتہا وہ ہے جو اس دائرے کو توڑ کر باہر نکل جانا چاہتی ہے۔ اور ایک وہ جو ہر قیمت اور ہر صورت میں اسی دائرے میں رہنا چاہتی ہے۔ ایک انتہا پر وہ لوگ کھڑے ہیں جو عقیدے کی موجودہ تاویل کو اسی شکل میں باقی رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور ایک پر وہ جو ان سب کو چھوڑ، مغرب کے ساتھ مل کر، ان جیسے بن جانا چاہتے ہیں۔ عقیدہ نہ پہلی صورت میں باقی رہ سکتا ہے اور نہ دوسری صورت میں۔ ۱۹

مشینی دور جس طرح ہمیں متاثر کر رہا ہے۔ اور ہم خود بھی صنعتی ترقی کی خاطر جس طرح مشینی نظام کو قبول کر رہے۔ اس سے ہمارے مزاج بھی بدل رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے اطوار، آداب، رہنے سہنے کے طریقے بھی تبدیل ہو رہے یہی عمل اسی طرح جاری رہا تو بعید نہیں کہ ہم خود بھی اتنے بدل جائیں گے کہ ہمارے عقیدے کی موجودہ صورت باقی نہیں رہے گی۔

جب بھی مذہب اور کلچر یا مذہب کے ساتھ کلچر کا کیا تعلق ہے بات کی جائے گی تو پوری زندگی کو دیکھا جائے گا۔ اس میں وہ تمام سرگرمیاں خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی، خارجی ہو یا داخلی کو زیر بحث لایا جائے گا۔ مذہب انسان کو نیک اور خیر کے کام کرنے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ ساتھ ہی بُرے اور شر کے کاموں سے روکتا ہے۔ مذہب ہی انسان کو زندگی کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کی تلقین کرتا ہے۔ یہی اسلام کی اصل روح ہے اور مکمل دین بھی۔ مذہبی اصول اور عقائد کی ہماری زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ تاکہ ہم اسی کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے رشتوں کو مضبوط بنا سکیں۔ کیونکہ یہی اصول اور عقائد ہمارے معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہی سے معاشرہ ترقی کرتے ہوئے آگے اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے۔ اور ایک بہترین کلچر پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ہم نظام حیات کی ثقافت کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ کلچر معاشرے میں پروان چڑھتا ہے اور اصول و عقائد معاشرے کے استعمال میں آتے ہیں۔ تو اس سے بنیادی تہذیبی ادارے وجود میں آتے ہیں۔ ان اصول و عقائد کو جس طرح معاشرے میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے جو شکلیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ جو وہ مشاغل کرتا ہے اپنے عقائد کی جس طرح توجیہہ پیش کرتا ہے۔ جس طرح وہ مذہبی شعور کو دیکھتا اور سمجھتا ہے یہ سب چیزیں اس کے مذہب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ان تمام چیزوں کی شکلیں اور تاریخ و روایت سبھی مذہب کا حصہ تصور ہوتے ہیں۔ کوئی نظام اور کوئی اصول و عقائد

معاشرے کے بغیر نہیں چل سکتا، بے کار ہے۔ لیکن معاشرے میں زندگی گزارنے کیلئے کسی نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں قوالی، خطاطی و نقاشی بہت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔ بلکہ اب تو اذان، مسجد اور محراب اور منبر جس طرح ہمارے کلچر کا حصہ مانے جاتے ہیں۔ انہیں بھی مذہب کا ایک حصہ تصور کیا جانے لگا ہے۔ یہی وہ تمام چیزیں ہیں جن سے مذہب انسانی زندگی میں پیش آنے والے ہمارے مسائل سے آگاہ ہوسکتا ہے۔ جسے بعد میں ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔ مذہب کبھی بھی اتنا مشکل نہیں ہوسکتا جتنا مشکل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی زندہ مثال ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ ہیں جن کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنی امت کے لیے وہی پسند کرتے تھے جس میں آسانی ہوتی تھی۔ لیکن ساتھ یہ بھی مدنظر رکھتے تھے کہ میری امت کے لیے کونسی چیز حلال اور فائدہ مند ہے۔ اور کونسی چیز حرام اور نقصان دہ ہے۔ آپؐ نے اپنی ساری زندگی بہت سادہ اور مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے گزاری ہے۔ جسے نصب العین قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب زندگی میں عملاً دیکھنے اور برتنے کا عمل شروع ہوتا ہے اور اس عمل سے جو معاشرتی، تہذیبی، معاشی و سیاسی نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کی ساری شکلیں ایک کلچر کا حصہ بن جاتی ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم خطبات اقبال میں لکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ نے بڑی نکتے کی حکیمانہ بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> نبی کی تعلیم میں ایک جزو اس قوم کے مزاج اور اس کی خصوصیات سے تعلق رکھتا ہے۔ کوئی نبی تمام اقوام کے مزاج کے مطابق اور مختلف ملتوں کی روایات کے موافق الگ الگ شریعتیں تو پیش نہیں کر سکتا۔ اسے پہلے اپنی قوم ہی کو تیار کرنا ہے تا کہ اس کی اساس پر ایک کلی شریعت کی تعمیر بعد میں قائم ہو سکے۔ نبی کلی حقائق کا اطلاق اپنی قوم کے مخصوص حالات پر کرتا ہے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کسی کلی کا ایک جز کی حالت پر اطلاق جزئیت اور ہنگامی اصلاح کو کلی نہیں بنا سکتا۔ جرائم اور ان کی سزائیں خاص طور پر قومی مزاج سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ان کا اطلاق ہمیشہ تمام اقوام پر نہیں ہوسکتا [۲۰]

کسی نظام کو چلانے اور اس کو بہتر بنانے کیلئے اس کے بنانے والوں کے پاس ایک مقصد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ انہیں بے معنی نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں۔ حضور پاکؐ اور ان کے خلفائے راشدین کے زمانے میں اس وقت کے عربوں کے سامنے ایک ہی مقصد تھا کہ اسلام کو کیسے دنیا میں پھیلایا جائے اور پھر ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں نے اپنی دعوت اور محنت سے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اور معاشرے کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اصل کام سے توجہ نہیں ہٹائی۔ جس کے ذریعے سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اگر ہم نے اصل کام کو چھوڑ دیا تو ہم اسلام کا نفاذ نہیں کر سکیں

گے۔ اپنے اندر ترقی کو پیدا کرتے ہوئے کچھ ایسی چیزیں جنہیں ایک وقت میں اسلام میں بڑا سمجھا جاتا تھا آہستہ آہستہ ان کو بھی شامل کیا جانے لگا جیسا کہ موسیقی، شاعری اور مصوری۔ موسیقی سے صوفیائے کرام معرفت الٰہی حاصل کرنے لگے۔ مصوری بت پرستی سے نکل کر انسانی احساس و جذبات کا اظہار کرنے لگی۔ اسلام کا نظام حیات اصل میں یہی ہے۔ وہ معاشرے کو اعتدال میں لے کے چلنے کی بات کرتا ہے تاکہ بگاڑ پیدا نہ وہ لیکن جو باتیں غلط ہیں انہیں دلیل کے ساتھ واضح بھی کرتا ہے۔ تاکہ خوشگوار ماحول برقرار رہے۔ کیونکہ جب معاشرہ بہترین ہوگا تو کلچر بھی مضبوط اور اچھا ہوگا۔

اسلام کے سامنے ایک مقصد تھا جس کی وجہ سے عرب سے نکل کر برعظیم میں کامیابی سے قدم رکھا یہاں کے لوگ اس سے مستفید ہوئے اور مسلمانوں کی زندگی مسلسل تبدیلی سے دو چار ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ اسلامی تہذیب کے اثرات دیگر مذاہب اور ان کے ماننے والوں نے کافی حد تک قبول کیے جس سے ایثار، قربانی، رواداری کے جذبات اور احساسات کو تقویت حاصل ہوئی اور ساتھ ہی برعظیم میں رہنے والے لوگوں کے فکر و خیال اور فہم و فراست میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ جہالت اور تاریکی کے بادل چھٹتے گئے۔ مسلم تہذیب کے آنے سے صدیوں سے رائج حاکمیت کا نظام بکھر گیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے نہ صرف وہاں کے سیٹ اپ میں تبدیلی رونما ہوئی بلکہ برعظیم کے نظام حکومت میں انتظامی وحدت کی صورت بھی نظر آنے لگی۔ جس سے معاشرہ ترقی اور خوشحالی کی جانب بڑھنے لگا۔ ''شودر کا دھرم یہ تھا کہ تینوں اونچی ذات کے لوگوں کی ہر طرح سے خدمت کرے۔ وہ دینی کتب پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی سن سکتے تھے۔''[۲۱]

جوں ہی مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ زندگی کے تمام شعبوں میں مساوات، بھائی چارہ، انصاف اور رواداری جیسی صفات قائم ہوئیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوؤں کا اکثریتی طبقہ مسلم تہذیب کی طرف مائل ہوا تو یقیناً اس کی سب سے بڑی وجہ صوفیاء کی محنت تھی۔ ہر دور میں دو طبقات روئے زمین پر رہے ہیں ان میں ایک طبقہ بادشاہوں کا ہے جن کا تعلق ہمیشہ خواص کے ساتھ رہا ہے۔ اور دوسرا طبقہ صوفیا کا جن کا تعلق عوام کے ساتھ رہا ہے اور ان کے مفادات بھی عوام کے ساتھ وابستہ رہے وہ عوامی ثقافت کے محافظ تھے، طبقاتی نظام اور اونچ نیچ کے مخالف تھے، سادگی پسند تھے، مساوات کے قائل تھے، انسان دوستی کا درس دیتے تھے۔ وہ حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کر کے سب کے لیے ایک ہی نظام لانا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حکمران طبقوں سے دور ہوتے گئے اور عوام کے ساتھ گھل مل گئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کرنے والوں میں صوفی اپنی مرتاضانہ تربیت کے باعث عالم اور

فقہیہ کے مقابلے میں عوام الناس کے زیادہ قریب تھا کیوں کہ مؤخر الذکر بالعموم تعصب اور کردار سے عاری ہوتا ہے اور اس میں گہرے روحانی احساس کا بھی فقدان ہوتا تھا۔ صوفی ہر شہر قصبہ اور گاؤں میں اپنے اردگرد اپنے مریدوں کا ایک حلقہ قائم کر لیتا تھا اور اس کے بیرونی حلقہ ادارت میں غیر مسلم اور خاص طور پر اچھوت ذات کے ہندو شامل ہوتے تھے۔۲۲

ان صوفیا کا عوام پر بڑا گہرا اثر تھا اس لیے حکمرانوں نے اس میں مصلحت سمجھی کہ ان کی تعظیم کی جائے۔ بعض جگہوں پر، مثال کے طور پر مغربی پنجاب اور سندھ میں روحانی رہنما اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے عوام کی شکائیتں رفع کراتے تھے۔ لیکن عام طور پر صوفیا دنیاوی معاملات سے دور رہتے تھے۔

مسلمان صوفیا نے ایسے ایسے مراکز قائم کیے ہوئے تھے۔ جہاں سے وہ اسلام کی تبلیغ آگے پھیلاتے۔ ان کی خانقاہیں ایسی تھیں جہاں سے لوگ درس و تدریس کے ساتھ شریعت اور طریقت کے روحانی منازل طے کرنے کے لیے تربیت حاصل کرتے تھے۔ دراصل یہ وہی لوگ جنہوں نے اسلام کا پیغام برعظیم کے کونے کونے تک پہنچایا جہاں تک کبھی حکومتیں اور ان کے لشکر بھی نہیں پہنچے تھے۔ امراء اور بادشاہوں کی حکومتیں تو ریاستوں اور علاقوں پر تھیں اور وقت کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ لیکن صوفیا لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے ان کی حکومت پر کبھی کوئی اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے اعمال و کردار، درس و تدریس سے لوگوں کے دلوں کو منور کرتے تھے۔ اور اس سے لوگوں کو سکون نصیب ہوتا تھا۔ جب بھی لوگ حرص و حوص کے دلدادہ حکمرانوں سے پریشان ہوتے انہی درباروں پر حاضری دیتے اور اپنا اندر سکون کی حس بحال کرتے۔ اسی حوالے سے خاور جمیل لکھتے ہیں:

حرم، مسجد اور خانقاہ اسلامی روحانیت میں پیش پیش ہیں۔ میکدہ تو بس عجمی شاعروں کے عالم خیال میں آباد رہا اور یوں منبر سے واعظ نے گناہ گاروں کو ڈرایا تو مسند سخن سے غزل گو نے معاملات محبت کا ترنم چھیڑا اور خدا کو ساقی کہہ کر اس سے جام سرور طلب کیا۔۲۳

مسلم تہذیب کے ہمہ گیر پہلوؤں نے برعظیم کے ہر حلقے کو متاثر کیا۔ اسلام کے بنیادی اصولوں نے تمام طبقوں کے باشندوں کو جینے دینے کا حق دیا اور کسی سے بھی امتیازی سلوک روا نہ رکھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب پھلتی پھولتی چلی گئی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ برعظیم میں مسلم تہذیب کے اندر اختلاف پیدا ہونا شروع ہو گئے جس کی وجہ سے پورے ہندوستان کا امن وسکون غارت ہو گیا۔ مسلم تہذیب کی اقدار کو پامال کرتے ہوئے نقوش کو بری طرح مسخ کیا گیا۔ جہاں مسلم تہذیب نے آنے کے بعد ہندو تہذیب پر اپنے اثرات چھوڑے وہیں ہندو

تہذیب نے مسلم تہذیب کو بھی متاثر کیا۔ اس طرح ایک مشترکہ تہذیب نے جنم لیا۔ بعد میں یہ ہندو مسلم تہذیب مختلف خصوصیات کا مرقع بن گئی اور زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ اس بارے میں صباح الدین عبدالرحمن لکھتے ہیں: ''مسلم تہذیب نے جہاں ہندومت تہذیب پر اثرات چھوڑے وہاں خود مسلم تہذیب نے کسی حد تک ہندومت تہذیب کے اثرات کو قبول کیا۔'' ۲۴

ان دو ہندی، مسلم تہذیبی ملاپ سے ایک مشترکہ ہندی مسلم تہذیب معرض وجود میں آئی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی بہت سی روایات، اقدار طرز زندگی اور رسوم رواج کو اپنایا۔ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد نے مسلم تہذیب و ثقافت کو اپنے وجود کا حصہ بنایا۔ جہاں مسلم تھی وہاں ہندی تہذیب کے اثرات بھی گہرے تھے۔ جو آج بھی کہیں نہ کہیں دونوں طرف دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان دونوں تہذیبوں سے جو آمیزہ وجود میں آیا وہ نہ تو مکمل اسلامی تھا اور نہ ہندی بلکہ دونوں تہذیبوں کی مشترکہ چیز تھی جو صدیوں تک جاری رہی۔

یہ بات درست ہے۔ کہ برعظیم میں ہندی تہذیب نے اسلامی تہذیب پر بڑے گہرے اثرات مرتب کئے اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی بہت سی ثقافتی اقدار اور رسوم و رواج کو اپنایا۔ اس طرح ہند اسلامی تہذیب بڑی تیزی سے ابھر کر سامنے آئی۔ جس سے مسلم تہذیب غالب ہونے کے باوجود دامن نہ بچا سکی۔ اس وقت یہاں ایک ایسی تہذیب موجود تھی جس کا اپنا ایک مخصوص کلچر اور روایات و اقدار تھیں۔ یہ روایات و اقدار پورے برعظیم کے لوگوں کی پہچان تھیں اور لاکھوں لوگ اس تہذیب و ثقافت سے جڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی ہو رہی تھیں جو کہ اس تہذیب کے پھیلاؤ اور ترقی کا اظہار تھیں۔

تاریخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب ہندوستان میں مغل داخل ہوئے تو اپنے ساتھ ترکوں اور ایرانیوں کو بھی لائے تو گویا برعظیم میں ترکوں اور ایرانیوں کی آمد سے ترک اور ایرانی تہذیب بھی داخل ہو گئی۔ کہا جاتا ہے بابر اگرچہ اپنے ساتھ اسلامی تہذیب لے کے آیا۔ جس میں ترکی اور ایرانی تہذیب و ثقافت کی آمیزش تھی۔ ترک اور ایرانی بھی اپنے ساتھ اپنی تہذیبی روایات اور ثقافتی روایات لے کے آئے جن کے اثرات ہندوستانی تہذیب پر بھی پڑے۔ حالانکہ ہندوستانی تہذیب دیگر اور بہت سی تہذیبوں کا مجموعہ تھی۔ جہاں ہندو مسلم تہذیب کے اثرات قبول بھی کر رہے تھے۔ اور اثر انداز بھی ہو رہے تھے۔ گویا دونوں تہذیبیں ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں۔ جس سے بہت سی نئی چیزوں نے جنم لیا۔ رہن سہن اور زبان تک ہر چیز اس تبدیلی کے عمل سے متاثر ہوئی۔ ان تبدیلیوں کو دونوں تہذیبوں نے قبول کیا۔ کافی حد تک دونوں تہذیبوں سے وابستہ افراد نے ان رجحانات اور طرز فکر کو سمجھتے ہوئے اپنایا۔ جس سے دونوں کے درمیان محبت اور خلوص کے جذبات پھلے پھولے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے علوم و فنون

اور حکمت سے استفادہ کیا۔ بلکہ ان کو مکمل طور پر اپنی زندگی کا حصہ بنایا۔ یہاں تک یہ علوم وفنون ہندو تہذیب کا باقاعدہ حصہ بن گئے۔ جن سے ہندو مذہب نے بھی گہرے اثرات قبول کیے۔ اس بارے میں ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں: ''ہندو مذہب نے حکمت جیسے مسلم عناصر کو جذب کیا، بلکہ خود ہندو تمدن کی روح اور ہندو ذہن بھی تبدیل ہو گیا'' ۲۵

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی صورت یکسر بدل کر رہ گئی۔ ایک نئی تہذیب جو مغربی میلانات، روایات اور رجحانات لئے ہوئے تھی برعظیم پر چھا گئی۔ ایسا مقامی مسلم تہذیب کی شدید شکست وریخت کی بدولت ہی ممکن ہوا۔ انگریز چوں کہ حاکم تھا اُسے اپنی تہذیب کو فروغ دینا کوئی مشکل نہیں تھا۔ رہی سہی کسر مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی تہذیب سے بیگانگی ظاہر کر کے پوری کر دی۔ اور انگریزی تہذیب کو بڑے شوق سے اپنایا۔ یہ وہ گروہ تھا جس نے ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور گلیوں کی رونق کو آباد کیا۔ یعنی مادر پدر آزاد گروہ۔ دن ہو یا رات یہ اپنی روایات کی پرواہ کیئے بغیر انگریزوں کا ہمنوا اور مغربی تہذیب کا دلدادہ نظر آیا۔ اس آزاد خیال طبقے کی وجہ سے عام مسلمانوں اور ہندوؤں میں بھی آزادی کا عنصر پروان چڑھنے لگا۔ قدیم ہندو مسلم تہذیب اور مغربی تہذیب کی آمیزیش سے ایک نئی ثقافت ابھری لیکن قدیم اور جدید قدروں کے ساتھ ساتھ مذہبی منافرت سے اس ثقافت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔

انگریزوں، مراعات یافتہ طبقوں اور مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگوں نے مسلم تہذیب کے نقوش بگاڑنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ برعظیم کے مسلمانوں کے اندر جو بنیادی سوچ مسلم علوم کے حوالے سے کافی لمبے عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ اس پر کاری ضرب لگی۔ اسلامی علوم کی جگہ مغربی علوم نے لے لی۔ جو باہمی تضادات اور اختلافات کا باعث بنی۔ اس سے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان اختلافات شدید ہوتے گئے۔ عربی، فارسی اور دوسری بہت سی زبانیں جو مسلم تہذیب و ثقافت کی عکاس اور مسلم تہذیب و ثقافت کی روایات اور اقدار کو نمایاں کرنے میں مددگار تھیں ان کو مدارس سے ختم کر کے انگریزی تعلیم کو لاگو کر دیا گیا۔ انگریزوں کے اس عمل اور مسلم کش سوچ نے مسلمانوں کے جذبات کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہندو تھے۔ جنہوں نے بڑھ چڑھ کر انگریزی تہذیب کو قبول کیا۔ بلکہ حکومتی مراعات ملنے پر ہر معاملے میں ان کے ہمنوا بن گئے۔ جس کی وجہ سے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط ہوئے اور مسلمان تباہی و بربادی کے علاوہ شدید نقصان سے دوچار ہوئے۔ اس مخصوص طبقے کے حوالے سے قراۃ العین حیدر کی رائے:

ہندوستان کے اوپری طبقے کی یہ وہ نسل تھی جو انگریزوں کو رسوں اور مورس ناچوں کے زیر اثر پروان

چڑھی۔ عجیب ترحم انگیز اور مضحکہ خیز دوراہے پر یہ لوگ زندہ تھے اپنے آپ کو ہندوستان کی پرانی فیوڈل تہذیب کا یہ وارث بھی گردانتے تھے اور ہر وقت اپنی تعریف میں مصروف رہتے تھے ۲۶

کچھ لوگ یہ سوچتے ہوئے بہت زیادہ خوش تھے کہ مغربی تہذیب اپنانے سے انگریز ان پر مہربان ہو جائے گا اور انہیں مراعات اور سہولتوں سے نواز دے گا۔ لیکن یہ سوچ ان کی محض کم عقلی اور کوتاہ بینی پر مشتمل تھی۔ انگریزوں نے اس نام نہاد مغرب زدہ طبقے پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ الٹا انہیں تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بنایا۔ انگریز حکمرانوں نے ہندوستان کے مقامی لوگوں کے لیے پہلے فارسی کی بجائے اردو پھر ہندی اور پھر انگریزی زبان کو رائج کیا۔ مدرسوں کی جگہ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ منطق، فلسفہ و الہیات کی جگہ سائنس لازمی قرار دے دی۔ بادشاہت کی بجائے جمہوریت، ریل کا نظام، آب پاشی کا نظام، ذرائع آمدورفت کے لیے سڑکیں، حکمرانی کے لیے نئے اصول وضوابط رائج کیئے۔ جاگیرداروں نے انگریز سرکار کی غلامی پر فخر کیا وران کے بچے علی گڑھ سے لے کے آکسفورڈ کیمبرج اور میونخ تک علم حاصل کرنے کے لیے جانے لگے۔

انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سماجی میل جول نے ایک نئے اینگلوانڈین طبقے کو جنم دیا جس کا مذہب کے ساتھ دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اس میں ہندو مسلم دونوں طبقات شامل تھے۔ اس لیے اس طبقے نے معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی سطح پر ہندوستان کی تہذیب و ثقافت پر اتنے گہرے اثرات چھوڑے کہ ان سے انحراف کرنا ممکن نہیں۔ اس طبقے کی بڑھتی ہوئی جدت اور مغربیت نے ہندوستان کے مقامی لوگوں کی سوچ کے زوایے تبدیل کر دیئے۔ اس طبقے کی روشن خیالی جو مادر پدر آزادی تک پہنچ چکی تھی، نے لوگوں کے ذہنوں پر بہت گہرے اثرات مرتب کیئے۔ اس طبقے کی زندگی مغربی روایات و اقدار کے ساتھ ایسے جڑی ہوئی تھی کہ مقامی باشندوں میں سے کچھ نے اپنی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے اپنے مذہب کو چھوڑ کر عیسائیت کو اپنا لیا۔ اس طبقے میں سے کچھ لوگ اس قدر آگے چلے گئے کہ انہوں نے اپنے تعلقات استوار رکھنے کے لیے انگریزوں سے شادیاں کیں اور اینگلوانڈین کہلائے۔ اس میں ہندو، سکھ اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔ اینگلوانڈین طبقے نے برعظیم پاک و ہند کی اجتماعی تہذیب کا نقشہ بدل کے رکھ دیا۔ ایک مشہور کہاوت ہے ''کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا'' اس کے مصداق اس طبقے میں نہ تو مشرقی تہذیب کا عکس جھلکتا تھا اور نہ ہی مغربی تہذیب اس کی پہچان بن سکی۔ آزاد خیال یہ طبقہ ہندوستانی لوگوں کیلئے نا قابل قبول تھا۔ یہ طبقہ اگرچہ ہندوستان کی تہذیب کا ہی پروردہ تھا لیکن اس کی روایات مشرق سے بالکل مختلف تھیں۔ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید نے انہیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس طبقے نے تو مشرقی روایات و اقدار کو بھی روند ڈالا۔ اس بارے میں شمیم احمد لکھتے ہیں:۔

اگر ہم گہری نظر سے دیکھیں تو یہ طبقہ جہاں مغربی اقدار کے تحت اس کے فکری غلبے کا ثبوت مہیا کرتا ہے تو وہاں اس بات کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ آنے والا زمانہ مغربی، تہذیب کی توسیع کا زمانہ ہوگا ان میں اکثر کا المیہ یہ ہے کہ وہ مغرب کے بے روح اور بے جہت معاشرے میں کہیں کے نہیں رہتے [۲۷]

مقامی ہندوستانی تہذیبین زوال کا شکار ہونے کے باوجود آگے بڑھتی چلی گئیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی طرز زندگی، جدید معاشرتی تبدیلیوں اور لباس کو مقامی طبقوں نے اختیار کر لیا اسی لیے مسلمانوں کی اکثریت معیوب ٹھہری۔ اور ان کو ہمیشہ مشکوک سمجھا گیا۔

بدقسمتی سے اس وقت مسلمان معاشرہ ثقافت پیدا کرنے کے بجائے مغربی ثقافت کا صارف ہے۔ اور اگر مسلمان اپنی ثقافتی شناخت کے لیے اپنی مذہبی روایات پر رہنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے مغرب کو مختلف خدشات لاحق ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے مختلف حالات سے مجبور ہو کر مغرب کو سمجھنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ لیکن وہ اس میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ افسوس اس بات پر ہے کہ مغرب نے اسلامی دنیا پر اپنی اجارہ داری تو قائم کر لی لیکن خلوص نیت سے کبھی اپنا نہیں سمجھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ اور مغرب اپنی برتری اور مستی میں مست ہے۔ اُسے کسی اور کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر دیکھا جائے تو جس طرح مغرب نے مسلمانوں اور ان کے مذہب کے خلاف پراپیگنڈہ کیا ہے۔ لیکن اسلام اس چیز کی کسی صورت اجازت نہیں دیتا۔

تہذیب کے عناصر

دنیا کی کوئی بھی تہذیب ہو وہ چار عناصر سے مل کر بنتی یا مکمل ہوتی ہے۔

۱۔ طبعی حالات

۲۔ آلات واوزار

۳۔ نظام فکر واحساس

۴۔ سماجی اقدار

اس میں مشرق مغرب، شمال جنوب اور سرد گرم علاقوں کی کوئی قید نہیں۔ چنانچہ انڈونیشیا اور افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والوں کی تہذیب کے بھی یہی عناصر ہیں جس طرح استنبول، ماسکو، لندن، بیجنگ، کوالمپور پیکنگ اور پیرس کے باشندوں میں یہ ہوسکتا ہے کہ ان عناصر کی حیثیت مختلف تہذیبوں کے ساتھ مختلف ہو یا ایک دوسرے سے زیادہ نمایاں۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ان میں سے کچھ عناصر کسی تہذیب میں موجود ہی نہ ہوں۔ ان سب کے درمیان ایک رشتہ ہے یہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

۱۔ طبعی حالات:

تہذیب کی تشکیل اور تعمیر میں طبعی حالات کا بڑا دخل ہوتا ہے ہر تہذیب کا اپنا مخصوص جغرافیہ ہوتا ہے۔ اس کے دریا اور پہاڑ، جنگل اور میدان، پھول پھل اور سبزیاں، چرند پرند، آب وہوا اور موسم یعنی اس کا خارجی ماحول اس کے طرز عمل، ذریعہ معاش، رہن سہن، خوراک و پوشاک، مزاج و مذاق، اخلاق و عادات جذبات و احساسات غرض انسانی زندگی کے ہر پہلو پر اثر ڈالتا ہے۔

یہی وجہ کہ ریگستانی علاقوں اور برفانی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی تہذیب مختلف ہوگی اسی لیئے عربوں کی تہذیب ہماری تہذیب سے مختلف ہے۔ خارجی حالات کسی قوم کی ہی صرف تہذیب ہی نہیں بناتے۔ بلکہ افراد کی شخصیت بنانے بگاڑنے میں بھی خارجی ماحول کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مثلاً جھونپڑی میں رہنے والے بچے اور شہر کے رہنے والے بچوں میں فرق ہوتا ہے۔ تہذیب کے ابتدائی دور میں انسان کی زندگی ہر لحہ طبعی ماحول کے تابع تھی وہ اس پر قابو پانے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ تاہم بعد ازاں انسان نے اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر ماحول کو بدلنے کی جدوجہد کی انسان کی پوری تاریخ فطرت کو تسخیر کرنے سے بھری ہوئی ہے۔ مختصراً یہ کہ طبعی حالات انسانی تہذیب و

ثقافت پر مسلسل اثر انداز ہوتے ہیں۔ تاہم انسان نے ایک لمبی جدوجہد کے بعد طبعی حالات کو اپنی گرفت میں لینے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ صنعت وحرفت اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی ترقی نے طبعی حالات کی اہمیت ثانوی کر دی ہے۔

۲۔ آلات وآوزار:

انسانی تہذیب کی ترقی آلات وآزار کی ترقی پر منحصر ہوتی ہے۔ جس قسم کے آلات واوزار ہوں گے تہذیب بھی اسی قسم کی ہوگی اس لیے تہذیب کے بعض ارتقائی ادوار کو تہذیب کے آلات و اوزار کی مناسبت سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً

☆ پتھر کا دور وتہذیب

☆ کانسی کا دور وتہذیب

☆ لوہے کا دور وتہذیب

☆ ٹیکنالوجی کا دور وتہذیب

یعنی جس زمانے میں انسان پتھر یا ہڈی کے آلات یا اوزار استعمال کرتا تھا اس کا رہن سہن، عادات، اطوار، سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز یعنی اس کی تہذیب مخصوص طرز کی ہوتی ہے۔ جب کانسی کے آلات واوزار نے رواج پایا تو معاشرے کا ڈھانچہ بدل گیا۔ اب لوگوں نے بستیاں آباد کر لیں، مویشی پالے، کھیتی باڑی شروع کی۔ مٹی اور دھات کے برتن بنائے پھر چھوٹی چھوٹی بستیاں ریاستوں کی صورت اختیار کر گئیں۔ نئے نئے پیشے اور ہنر وجود میں آئے۔ اخلاق اور مذہب کے نئے ضابطے بنے غرض معاشرے میں طرز عمل، نظام فکر واحساس اور طرز زندگی میں ایک تغیر آیا۔ بیلوں سے اب مشینوں میں فرق ہے۔ کیونکہ اگر گندم کی کاشت بیل سے ہوگی تو گاؤں کا نقشہ اور ہوگا اور اگر ٹریکٹروں اور بھاری مشینوں سے ہوتی ہے تو معاشرے کا نقشہ دوسرا ہوگا۔ اس میں انسان کی مرضی اور خواہشیں شامل نہیں ہوتی کیونکہ معاشرتی تغیر آلات واوزار کی تبدیلی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس پیداواری عمل سے گاؤں کی ایک مخصوص تہذیب جنم لیتی ہے۔ جسے سبط حسن کبیر داس کے اس شعر سے کرتے ہیں:

چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا روئے

دو پائن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے

اسی طرح تجارتی اور پیداواری لحاظ سے ایک نئی تہذیب بنتی ہے۔ کسی تہذیب کے عروج وزوال کا انحصار اس

بات پر ہوتا ہے کہ تہذیب کو برتنے والوں نے اپنی جسمانی اور ذہنی توانائی سے کس قدر کام لیا ہے۔ کیونکہ ہمیشہ وہی قوم غالب آئے گی جس کے آلات واوزار مغلوب قوم سے بہتر ہوں گے۔

۳۔ نظام فکر واحساس:

انسان باشعور حیوان ہے۔ خود انسان میں بھی یہ شعور نسلی یا طبعی خصوصیت نہیں ہے۔ کیسی خصوصیت ہے۔ چنانچہ زبان کی طرح شعور بھی انسان کی ضرورت کی تخلیق ہے۔ ان ضرورتوں میں سب سے اہم انسان کے باہمی رابطے اور رشتے ہیں۔ رشتہ رکھنا یا نبھانا فقط انسانی خصوصیت ہے۔ لہذا شعور ابتداء ہی سے سماجی شعور رہا ہے۔ اور اس کا ارتقاء بھی سماجی ارتقاء سے وابستہ ہے۔ انسان کو سب سے پہلے اپنے حسی ماحول کا شعور ہوا۔ یعنی اس ماحول کا جو بالکل اس کے اردگرد موجود تھا۔ پھر اسے محدود رشتوں کا شعور ہوا۔ جو اس کو دوسرے افراد یا اشیاء سے قائم کرنے پڑے۔ تب اسے ذات کا شعور حاصل ہوا۔ پھر اُسے موجودات کا شعور حاصل ہونے لگا۔ جب انسان کی ضرورتیں بڑھیں تو ان ضرورتوں کی تسکین کے لیے آلات واوزار بنائے۔ جنہوں نے اس کے تہذیبی شعور پر بھی اثر ڈالا۔

ہر تہذیب کا مخصوص نظام فکر واحساس ہوتا ہے۔ یہ نظام اس رشتے کی نوعیت کو واضح کرتا ہے۔ جو معاشرے کے افراد اور موجودات میں ہوتی ہے۔ چنانچہ انسان کا وجود جس سطح پر ہوگا۔ اس کا شعور بھی اسی سطح پر ہوگا۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور دوسرے انسانوں سے اس کا رابطہ جس قسم کا ہوگا اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز اور اس کے عقائد و رجحانات اسی کے مطابق ہوں گے۔ مثلاً جنگلی دور کے انسان کے ہاں وحدانیت کا تصور اور جنت، دوزخ کا شعور نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی قدیم انسان نظریہ اضافیت یا جوہری توانائی کے نظریے کی دریافت کرسکتا تھا۔

یہ تبدیلیاں آلات واوزار اور سماجی رابطہ میں تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ نظام فکر واحساس میں تبدیلی خود اس بات کی دلیل ہوتی ہے۔ کہ معاشرے کی تخلیقی اساس اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ہر عہد میں نظام فکر واحساس گذشتہ عہد کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ تو اس کا براہ راست مطلب ہوتا ہے کہ اس کے کاروباری آلات بہتر ہو گئے ہیں۔ کسی بھی عہد میں جو تخلیقی سرگرمیاں رائج ہوں گی ان کا اس دور میں نظام فکر واحساس سے گہرا رشتہ ہوگا۔ اس دور کے ذہنی رجحانات، علم وادب، فنون لطیفہ اپنے عہد کے طرز معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً

☆ طبقات/ذاتی ملکیت

☆ ریاست جس کے پاس آگئی

☆ پھر بادشاہ آگئے

☆ پروہت آ گئے

ان دونوں نے کہا کچھ قوتیں مافوق الفطرت ہیں۔

☆ تقدیر، زندگی ہی اس کی اتنی ہے۔

اس طرح کائنات کا اختیار مادر مطلق خداؤں، مردوک، زیوس، راہور فردا، بھل، ایشور سے منسوب کی ہیں۔ شعور کی کمی کے باعث انسان عالم موجودات کی سائنسی توجیہ وتشریح نہیں کر سکتا۔ لہذا اس نے کائنات کو بھی اپنے سماجی نظام کے حوالے سے دیکھا۔ مثلاً۔ کانسی کے دور کی نظموں اور داستانوں میں گیتوں اور گانوں میں مجسموں اور رنگین تصویروں میں لوگوں کی زندگی کے جذبات وخواہشات کی پسند و ناپسند وغیرہ کا نقشہ ملتا ہے۔ ہر معاشرے کا نظام فکر و احساس سماجی شعور کے تابع ہوتا ہے۔ اور یہ سماجی شعور سماجی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔

ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی احساسات اور افکار نہ تو کہیں آسمان سے ٹپکتے ہیں۔ اور نہ ہی زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ بلکہ تہذیب کے دوسرے عوامل کی طرح سماجی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ نظام فکرو احساس میں آنے والی تبدیلیاں سماجی حالات کے تغیر کے تابع ہوتی ہیں۔ اور سماجی حالات اس وقت تک نہیں بدلتے جب تک معاشرے کے اندر کوئی ایسی قوت نہ جنم لے جو ان کی نفی کر دے۔ انسانی خیالات میں بڑی طاقت اور توانائی ہوتی ہے۔ خیالات انسان کی قوت عمل کو حرکت میں لاتے ہیں۔ اور اس کی سرگرمیوں کا رخ متعین کرتے ہیں۔ الغرض، نظام فکرو احساس سماجی شعور اور سماجی حالات کے تابع ہوتا ہے۔

سماجی اقدار:

سماجی اقدار کے پیچھے صدیوں کی تاریخی روایات ہوتی ہیں۔ معاشرے کے تجربے اور مشاہدے ہوتے ہیں۔ افراد کا جمالیاتی ذوق ہوتا ہے۔ معاشرے کے افراد ان قدروں کی ممکن حد تک پابندی کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان پر سختی سے عمل کیا جانے لگتا ہے۔ اور عمل نہ کرنے والے کو قبیلے سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ معاشرہ اپنی سماجی قدروں کی پاسبانی فقط اس لیے کرتا ہے۔ کہ اس کی بقاء کا انحصار ان پر ہوتا ہے۔ ان سے غفلت انتشار پر منتج ہوتی ہے۔ بعض حلقوں کا خیال ہے۔ کہ سماجی قدریں آسمان سے یا کسی مذہبی پیشوا کے ذریعے نازل ہوتی ہیں۔ اگر ایسی قدروں کا بھی سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاشرے میں بہت پہلے سے رائج تھیں البتہ مذہبی پیشواؤں کی عظمت یہ ہے کہ وہ مروجہ قدروں میں سے زرر رساں یا مضر قدروں کو رَد کر دیتا ہے۔ اور مفید قدروں کو ایک ضابطے کی صورت مرتب کر دیتے ہیں۔ معاشرہ یہ قدریں اپنی ضرورت کے تحت وضع کرتا ہے۔ وہ ضرورت ختم ہونے سے بعض اوقات وہ قدریں

بھی ماند پڑ جاتی ہیں۔بعض قدریں تمام معاشروں میں مشترک اور بعض انفرادی خصوصیت کی حامل ہوتی ہیں۔

سماجی قدریں جامد نہیں ہوتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔معاشرتی ماحول اور سماجی حالات میں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان کا اثر قدروں پر بھی پڑتا ہے۔سماجی قدریں ہر عہد میں معاشرے کی نوعیت اور اس کے تقاضوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

ثقافت وتہذیب کا فرق اور انضمام:

ثقافت اور تہذیب دو ایسے عوامل ہیں۔جن میں ہم رہتے ہیں اور معاشرے کی فطرت کا تعین کرتے ہیں۔ ثقافت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بیسویں ویں صدی میں پیدا ہونے والا تصور ہے۔نظریات میں ایک مرکزی تصور ہے۔جس میں مختلف انسانی واقعات کے اشارے ملتے ہیں۔ثقافت جسمانی یا غیر معمولی شکل میں موجود ہوتی ہے۔ثقافت کی جسمانی نمائش میں کمی بھی جسمانی مواد میں شامل ہوسکتی ہے۔جو ایک مخصوص ثقافت کے ساتھ ساتھ عقائد، روایات اور لوگوں کے مخصوص گروہ کے رواج کی مصنوعات کے طور پر موزوں ہے۔ثقافت اکثر انسان کے اندرونی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔اپنے خیالات، جذبات،نظریات، آرٹ، ادب اور اقدار کی نمائندگی کرتی ہے۔جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں:''اسی لیئے جب ہم ثقافت کی تلاش کرتے ہیں۔تو اس کے معانی یہ ہیں کہ ہم زندگی میں نئے معنی اور نئی اقدار تلاش کررہے ہیں''[۲۸]

ثقافت کسی قوم یا معاشرے کی وہ مشترک خصوصیت ہے جس سے ہم نہ صرف اسے پہچانتے ہیں۔ بلکہ دوسرے معاشروں اور قوموں سے ممیّز بھی کرتے ہیں۔ثقافت کی اقدار بحیثیت مجموعی اپنے عاملوں کو ذاتی مفاد سے بلند تر کر دیتی ہے۔وہ ان اقدار، دلچسپیوں اور مقاصد میں اس درجہ محو ہوتے ہیں کہ ذاتی مفاد، حصول زر و جاہ جیسی چیزوں کو ناکارہ سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ثقافت ایک ایسی چیز ہے۔جس کے ذریعے انسان کو وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔ثقافت میں زندگی کے مختلف مشاغل، ہنر اور علوم وفنون کی اعلیٰ درجے پر پہنچانا، بُری چیزوں کی اصلاح کرنا، تنگ نظری اور تعصب کو دور کرنا، ایثار و وفاداری پیدا کرنا، معاشرت میں حسن و لطافت، اخلاق میں تہذیب، عدات میں شائستگی، لب و لہجہ میں نرمی، اپنی چیزوں، روایات اور تاریخ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بلندی پر لے جانا ہے شامل ہے۔

تہذیب کا لفظ نہ صرف ہماری زبان بلکہ عربی و فارسی میں بھی مستعمل ہے۔لفظ تہذیب ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جن کا تعلق ہمارے ''ظاہر'' سے ہے۔انسان جیسے بھی اپنی معاشرت اور اخلاق کا اظہار کرتا ہے۔وہ اس کی

تہذیب کہلاتی ہے۔ اور جو اس معاشرے میں بہتر اخلاق کا مظاہرہ نہیں کرتا اُسے معاشرے میں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ تہذیب انسانی معاشرے کی ایک اعلیٰ ریاست کے قیام کے لیے رہنمائی بھی کرتی ہے۔ تہذیب سے مُراد انسان کے بیرونی پہلو ہیں۔ جنہیں اظہار کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ تہذیب کا زور خارجی چیزوں اور طرزِ عمل کے اس اظہار پر ہے۔ جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار اور کردار شامل ہیں۔

زبان انسان کی سب سے عظیم الشان سماجی تخلیق ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے بیش قیمت اثاثہ چھوڑ جاتی ہے۔ اسی حوالے سے سبط حسن اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> زبان انسان کی سب سے عظیم الشان سماجی تخلیق ہے۔ اس کے ذریعے سے انسان اپنے تجربات، خیالات اور احساسات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اور چیزوں کا رشتہ زماں و مکاں سے جوڑتا ہے۔ یعنی وہ دوسروں سے ماضی، حال، مستقبل اور دور نزدیک کے بارے میں گفتگو کر سکتا ہے۔ اور اس طرح آنے والی نسلوں کے لیے تہذیب کا نہایت بیش قیمت اثاثہ چھوڑ جاتا ہے[۲۹]

ہر دور میں مختلف حکمرانوں کے برسرِ اقتدار آنے کے ساتھ تہذیب اور ثقافتیں تبدیل ہوتی رہیں۔ برعظیم ہمیشہ سے کسی ایک تہذیب کی بجائے مختلف تہذیبوں کی آماج گاہ رہا ہے۔ ہر تہذیب دوسری تہذیب پر نہ صرف اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ بلکہ اُسے وقت کے ساتھ متاثر بھی کرتی ہے۔ اور یہ تسلسل جاری رہتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ برعظیم مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کا مجموعہ رہا ہے۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ثقافت پہلے تیار ہوئی اس کے بعد تہذیب پیدا ہوئی۔ آج کے اس جدید دور میں تہذیب و ثقافت کو ایک نیا نام دیا گیا ہے۔ جسے ''کلچر'' کہتے ہیں۔ ثقافت ایک نسل سے دوسری نسل میں گفتگو اور مواصلات کے ذریعے منتقل کی جا سکتی ہے۔ تہذیب اپنی پیچیدگی اور شدت کی وجہ سے آسانی سے منتقل نہیں کی جا سکتی۔ تہذیب ہمیشہ ہر دور میں ترقی کے مدارج طے کر سکتی ہے۔ ثقافت میں ایسی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کے فروغ کے لیے کوششیں کی جاتی ہیں۔ تہذیب و ثقافت کا انضمام وقت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی چیزوں کو قبول کرنے سے ہوا ہے۔ کیونکہ تہذیب و ثقافت رہن سہن اور میل ملاپ کا نام ہے۔ جمیل جالبی نے تہذیب اور ثقافت کو کلچر کا نام دیا ہے لکھتے ہیں:

> میں نے لفظ تہذیب اور ثقافت کے معانی یکجا کر کے ان کے لیے ایک ''کلچر'' استعمال کیا ہے جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفہوم شامل ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا، خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی، خارجی ہوں یا داخلی، احاطہ کر لیتا ہے[۳۰]

اس میں سب سے اہم کردار زبان کا ہے۔ زبان ایک ایسا ادارہ ہے۔ جسے انسان کی معاشرت پسند طبیعت نے تخلیق کیا ہے۔ زبان ہی اس معاشرے کی ابتداء ہے اگر زبان نہ ہوتو سارا معاشرہ بہرہ اور گونگا تصور ہوتا ہے۔ تہذیب اور ثقافت کی ترقی رک جاتی ہے۔ نہ معاشرت پیدا ہوتی ہے۔ اور نہ کلچر ترقی کرتا ہے۔ زبان ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے ایک انسان دوسرے انسان کے خیالات، تجربات، محسوسات اور جذبات میں شریک ہوتا ہے۔ جس سے اس کے عمل میں طرز فکر و عمل میں مماثلت ہوتی ہے۔ بعد میں یہی طرز فکر و عمل کسی بھی معاشرے میں تہذیبی اور معاشرتی یک جہتی پیدا کر کے ایک مشترک کلچر کو جنم دیتا ہے۔

ب۔ (i) کشمیر کا جغرافیہ:

ابتداء میں کشمیر وادی کشمیر پر مشتمل تھا جو اس وقت بھارت اور پاکستان کے زیر قبضہ علاقے ہیں۔ مگر ۱۸۴۶ء میں ڈوگرا راجہ نے برٹش حکومت سے لے کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۱۸۳۴ء میں گلاب سنگھ نے لداخ کو فتح کیا اور ریاست کشمیر کا حصہ بنایا۔ ۱۸۴۰ء میں بلتستان کو بھی فتح کر کے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ کافی عرصہ تک یہ علاقہ سکھوں کے زیر قبضہ رہا بعد میں ۱۸۹۰ء میں انگریزوں نے گلگت کو سکھوں سے لے کر اپنے قبضے میں لے لیا۔ لیکن انتظامی کمزوریوں کی وجہ سے یہ حصہ دوبارہ پرتاب سنگھ کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کے انتظامی امور چلائے۔ پچیس ستمبر ۱۹۲۵ء کو پرتاب سنگھ کی وفات کے بعد ان کے خاندان کے مہاراجہ، ریاست جموں و کشمیر سَر ہری سنگھ نے گلگت کی حکومت سنبھالی۔ اس طرح گلگت بھی باقاعدہ کشمیر کا حصہ بن گیا۔ ۱۹۳۵ء میں دوبارہ برطانوی حکومت نے ساٹھ سال کے لیے گلگت کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جسے بعد میں ایک سازش کے تحت ساٹھ سال پورے ہونے سے پہلے مہاراجہ ہری سنگھ کے حوالے کر دیا۔ اگر گلگت کا علاقہ برطانوی کنٹرول میں رہتا تو تقسیم ہند کے تحت مسلم اکثریت ہونے کی وجہ سے یہ پاکستان کا حصہ ہوتا۔ لیکن چونکہ کانگریس اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کشمیر پر بھارتی قبضے کی راہ ہموار کر چکے تھے۔ اس لیئے گلگت کو کشمیر کا حصہ بنا دیا گیا۔ جس کے بارے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر امید تھے کہ آخر اس پر کنٹرول بھارت کا ہی ہوگا۔ لیکن یہ کشمیر دشمن اس چال میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ گلگت کے لوگوں نے اپنے مہاراجہ سے آزادی حاصل کر لی۔ اس وقت کے برطانوی افسر میجر ولیم براؤن نے اس وقت کے گورنر بریگیڈیئر جنسارا سنگھ سے الحاق کر کے مسلمانوں کی خواہشات کو مدنظر رکھنے کا کہا۔ مگر گورنر نے ٹھکرایا تو میجر ولیم براؤن نے مسلم آبادی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ڈوگرا آرمی کے خلاف بغاوت کر دی اور یکم نومبر کو پاکستان کا سبز ہلالی پرچم گلگت اجنسی پر لہرا دیا اور تین دن بعد گلگت نے ولیم براؤن کی قیادت میں پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔

تقسیم ہند سے پہلے ریاست جموں و کشمیر، پونچھ، لداخ، جموں بلتستان اور گلگت ایجنسی پر مشتمل تھی جبکہ تقسیم ہند

کے وقت ریاست جموں وکشمیر سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ ہندوؤں کی سازش اور مہاراجہ کے غیر قانونی فیصلے کی وجہ سے ریاست میں بغاوت نے جنم لیا اور ریاست کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ۲۴راکتوبر کو کشمیریوں نے ریاست کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا اور مہاراجہ کے سرینگر سے جموں بھاگ جانے پر الگ مسلم ریاست کا اعلان کر دیا۔ دوسری طرف کشمیر کے باقی حصے پر بھارت نے فوج کشی کی اور قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے یہ ریاست سکڑ کر موجودہ آزاد کشمیر کی صورت تک محدود ہو گئی۔ گلگت پہلے ہی پاکستان کے ساتھ الحاق کر چکا تھا۔ بھارت نے مزید آگے بڑھتے ہوئے لداخ، وادی، جموں اور پونچھ پر ۲۷راکتوبر ۱۹۴۷ء کو غیر قانونی قبضہ کر لیا۔ اور جموں وکشمیر کے درمیان ایک لائن کھینچ کر اسے دو لخت کر دیا۔ جسے آج مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان کشمیری عوام کو ہوا کہ رشتہ دار ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ کشمیر کا کچھ حصہ اس وقت چین کے پاس ہے جسے ایک معاہدے کی بھینٹ چڑھا دیا گیا یہ معاہدہ پاکستان نے چین کے ساتھ سرحدی تنازعے پر کیا تھا۔ جس کو چین نے اپنے نقشے میں شامل کر لیا۔ لیکن جب بات آگے بڑھی تو پاکستان نے اقوام متحدہ میں چین کے حق میں ووٹ دیا۔ پھر پاکستان اور چین کے درمیان مذاکرات ہوئے اور سائنو معاہدے کے تحت پاکستان نے چین کو کشمیر کا کچھ حصہ دیا اور چین نے کچھ چوٹیاں پاکستان کے حوالے کیں۔

ریاست جموں وکشمیر برصغیر پاک و ہند کے انتہائی شمال اور جنوبی ایشیاء کے درمیان میں واقع ہے۔ کشمیر کے مشرق میں چینی تبت، مغرب میں پاکستان، شمال میں چین، روس اور افغانستان جنوب میں کچھ حصہ پاکستان اور مختصر حصہ بھارت کا واقع ہے۔

رقبہ:

ریاست جموں وکشمیر کا رقبہ مختلف ادوار میں تبدیل ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس وقت جو رقبہ موجود ہے۔ یہ تقسیم ہند کے وقت مہاراجہ ہری سنگھ کے قبضے میں تھا۔ کیونکہ ریاست کشمیر کی پہلی مردم شماری ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی اس وقت کشمیر کا رقبہ ۸۶۱۶۳ مربع میل تھا۔ کچھ مصنفین کے نزدیک کشمیر کا رقبہ اس سے کم ہے۔ مگر بعض کا یہ خیال ہے کہ اس میں وہ رقبہ شامل نہیں ہے جو چین کے پاس چلا گیا ہے۔ اسی حوالے سے منیر احمد لکھتے ہیں: امان اللہ نے "Free Kashmir" میں اس کا رقبہ ۸۴.۴۹۴ مربع میل تحریر کیا ہے۔ کولر انسائیکلو پیڈیا نے کل رقبہ ۸۶.۰۲۴ مربع میل یعنی ۱۰۸ . ۲۲.۲ مربع کلو میٹر تحریر کیا ہے"[۳۱]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں ۱۵راگست ۱۹۴۷ء تک رقبہ کی تقسیم کچھ اس طرح سے ہے:۔

''صوبہ جموں	۱۲،۳۷۸مربع میل
صوبہ کشمیر	۸،۵۳۹مربع میل
سرحدی صوبہ لداخ	۶۳،۵۵۴مربع میل
کل رقبہ	۸۴،۴۷۱مربع میل

رقبہ کے لحاظ سے ریاست جموں وکشمیر ۱۱۰

آزاد ممالک سے بڑی ہے'' ۳۲

مزید لکھتے ہیں:

'' یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی جنگ بندی کے بعد رقبہ کی صورت حال حسب ذیل ہے:

بھارت کے زیر قبضہ علاقہ:

(الف) ''صوبہ لداخ	۳۳،۷۴۰مربع میل
(ب) صوبہ کشمیر	۶،۸۹۳مربع میل
(ج) صوبہ جموں	۹،۸۸۰مربع میل
میزان	۵۰،۵۱۳مربع میل

پاکستان کے زیر کنٹرول علاقہ:

(د) گلگت بلتستان	۲۹،۸۱۴مربع میل
(ر) آزاد کشمیر	۴،۱۴۴مربع میل
میزان	۳۳،۹۵۸مربع میل
ریاست جموں وکشمیر کا مجموعی رقبہ:	۸۴،۴۷۱مربع میل'' ۳۳

آبادی:

۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق مورخین نے ریاست جموں وکشمیر کی آبادی ۲۲۰۰۰،۴۰نفوس پر مشتمل آبادی تحریر

کی ہے۔منیر احمد بخاری لکھتے ہیں:۔

کہ مذہبی بنیادوں پر افراد کی تقسیم بشیر احمد قریشی نے کچھ اس طرح کی ہے:

''مسلمان	۳۲،۰۰،۰۰۰
غیر مسلم	۸،۰۰،۰۰۰

غیر مسلم آبادی میں ہندو، سکھ، بدھ اور عیسائی سبھی شامل ہیں''۳۴

مزید لکھتے ہیں کہ آبادی کے اس تناسب کو صوبائی تقسیم کی بنا پر مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''صوبہ جموں''

کل آبادی	۱۹،۸۱،۴۳۳
مسلمان	۱۲،۱۵،۶۷۶
تناسب	۶۲ فیصد

صوبہ کشمیر:

کل آبادی	۱۷،۲۸،۷۰۵
مسلمان	۱۶،۱۵،۴۷۸
تناسب	۹۴ فیصد

سرحدی اضلاع:

کل آبادی	۳،۱۱،۴۷۸
مسلمان	۲،۷۰،۰۹۳
تناسب	۸۷ فیصد
کل آبادی	۴۰،۲۱،۶۱۶
کل مسلمان آبادی	۳۱،۰۱،۲۴۷

تناسب ۷۸ فیصد

جبکہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں کل آبادی ۴۳،۷۰،۰۰۰ افراد سے تجاوز ہو چکی تھی'' ۳۵

منیر احمد بخاری لکھتے ہیں کہ شمس کاشمیری نے ریاست جموں وکشمیر کی مذہب کی بنیاد پر آبادی کو یوں بیان کیا ہے:

''مسلمان ۹۷،۰۰،۰۰۰

غیر مسلم ۲۳،۰۰،۰۰۰

تفصیل:۔

ہندو کشمیری پنڈت ۲،۰۰،۰۰۰

لداخی بدھ ۱،۰۰،۰۰۰

سکھ ۲،۰۰،۰۰۰

ہندو ڈوگرے (پنجابی) ۱۸،۰۰،۰۰۰'' ۳۶

شمس الحق نے اس آبادی کو کس طرح دیکھا ہے۔ منیر احمد بخاری لکھتے ہیں:

''مردم شماری ۱۹۱۱ء ۳۱،۶۱،۳۳۴

مردم شماری ۱۹۲۱ء ۳۳،۸۰،۴۱۹

مردم شماری ۱۹۳۱ء ۳۳،۳۵،۶۲۵

مردم شماری ۱۹۴۱ء ۴۰،۲۱،۶۱۶'' ۳۷

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک آبادی میں سات فیصد، ۱۹۲۱ء سے تک آٹھ فیصد اور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء تک چودہ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ گویا آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ شرح اضافہ بھی بڑھتا گیا۔ جب کہ ۱۹۸۱ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق جموں وکشمیر کے مختلف خطوں کی آبادی کتنی تھی اسی حوالے سے منیر احمد لکھتے ہیں:۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر ۶۴ لاکھ

آزاد جموں وکشمیر	۲۰لاکھ
بلتستان	۶لاکھ
پاکستان میں آباد مہاجرین	۸لاکھ
کل میزان	۹۸لاکھ

۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں جموں وکشمیر کی آبادی کتنی تھی یا۱۹۸۱ء کے مقابلے میں اس میں کتنا اضافہ ہوگیا تھا اس حوالے سے منیر احمد اعداد وشمار پیش کرتے ہیں:

> ۱۹۹۱ء میں ریاست کی آبادی بڑھ کر ایک کروڑ سولہ لاکھ (۱۶،۰۰،۰۰۰) ہوگئی تھی۔ جس میں سے 73لاکھ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کی آبادی تھی اور آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور بیرونی ممالک میں قیام پذیر کشمیریوں کی تعداد 43لاکھ تھی۳۸

اس وقت جموں کشمیر کی کل آبادی کا تخمینہ ایک کروڑ ۴۳لاکھ لگایا گیا ہے جس کی تفصیل منیر احمد کچھ یوں لکھتے ہیں:۔

''۱۔ ہندوستانی مقبوضہ علاقہ	۸۰لاکھ
۲۔ آزاد کشمیر گلگت بلتستان	۳۳لاکھ
۳۔ مہاجرین جموں وکشمیر مقیم پاکستان	۱۵لاکھ
۴۔ برطانیہ میں مقیم کشمیری	۳لاکھ
۵۔ امریکہ، عرب ممالک اور دوسرے ممالک میں آباد۔	
کشمیری	۱۱لاکھ
کل میزان	ایک کروڑ چونتیس لاکھ''۳۹

انتظامی تقسیم:

جب کشمیر کی ریاست کو تقسیم کیا گیا تو اس وقت اس کے تین انتظامی یونٹ بنائے گئے تھے۔

۱۔ صوبہ جموں

۲۔ صوبہ کشمیر

۳۔ صوبہ شمالی علاقہ جات (جولداخ، گلگت بلتستان وغیرہ پر مشتمل تھا)

صوبہ جموں:

صوبہ جموں کا کل رقبہ ۱۲،۳۷۸ مربع میل تھا۔

منیر احمد بخاری کے بقول:

> ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیر میں کل گاؤں ۸۹۰۳ اور قصبے ۳۹ تھے۔ جن میں سے ۴۴۷۲ صوبہ جموں میں واقع تھے۔ اس صوبے کا ۲۴۹۸ مربع میل آزاد کشمیر میں شامل ہے۔ جبکہ ۹۸۸۰ مربع میل بھارت کے پاس ہے[۴۰]

تقسیم کے وقت صوبہ جموں اضلاع میں ضلع جموں، ضلع اودھم پور، ضلع ریاسی اور ضلع میر پور شامل تھے۔ جبکہ ''پونچھ'' ایک الگ جاگیر تھی۔ جس کا رقبہ ۶۲۷، ۱ مربع میل اور آبادی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری ۷۰۰، ۲۰، ۱۴ افراد پر مشتمل تھی۔ جسے بعد میں صوبہ جموں میں ضلع کی حیثیت سے شامل کر دیا گیا۔

اب بھارت کے زیر قبضہ علاقے مقبوضہ جموں میں اودھم پور اور ریاسی کے علاوہ ضلع کھٹوعہ، ضلع راجوری، ضلع پونچھ اور ضلع ڈوڈھ نئے اضلاع بنائے گئے ہیں۔ اور آزاد علاقے میں ضلع میر پور کی تحصیل کوٹلی کو اور حال ہی میں تحصیل بھمبر کو ضلع کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس طرح پونچھ کے اب تین اضلاع بن چکے ہیں۔

۱۔ پونچھ (راولاکوٹ) ۲۔ باغ ۳۔ سدھنوتی

اس وقت جموں کا جو حصہ پنجاب کے ساتھ ملتا ہے وہ زیادہ تر میدانی ہے۔ تھوڑے بہت اور نیچے نیچے ٹیلے اور پہاڑ بھی آ جاتے ہیں۔ پورے کشمیر بلکہ کسی ایک صوبے میں بسنے والے لوگوں کی زبان اور رہن سہن ایک نہیں ہے۔ اسی لیے صوبہ جموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ علاقہ جو پنجاب کے ساتھ ملتا ہے۔ اس علاقے کو ''کاہنڈی'' بھی کہتے ہیں۔ یہاں زیادہ سَر برہمن، کھتری، ٹھکر اور جاٹ بستے ہیں۔ ٹھکروں اور جاٹوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس علاقے کے زیادہ تر لوگ پہاڑی بولتے ہیں۔

۲۔ دوسرے نمبر پر وہ علاقہ آتا ہے جو توی سے دریائے جہلم تک ہے۔ اس میں میر پور بھی شامل ہے۔ یہاں چب، راجپوت، منگرال، گھکھڑ بکثرت آباد ہیں۔ یہاں پر وادی کشمیر سے آ کر بسنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ جس کی وجہ سے کشمیری اور ڈوگری نئی زبان بن گئی ہے۔ اس علاقے میں گجر قبیلہ بھی آباد ہے۔ جو گوجری زبان بولتے ہیں۔ کیونکہ گوجر سارے کشمیر میں کئی جگہوں پر آباد ہیں۔

۳۔ تیسرے نمبر پر پونچھ جس کا ایک حصہ اوڑی و مظفر آباد (صوبہ کشمیر) دوسری طرف کوٹلی (صوبہ جموں) اور تیسری طرف پاکستان کے علاقہ مری سے متصل ہے۔ اس ضلع میں جیسے (پونچھ سدھنوتی) بھی کہتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ سدوزئی قبیلہ کے آباد ہیں۔ جبکہ ضلع باغ میں مغل، ڈھونڈ، سدات، گوجر اور کشمیری وغیرہ لوگ بستے ہیں۔ اس علاقے کی زبان بھی پہاڑی ہے۔

صوبہ کشمیر:

صوبہ کشمیر کا کل رقبہ ۸،۵۳۹ مربع میل ہے جو باقی دونوں صوبوں سے کم ہے۔ مگر اپنی قدرتی خوبصورتی کے باعث جنت کا لقب حاصل کر چکا ہے۔ کشمیر صوبہ کے ۳،۴۷۶ گاؤں ہیں۔ اس صوبے کا ۲،۴۰۹ مربع میل رقبہ آزاد کشمیر میں شامل ہے۔ جبکہ ۶۳۱، امربع میل بھارت کے زیر تسلط ہے۔ تقسیم کے وقت یہ صوبہ تین ضلعوں پر مشتمل تھا۔ اب چار اضلاع ضلع سرینگر، ضلع اسلام آباد (اننت ناگ) ضلع بارہ مولا اور ضلع پلوامہ، مقبوضہ کشمیر میں، جبکہ ضلع مظفر آباد آزاد کشمیر میں ہے۔ یہ وادی دنیا بھر کے سیاحوں کا مرکز ہے۔ یہاں پر مختلف قومیں شیخ، راجپوت، سادات، مغل، پٹھان، گوجر قبیلوں کے لوگ زیادہ تعداد میں آباد ہیں۔ شیخ جن میں کول، بٹ، پنڈت، ایتو، ایشی، منٹو، گنائی، ماگرے، ٹھاکر، ناٹک، لون اور ڈار شامل ہیں زیادہ تر کشمیری بولتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو گوجری اور پہاڑی بولتے ہیں۔

سرحدی صوبے لداخ، گلگت، بلتستان

سرحدی صوبہ جس میں لداخ، گلگت بلتستان شامل ہیں کی سرحدیں چین اور افغانستان سے ملتی ہیں۔ اس کا کل رقبہ ۶۳،۵۵۴ مربع میل ہے جس میں ۷۶۸ گاؤں شامل ہیں۔ اس میں ۳۳،۷۴۰ مربع میل مقبوضہ کشمیر اور ۲۹،۸۱۴ مربع میل آزاد کشمیر میں شامل ہے۔ لداخ کا تقریباً سارا علاقہ بھارت کے زیر قبضہ علاقے مقبوضہ کشمیر میں آتا ہے۔ جبکہ گلگت بلتستان کا علاقہ براہ راست حکومت پاکستان کی کنٹرول میں ہے۔ لداخ جو سرینگر سے ۲۳۴ میل کی دوری پر ہے اس کا سب سے بڑا شہر ''لیہ'' ہے۔ یہاں بدھ مت کے پیروکار بہت زیادہ ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تعداد ہے۔ یہاں کی زبان اپنی ہے جس پر تبتی زبان کے اثرات ہیں۔ اسے لداخی زبان کہتے ہیں۔ گلگت جس کے

ساتھ ''ہنزہ'' اور ''نگر'' کی جاگیریں بھی ہیں۔ ''نگر'' کی جاگیر انتظامی لحاظ سے بلتستان کے انتظامی یونٹ میں شامل ہے۔ گلگت میں زیادہ تر شینا زبان بولی جاتی ہے۔ اور ''ہنزہ'' میں سب سے الگ زبان بروشینکی بولی جاتی ہے۔ جبکہ نگر میں بلتی زبان بولی جاتی ہے۔

بلتستان دریائے سندھ کے دونوں جانب کوہستانی ہمالیہ اور قراقرم کے درمیان واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۱۱۸،۱۰ مربع میل ہے۔ ۱۹۱۳ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۲،۲۳،۰۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں کے بسنے والے زیادہ تر لوگ تبتی نسل کے ہیں۔ لیکن یہاں پر باہر سے آنے والے لوگ یونانی، ایرانی، ترک، مغل اور کشمیریوں کے ملاپ سے تبتیوں سے مختلف لگتے ہیں۔ یہاں پر سادات خاندان کو بہت احترام دیا جاتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کی موجودہ انتظامی تقسیم:

بھارت کے زیر کنٹرول علاقے:

بھارت کے زیر قبضہ جموں وکشمیر کا علاقہ انتظامی طور پر چودہ اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے جس کی ضلع اور تحصیل کی تفصیل منیر احمد بخاری کچھ یوں بتاتے ہیں۔

''الف صوبہ جموں

۱۔ ضلع جموں: اس ضلع کی چار تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل جموں ۲۔ تحصیل سانبہ ۳۔ تحصیل رنبر سنگھ پورہ ۴۔ تحصیل اکھنور

۲۔ ضلع کٹھوعہ: اس ضلع کی بھی چار تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل کٹھوعہ ۲۔ تحصیل ہیرانگر ۳۔ تحصیل بسولی ۴۔ تحصیل بلاور

۳۔ ضلع اودھم پور: یہ ضلع بھی چار تحصیلوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تحصیل اودھم پور ۲۔ تحصیل رام نگر ۳۔ تحصیل ریاسی ۴۔ تحصیل گلاب گڑھ

۴۔ ضلع راجوری: اس ضلع کی تین تحصیلیں ہیں:

۱۔ تحصیل راجوری ۲۔ تحصیل نوشہرہ ۳۔ تحصیل بدھل

۵۔ ضلع پونچھ: اس ضلع کو تین تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ تحصیل حویلی ۲۔ تحصیل مینڈھر ۳۔ تحصیل سرن کوٹ (پونچھ)

۶۔ ضلع ڈوڈہ: ضلع ڈوڈہ چار تحصیلوں پر مشتمل ہے:

۱۔ تحصیل ڈوڈہ ۲۔ تحصیل رام بن ۳۔ تحصیل کشتواڑ ۴۔ تحصیل بھدرواہ

صوبہ کشمیر

۱۔ ضلع سرینگر: اس ضلع میں تین تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل سرینگر ۲۔ تحصیل گاندربل ۳۔ تحصیل کنگن

۲۔ ضلع اننت ناگ: یہ ضلع چار تحصیلوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تحصیل اننت ناگ (اسلام آباد) ۲۔ تحصیل پہل گام ۳۔ تحصیل ڈورو ۴۔ تحصیل کولگام

۳۔ ضلع بڈگام: اس ضلع کو چار تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ تحصیل بڈگام ۲۔ تحصیل بیروہ ۳۔ تحصیل جاڈورا ۴۔ تحصیل ماگام

۴۔ ضلع پلوامہ: اس ضلع میں چار تحصیلیں ہیں:

۱۔ تحصیل پلوامہ ۲۔ تحصیل شوپیاں ۳۔ تحصیل ترال ۴۔ تحصیل پامپور

۵۔ ضلع بارمولہ: ضلع بارمولہ کی سات تحصلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل بارمولہ ۲۔ تحصیل سوپور ۳۔ تحصیل اوڑی ۴۔ تحصیل بانڈی پورہ

۵۔ تحصیل ٹنگمرگ ۶۔ تحصیل سوناواری ۷۔ تحصیل پٹن

۶۔ ضلع کپواڑہ: یہ ضلع تین تحصیلوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تحصیل کپواڑہ ۲۔ تحصیل ہندواڑہ ۳۔ تحصیل کرناہ

صوبہ لداخ

۱۔ ضلع لداخ: اس ضلع لداخ کی دو تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل لیہ ۲۔ تحصیل پدم

۲۔ ضلع کرگل: اس ضلع کی بھی دو تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل کرگل ۲۔ تحصیل دراس

پاکستان کے زیر کنٹرول علاقے:

آزاد کشمیر:

آزاد کشمیر سات اضلاع پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

۱۔ ضلع میر پور: اس ضلع کی دو تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل میر پور ۲۔ تحصیل ڈڈیال

۲۔ ضلع کوٹلی: ضلع کوٹلی تین تحصیلوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تحصیل کوٹلی ۲۔ تحصیل سہنسہ ۳۔ تحصیل نکیال (فتح پور)

۳۔ ضلع پونچھ: ضلع پونچھ تین تحصیلوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تحصیل راولاکوٹ ۲۔ تحصیل ہجیرہ ۳ تحصیل عباس پور

۴۔ ضلع باغ: ضلع باغ میں تین تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل باغ ۲۔ تحصیل حویلی ۳۔ تحصیل دھیر کوٹ

۵۔ ضلع مظفر آباد: یہ ضلع تین تحصیلوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تحصیل مظفر آباد ۲۔ تحصیل ہٹیال ۳۔ تحصیل اٹھمقام

۶۔ ضلع سدھنوتی: یہ ضلع دو تحصیلوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تحصیل پلندری ۲۔ تحصیل تراڑکھل

۷۔ ضلع بھمبر: ضلع بھمبر میں تین تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل بھمبر ۲۔ تحصیل سماہنی ۳۔ تحصیل برنالہ

گلگت بلتستان

۱۔ ضلع گلگت: اس ضلع میں تین تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل گلگت ۲۔ تحصیل نگر ۳۔ تحصیل ہنزہ

۲۔ ضلع دیامیر: یہ ضلع تین تحصیلوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تحصیل چلاس ۲۔ تحصیل استور ۳۔ تحصیل واریل تانگیر

۳۔ ضلع غذر: ضلع غذر چار تحصیلوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تحصیل نیپال ۲۔ تحصیل اشکومن ۳۔ تحصیل گوپس ۴۔ تحصیل یاسین

۴۔ ضلع اسکردو: اس ضلع میں تین تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل سکردو ۲۔ تحصیل روندو ۳۔ تحصیل شگر

۵۔ ضلع گھانچی: اس ضلع کی تین تحصیلیں ہیں:۔

۱۔ تحصیل خپلو ۲۔ تحصیل سیاچین ۳۔ تحصیل کھرمنگ ''[۴۱]

ج۔ کشمیر کی ثقافت کی ابتداء

کشمیر تاریخی لحاظ سے ان علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ جنہیں کرہ ارض پر قدیم ترین قرار دیا جاتا ہے۔ ریاست کشمیر میں جموں، لداخ، گلگت، پونیال، ہنزہ، نگر اور یاسین کے علاقے شامل ہیں۔ گلگت کے شمال مغرب میں واقع ایک چھوٹی سی ریاست چترال کبھی کشمیر کے راجاؤں، مہاراجاؤں کی سیر گاہ ہوا کرتی تھی۔ ہمالیہ کے دامن میں اس کی شکل بیضوی وادی کی طرح ہے۔ دنیا کے نقشے پر یہ چاروں اطراف سے بلند و بالا پہاڑوں میں گھری نظر آتی ہے۔ ان پہاڑوں میں بیس کے قریب درے ہیں۔ جن کے ذریعے اس وادی میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔

انتہائی جنوب میں جہاں پنجاب کے چٹیل میدان، ہمالیہ کی سر بہ فلک چوٹیوں کے قدم چومتے ہیں، جموں واقع ہے۔ جو ایک زمانے میں ہندو اور ڈگرہ رجواڑوں کے عروج کا مرکز رہا ہے۔ شمال کی طرف خطرناک پہاڑی دروں، منجمد ڈھلوانوں اور جنگلات سے بہتے ہوئے قدرتی دریاؤں اور نالوں کے اس پار قراقرم، زنکا اور پیر پنجال کے پہاڑی سلسلوں کی حفاظت میں سطح سمندر سے پانچ ہزار بلند بیضوی سطح مرتفع کی صورت میں ہمالیہ کی وہ خوبصورت وادی

جسے وادی کشمیر کہا جاتا ہے موجود ہے۔ برف پوش چوٹیوں، چنار کے جنگلات، نیلگوں آسمان کی طرح شفاف جھیلوں، گنگناتے جھرنوں، بل کھاتے دریاؤں اور گل سوسن کے باغات سے بھرپور اس وادی کو ''جنت ارضی'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ریاست کا تیسرا حصہ لداخ ہے جو سطح سمندر سے ۲۳ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ لداخ بدھ مذہب کی ایک بھولی بسری داستان ہے جہاں اب بھی پہاڑی غاروں میں قدیم بدھ عبادت گاہیں موجود ہیں۔ سرخ لباس والے بدھ بیراگی، پیلے لباس والے سادھو اور بدھ عبادت گاہوں پر لہراتے ہوئے مخصوص رنگ کے جھنڈے ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے لداخ، گلگت اور بلتستان کے علاقوں کو ''تبت خورد'' کہا جاتا ہے۔ وادی کشمیر کی تاریخی حیثیت کیا ہے اس حوالے سے ذوالفقار ارشد گیلانی لکھتے ہیں:

> تاریخ کشمیر کے مولف محمد الدین فوق نے بھی مختلف تاریخی حقائق سے ثابت کیا ہے کہ پہلے پہل کشمیر میں آبادی، بالکل نہ تھی۔ بلکہ یہ پہاڑی فصیل سے گھرا ہوا قلعہ، جھیل اور تالاب کے مانند پانی سے لبریز ''ستی سَر'' کے نام سے مشہور تھا۔ ستی، مہادیوی (پاربتی) کی مرغوب خاطر اور دل پسند سیر گاہ کے لیے مخصوص تھا۔ اس نام کی وجہ تسمیہ بھی ستی کا نام ہے۔ جو اس تالاب کی سیر و تفریح سے مسرور ہو کر مدتوں یہیں قیام پذیر رہی۔[۴۲]

ایک اور جگہ حضرت سلیمانؑ السلام کے ہاتھوں اس وسیع و عریض جھیل کا پانی نکالنے کے مشہور قصے کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> جب برائے سیر و سیاحت حضرت سلیمان علیہ السلام ستی سر پہنچے تو یہاں کی خوشگوار اور پُر فضا آب و ہوا سے محظوظ و مسرور ہو کر یہیں ٹھہر گئے اور آبادی قائم کرنے کے بارے میں مختلف تجاویز سوچنے لگے۔ اسی اثناء میں آبادی قائم کرنے سے پہلے انہوں نے ستی سر کا پانی خشک کرنے کا ارادہ کیا۔ کشف دیو کو اس پر مامور کیا جس نے بارہ مولہ کے پاس پہاڑ کاٹ کر موجودہ وادی کشمیر کی بنیاد قائم کر دی۔[۴۳]

لیکن کہا جاتا ہے۔ کشمیر اس سے پہلے کا آباد تھا یہ درست ہے کہ قدیم ایام میں یہاں مستقل آبادی نہ تھی نہ کوئی گاؤں تھا اور نہ باقاعدہ شہر آباد تھے۔ کیونکہ کثرت میں یہاں برف باری ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے زندگی گزارنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ اس وقت زندگی گزارنے کے لوازمات بھی محدود تھے۔

یہ نہیں معلوم کہ ابتداء میں اس کا نام کیا تھا لیکن یہاں پر موسم بہار میں چرواہے مال مویشی لے کے آتے تھے۔

کیونکہ یہ وادی چراگاہوں کا کام دیتی تھی۔لوگ اپنے مال مویشی لے کر یہاں آجاتے اور جب سردی میں اضافہ ہونے لگتا واپس چلے جاتے۔بعض ایسی روایات بھی ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر قدیم زمانے سے خوف ناک اور ناقابل گزر پہاڑوں سے گھرا ایک ویران اور سنسان جنگل تھا۔ برف سے لدی یہ پہاڑی چوٹیاں بڑے بڑے طالع آزماؤں سے بچانے کے لیے مورچوں کا کام دیتی تھیں۔ انسان تو انسان پرندے بھی اس کو دیکھ کر ہی واپس لوٹ جاتے تھے۔ پھر جب برف کی شدت کم ہونے لگی تو گردونواح کے لوگ اسے دیکھنے کے لیئے آنے لگے اور پھر یہاں پر آبادی شروع ہوگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ تہذیب سے واقف نہ تھے۔ وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پتھر کی کلہاڑیاں اور جنگی ہتھیار ان کا اسلحہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے تیروترکش کا استعمال بھی سیکھا۔اور کاشت کاری کے گُر بھی سیکھے۔وقت کے ساتھ جیسے جیسے ترقی کرتے گئے۔تہذیب وثقافت ان کی زندگی کا حصہ بنتی گئی۔ یہ دراصل ثقافت کا آغاز تصور ہوتا ہے۔

باقاعدہ کشمیر کی ثقافت پر اگر بات کی جائے تو یہ بھارت کے شمال (جموں وکشمیر)، پاکستان کے شمال مشرق (آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان) اور چین کے علاقے اکسائی جن کی مظہر ہے۔کشمیر کی ثقافت میں شمالی جنوبی ایشائی اور وسطی ایشاء کی ثقافت کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔کشمیر کا خطہ اپنی لازوال خوبصورتی اور تاریخی ثقافت کے باعث دنیا بھر میں ایک مقام رکھتا ہے۔ یہاں مسلمان، سکھ، ہندو اور بدھا آباد ہیں جن کے اپنے اپنے جداگانہ طرز زندگی نے یہاں کی ثقافت کو جلا بخشی ہے۔

ثقافت کی جڑیں گہری اور مختلف علاقوں سے جڑی ہوئی ہیں۔کشمیریوں کی بنیادی خوراک چاول ہے اس کے علاوہ زیادہ تر لوگ گندم اور مکئی کی روٹی کھاتے ہیں اور اگاتے بھی ہیں۔سبزیاں، پھل، مختلف جڑی بوٹیاں اور چاول خود اگاتے ہیں۔ مال مویشی بھی پالتے ہیں۔ انتہائی محنتی اور جفاکش لوگ ہیں خودمختار زندگی گزارتے ہیں۔ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیئے کھیتوں میں خود کام کرتے ہیں۔ کیونکہ زراعت اور جنگلات ان کی آمدن کا واحد اور بنیادی ذریعہ ہیں۔ روایتی دستکاری کے کام کے لیے بہت مشہور ہیں کیونکہ وہ ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ان دستکاریوں میں صفائی، درستگی اور تخلیق حیرت انگیز ہے۔کشمیری دستکاری، قالین، شال، لکڑی کی کھدائی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔اس کے علاوہ ہاتھ سے بنائے ہوئے جوتے جو رسی سے بنائے جاتے ہیں بہت مشہور ہیں۔

کشمیر کی اقوام:

۸۴،۰۰۰ مربع میل پر پھیلی ہوئی ریاست جموں وکشمیر کے طول وعرض میں مختلف نسلی گروہ اور چھوٹی بڑی قومیتوں

کے لوگ آباد ہیں۔ ان سب کا اپنا اپنا کلچر ہے اور اپنی ہی زبانیں ہیں۔ کیونکہ یہ مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آئے اور یہاں آباد ہو گئے۔ یوں تو ہر وہ شخص جو کشمیر میں رہتا ہے۔ کشمیری ہے۔ مگر ''کشمیری'' ایک علیحدہ قوم بھی ہے۔

درد:

وادی کشمیر کے شمال میں بلتستان اور گلگت میں رہنے والے لوگ ''درد'' کہلاتے ہیں۔ ماہرین کی رائے میں یہ لوگ آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور بقول ان کے قدیم آریاؤں کی ایک شاخ وسط ایشیاء سے جنوب کی طرف ہجرت کرنے والے قافلوں سے جدا ہو کر گلگت اور بلتستان کے علاقوں میں پھیل گئی تھی۔ دردستان میں رہنے والی تمام آبادی آج کل اسلام کے مختلف مسلکوں شیعہ، سنی، نوربخشی اور اسماعیلی سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام قبول کرنے سے قبل یہ لوگ زیادہ تر بدھ مت یا ہندومت کے پیروکار تھے۔

لداخی:

ریاست کے شمالی صوبہ لداخ میں آباد لوگوں کا تعلق آریاؤں کی ملی جلی نسل سے ہے۔ ۳۵ ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا یہ علاقہ زیادہ تر بنجر ریگستانی اور پہاڑی ہونے کی بناء پر کاشت کاری کے لیے سازگار نہیں ہے۔ اس لیے اس علاقے میں آبادی بہت کم ہے۔ یہاں بدھ مت کے پیروکاروں کی شرح آبادی ۵۲ فیصد ہے۔ ۴۵ فیصد مسلمان اور ۳ فیصد دیگر فرقوں کے لوگ آباد ہیں۔ مذہبی رواداری، ذہانت اور جفاکشی میں یہ لوگ بہت مشہور ہیں۔ یہاں اب بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ کہ ایک ہی خاندان کے لوگ مختلف مذہبی عقائد رکھنے کے باوجود نہایت امن و آشتی سے رہ رہے ہیں۔

بلتی:

بلتستان میں رہنے والے تمام لوگوں کو بلتی کہا جاتا ہے۔ دراصل بلتی یونانی نام بیالتے (BYALTAE) کی ایک شکل ہے۔ بلتی قومیت کے لوگ دریائے سندھ کے دونوں طرف کرگل سے لے کر گلگت اور سلسلہ قراقرم سے لیکر میدان دیوسائی کے درمیانی علاقہ میں آباد ہیں۔ اس قومیت میں سب سے زیادہ تبتی النسل لوگ ہیں جو زمانہ قدیم میں مختلف ادوار میں مختلف وجوہات کی بنا پر یہاں آباد ہو گئے اور مقامی تبتی معاشرہ میں ضم ہو کر ایک نئی تہذیب اور تمدن کو جنم دیا۔ یہ تمام نسلی گروہ بلتی زبان بولتے ہیں۔

کشمیری:

کشمیری نسل کے لوگ یوں تو ریاست کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی اکثریت وادی کشمیر،

کشتواڑ، پھدرواہ، ڈوڈہ اور رام بن کے علاقوں میں آباد ہے۔ کشمیریوں کی اکثریت مذہب اسلام کی پیروکار ہے۔ تاہم یہاں پر ہندو، سکھ، اور عیسائی بھی مقیم ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں رہنے والے زیادہ تر کشمیری زراعت کے پیشہ سے وابستہ ہیں۔ جبکہ شہری علاقوں کے لوگ تجارت اور صنعت وحرفت سے وابستہ ہیں۔ ان سب کی مشترک زبان کشمیری ہے جو ان کے علاوہ پونچھ اور مظفر آباد کے بعض علاقوں میں بولی جاتی ہے۔

ہانجی:

ان کو، ملہ، مانجی، ہانجی اور ہیر کہا جاتا ہے۔ راجہ بریت سین (۱۰۲تا۱۶۲) اس قوم کو بطور ملاح سنگلد یپ (سری لنکا) سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ قوم کشتی رانی کی زبردست ماہر ہے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ کشتیوں کو بطور رہائش گاہ استعمال کرتے ہیں۔ مچھلی کھانے اور شکار کرنے کے شوقین ہیں۔ ان کا شمار خوبصورت اقوام میں کیا جاتا ہے۔ ہانجی قوم کی بہت سی اقسام ہیں۔ جن میں مشہور ماہنز، ڈونگہ ہانجی، گرہانز، بھات، دار اور ہکہ ہانجی ہیں۔ یہ لوگ جھیل ڈل، جھیل وولر، جھیل آنچار اور دریائے جہلم میں کھنہ بل اور جھتہ کے درمیان اپنی زندگی گزارتے ہیں ان لوگوں کو اپنی نسلی قدامت پر بہت فخر ہے۔ اور یہ خود کو نوح علیہ السلام کی اولاد تصور کرتے ہیں۔

واتل:

واتل قوم یہ ایک کشمیری خانہ بدوش قبیلہ ہے۔ جو چند ماہ تک ایک جگہ خیمہ زن رہنے کے بعد کہیں اور چل دیتا ہے۔ یہ لوگ چمڑا صاف کرتے ہیں۔ جوتے اور دیگر مصنوعات بناتے ہیں۔ کشمیر کے تمام واتل ماہ جولائی میں نسیم باغ کے نزدیک لالہ باپ کی خانقاہ پر جمع ہوتے ہیں۔ اور تمام خانگی مسائل حل کرتے ہیں۔ اس سالانہ اجتماع کے بعد وہ پھر ملک کے طول وعرض میں پھیل جاتے ہیں۔

لون اور پرے:

لون اور پرے قوم کشمیر کے علاوہ پاکستان میں بھی رہتی ہے۔ یہ قبیلہ ویشیا نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا قدیم مرکز چلاس تھا۔ جہلم کی ایک بستی ''ڈھوک لونہ'' اسی قبیلے کے نام سے موسوم ہے۔ منگلا ہملیٹ کے ساتھ لون قبیلے کی ایک بستی ''ڈھوک کشمیریاں'' ہے اس بستی کے تمام لوگ لون قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے مختلف دیہات میں اس قبیلے کے نمائندہ افراد آباد ہیں۔

بومبا یا بمبہ:

یہ ایک چھوٹا سا کشمیری قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کے لوگ بہادر اور جنگجو ہوتے ہیں۔ ان کا مرکز ماچھی پورہ ہے روایات کے مطابق یہ ترکی سے یہاں آئے تھے۔ یہ کاکا اور اتحال خاندانوں میں شادی کرتے ہیں۔ ان کا آبائی مسکن ''بٹ کوٹ'' میں ان کا قدیم قبرستان بھی ہے۔ پنڈت ہرگوپال بمبہ کو برہمن سمجھتا ہے جبکہ ٹھاکر کاہن سنگھ کھشتری پال کی اولاد گردانتا ہے۔ بعض حضرات اس قبیلے کو حضرت عثمانؓ کی اولاد سمجھتے ہیں۔

ڈامر:

یہ سودھرا کی اولاد ہیں۔ اس کشمیری قبیلے کے ساتھ چنگ، زیتی اور گمر بھی آباد ہیں

ننگار اور ادھمولیہ:

نان گاریا ننگار غیر زراعت پیشہ قبیلہ ہے۔ یہ زمینداروں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اور بدلے میں اناج حاصل کرتے ہیں۔ ادھمولیہ راجپوت درحقیقت جموال منہاس راجپوتوں کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ اس کا نام ادھمو دیو والٹی پونچھ بن راجا کپوردیو کے نام پر رکھا گیا ہے۔

شالبانی:

یہ قبیلہ شالیں بنانے کی وجہ سے شالیانی کہلاتا ہے۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے قبائل شامل ہیں۔ یہ اپنا تعلق سیالکوٹ کے راجہ سالباہن (سلواہن) سے بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی معروف شاخیں کول، جلالی، ہنکا، سلطان، اوگرا، امین، موچہ، ڈھونڈ، طوطا، سین، کسو، مسندل، سنگاری، رقیح، بالو، مالاپوت، گھر، مام، میر، اکھر کھوا، باجو، کوکڑو، بانگڑہ، مصری، ٹیکو، رازدان، کاک، منشی، مہٹو، کجرہ، پنڈت، مدن، ڈار، وغیرہ ہیں

خاندان طرہ خان:

شاہ رئیس خان کی تاریخ گلگت (۱۸۸۵تا۱۹۷۴ء) کے صفحہ نمبر۲۔ا کے تحت آج سے تیرہ چودہ سو سال قبل گلگت کے تمام علاقہ جات پر اور چترال تا حدود یا میر یعنی تاش کروغن اور از حد بدخاشاں تا تراک بل پہاڑ (کوہ ہام) ایک ہی فرمانروا خاندان کی حکومت تھی۔ جس کو طرہ خان گلگت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ آذر جمشید کے نام سے معروف تھا جو مذہباً آتش پرست تھا۔

گنائی خاندان:

ایک معزز کشمیری خاندان ہے جس کا اصل وطن بارمولا ''باب الکشمیر'' ہے، جہاں سے یہ شاخ پونچھ اور کشمیر تک پھیلی ۱۸۱۹ء میں یہ لوگ شمالی کوریا کے دارالحکومت سے پونچھ میں بھی منتقل ہوئے اپنے نام کے شروع میں ''خواجہ'' لکھتے ہیں ان میں بزرگ ترین حفاظ، سرکاری اعلیٰ اہلکار، ولی اللہ، نواب اور خطاب یافتہ بزرگ ہوگزرے ہیں۔ نام کے آخر میں ''جو'' بھی لکھتے ہیں

کپور:

کپور خاندان جموں وکشمیر میں بڑی تعداد میں آباد ہے پاکستان میں بھی رہتے ہیں۔لیکن بہت کم۔

بٹ:

بٹ قوم کو بھٹ بھی کہا جاتا ہے۔ بٹ کا مطلب ہے جو چاروں وید جانتا ہو۔ چاروں وید چونکہ صرف برہمن یا پنڈت ہی جانتے تھے اس لئے یہ قوم برہمنوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس خاندان کے افراد کشمیر کے علاوہ پاکستان میں بھی کافی تعداد میں کئی جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔

ڈوگرہ:

صوبہ جموں میں شوالک کے کوہستانی سلسلے کی گھاٹیوں میں سروئیں سر اور مانسر کی دو متبرک جھیلوں کے درمیانی علاقے میں ڈوگرہ قومیت کے افراد کی اکثریت آباد ہے۔ سروئیں سر جموں شہر سے ۳۰ کلومیٹر مغرب میں واقع ہے۔ ڈوگروں کے بارے میں باور کیا جاتا ہے۔ کہ راجپوت نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کئی صدیاں پیشتر راجپوتانہ کے علاقہ سے نقل مکانی کر کے جموں کے پہاڑی علاقوں میں آباد ہو گئے ہیں یہ لوگ ڈوگری زبان بولتے ہیں اور ان کی اکثریت ہندومت سے تعلق رکھتی ہے۔

گوجر قبائل:

ریاست کی آبادی کا ایک بڑا حصہ گوجر قبائل پر مشتمل ہے یہ اصل میں جارجیا کے رہنے والے ہیں جو سویت یونین کے خاتمے کے بعد ایک الگ ریاست بن چکی ہے۔ انتہائی مشکل حالات میں انہوں نے جارجیا کو خیر آباد کہا اور عراق، ایران اور افغانستان کی طرف ہجرت کی اور برصغیر ہندوستان میں داخل ہوئے ۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے کاٹھیا واڑ اور راجپوتانہ میں سکونت اختیار کی۔ جب پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں یہاں خشک سالی پیدا ہوا تو انہوں نے

شمال کا رخ کیا۔ یہ لوگ پنجاب سے گزرتے ہوئے کشمیر میں داخل اور شوالک کی پہاڑیوں میں آباد ہو گئے پھر آہستہ آہستہ یہ ریاست کے باقی حصوں میں پھیل گئے۔

جاٹ:

تاریخی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو جاٹ قبیلہ کے لوگ برصغیر پاک و ہند میں پنجاب، سندھ، راجستھان، جموں کشمیر اور اتر پردیش کے مغربی علاقوں میں آباد ہیں۔ یہ آریہ نسل سے ہیں۔ ان کی نسلی گوت کا نام یادوں (یادو) یا ''جادوں'' ہے جس سے سری کرشن جی تعلق رکھتے ہیں۔ کشمیر میں جاٹ کس کس علاقے میں موجود ہیں۔ اور ان کی آگے کون کون سی گوتیں پروان چڑھی ہیں۔ کتنا عرصہ یہ کشمیر پر حکمران رہے۔ اس سب کے بارے میں جی ایم میئر کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

تاریخ میں جاٹوں کی ۱۷۷ کے قریب گوتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں سے بعض یہ ہیں۔ بودہ یا بودے، بچہ، بابے یا بابا، ٹاک، ٹھوکر، ٹھاکر، ڈانگر، سالار، کلو، کاک، گرو یا گورو، لون، متو، ناگرے، نون، نول ناٹک، پرلے، امرال، آہیر، بنگیال، بھٹی، بھون، بھنڈر، بھاگٹ، بھکریل، باجوہ، جھکڑ، جسیال، جنجوعہ، جوئیہ، چیمہ، چیٹھ، اولکھ، چدھڑ، ڈب، رندھاوا، سیال، کھرل، گوندل، گجرال، سندھو، کلوال، لک، لنگاہ، لنگڑیال، ملانہ، میکن، نارو، وڑائچ، ورک، ہنجرال، ہرل وغیرہ۔

چب راجپوت:

مناور توی سے جہلم تک کا علاقہ چھال کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی چبوں کی سرزمین۔ عقیدے کے لحاظ سے ان کی اکثریت مسلمان ہے۔ تاہم کچھ ان میں سے ہندو مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ چب قبیلہ کے لوگ چندر ہستی راجپوت کہلاتے تھے۔

سدھن:

سدھن قبیلہ پونچھ، باغ میں بہت بڑی تعداد میں آباد ہے۔ پونچھ کی ایک تحصیل سدھنوئی (پلندری) کے نام سے وجود میں آئی تھی۔ یہ قبیلہ اصل میں افغانستان کے سدوزئی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قبیلہ کے لوگ افغانستان کے علاوہ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔ احمد شاہ ابدالی بھی افغانوں کی اسی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ سدھنوں کی شکل وصورت، قدوقامت، خدوخال اور معاشرت پونچھ میں رہنے کے باوجود افغانوں جیسا ہے۔ جو کہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ یہ اصل میں افغانی النسل ہیں۔

ملد یال:

ملد یال نسلی طور پر مغل قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پونچھ اور باغ میں ان کی بڑی تعداد آباد ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ کا نام مولود بیگ ہے۔ جو جہانگیر کے دور میں کشمیر آیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ وادی کشمیر سے براستہ برم گلہ پونچھ آ کر تحصیل حویلی کے علاقہ دیگوار میں آباد ہو گیا۔ اور پھر یہی شادی کر لی۔ اس کے چار بیٹے ہوئے اور پھر ان سے اس کی نسل بڑھنے لگی۔ یہ اپنے مورث اعلیٰ کی وجہ سے ملد یال کہلائے۔

ڈھونڈ (عباسی):

ڈھونڈ قبیلہ کی اکثریت آج کے آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں آباد ہے۔ تاہم دوسرے اضلاع میں بھی اس قبیلہ کے لوگ آباد ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں مری، کہوٹہ اور ہزارہ میں ان کی خاصی تعداد آباد ہے۔

مذاہب:

مذہب بنیادی طور پر عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معانی راستہ، طریقہ اور اعتقاد کے ہیں۔ ہندی میں مذہب کو دھرم اور انگریزی میں (Religion) کہتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں مختلف ادوار میں لوگ اپنے رہنے سہنے کے طریقے، ایمان اور یقین کا راستہ اپناتے تھے۔ جو بعد ازاں مذہب کا روپ دھار لیتا تھا۔ کیونکہ مذہب ہی وہ چیز ہے جو انسان کو زندہ رہنے کے لیے اپنی زندگی کو پورا کرنے کے ساتھ اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی، حلال اور حرام میں تمیز سکھاتا ہے۔ بنی نوانسان کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اپنی تخلیق کا مقصد جان سکے، اپنے مقام کا تعین کر سکے اور اپنا رتبہ بلند کرنے کے لیے مذہب کے بنیادی عناصر کو پہچان سکے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر اور ہمیں جہنم کی آگ کے عذاب سے بچا''

مذہب انسانی شعور کے لیے ضروری ہے تا کہ انسان اس حوالے سے جان سکے کہ کائنات میں اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے۔ مذہب ایک احساس کا نام ہے۔ جو کسی مقدس بالاتر اور ان دیکھی ذات کا وجود دل و دماغ میں پیدا کرتا ہے۔ مذہب ایک ازلی اور ابدی حقیقت کو تسلیم کرنے کا نام ہے جس کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔

دنیا میں ہر قوم، نسل، یا طبقہ کوئی نہ کوئی مذہب ضرور رکھتا ہے۔ عالم و جاہل، شریف و بدمعاش، امیر و غریب، افریقہ کا وحشی اور یورپ کا تعلیم یافتہ فرد اس لحاظ سے برابر ہیں کہ ان کا کوئی نہ کوئی مذہب ہے۔ کشمیر کی تاریخ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ اس نے اپنے اندر مختلف مذاہب کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ تحقیق کے مطابق کشمیر میں کئی مذاہب آئے اور تصوف کے کئی دبستان کھلے جن میں ناگ مت، ہندومت، بدھ مت، شیومت، رشی مت اسلام اور سکھ قابل ذکر ہیں۔

جو کہ اسلام سے پہلے اکثریت میں تھے۔ وادی کشمیر کے قدیم ترین آباد کار ناگ مت کے پیروکار ہیں۔ انہیں ناگا اور ناگی بھی کہتے ہیں۔ اسی حوالے سے ذوالفقار ارشد گیلانی لکھتے ہیں:

> بعض محققوں کا خیال ہے کہ ناگ لوگ چین کے رہنے والے تھے اور وہ آریہ لوگوں کے ہمراہ ہندوستان پہنچے۔ البتہ بعض مورخین کا کہنا ہے۔ کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے کشمیر سمیت پورے ہندوستان میں ناگا لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ناگ پوجا کرنے والے لوگ تہذیب وثقافت کے کس دور میں تھے اور ان کی معاشرت کی نوعیت کیا تھی تاہم یہ طے ہے کہ ناگا لوگ دیوی دیوتاؤں کے طور پر سانپوں اور اژدھوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ان کے سردار کا نام نیل تھا۔ جس نے ''نیل پسران'' تحریر کی۔ ناگا لوگ خود کو آفتاب کی اولاد تصور کرتے تھے۔ اور سانپ کا پھن ان کا قبائلی نشان تھا[۴۴]

مزید لکھتے ہیں:

> جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ناگا لوگ چین، جاپان، فلپائن نیپال، پاکستان اور ہندوستان کے قدیم ترین باشندے ہیں۔ ہندوستان کی ریاست ناگالینڈ میں آج بھی یہ باشندے موجود ہیں[۴۵]

ناگ مت کے بعد کشمیر میں ہندو دھرم کا آغاز ہوا جس کا خاتمہ اسلام کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ بدھ مت، مہاتما بدھ سے منسوب ہے اور اس کے پیروکار آج بھی لداخ اور اس کے گردونواح میں آباد ہیں۔ اس کا شمار دنیا کے تین بڑے مذاہب میں ہوتا ہے۔ بدھ مت کی دو بڑی شاخیں ہیں ان میں سے ایک تکتہ کے لوگ پاکستان، ہندوستان، سری لنکا، برما اور ہندچینی میں بستے ہیں ان کی تعداد تقریباً ۱۰ کروڑ ہے۔ جبکہ دوسرے خیال کے لوگ چین، کوریا، جاپان، تبت اور منگولیا وغیرہ میں بستے ہیں۔ ان کی تعداد ایک ارب کے قریب ہے۔ شومت درحقیقت بدھ اور ہندومت کی کشمکش کے نتیجے میں پروان چڑھا۔ اس کے پیروکار خدا کو شو کا نام دیتے ہیں۔ شو ہر جگہ موجود ہے۔ اسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ کائنات کی ہر شے خدا کی ذات کا عکس ہے ان کے عقائد کے مطابق روح غیر مادی ہے۔ مرد وزن میں کوئی تفاوت نہیں۔ حقوق برابر ہیں۔ ذات پات اور رنگ نسل کے امتیازات کی کوئی حیثیت نہیں۔ برہمن اور شودر کی روحیں یکساں طور برعظیم روح میں جذب ہوسکتی ہیں۔ شومت کے چھتیس اصول ہیں۔ جنہیں تتوئے کہا جاتا ہے۔

رسی مت کی ترکیب قطعی غیر اسلامی ہے۔ اس لیے اسے کشمیر کا مقامی تصوف کہا جاتا ہے۔ یہ بدھ مت سے لگاؤ کھاتا تھا نہ اسلامی تصوف سے۔ اس کے پیروکار گوشت اور مچھلی نہیں کھاتے تھے۔ بلکہ جنگل کے پھلوں اور جڑی

بوٹیوں سے پیٹ بھرتے تھے۔ کشمیر کے رشی اور پایا منشیات کے سخت خلاف تھے۔ یہ مذہب عرصہ دراز تک رہا اور اکبر و جہانگیر کے زمانے میں ان ریشوں کی تعداد دو ہزار سے زائد تھی کہا جاتا ہے۔ کہ رشی مت پر بدھ مت کا اثر زیادہ تھا اسی لیے مہاتما بدھ کی طرح رشی مت کے بانی شیخ نورالدین عرف نندرشی نے اپنے بیوی بچوں اور گھر بار چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔

مذاہب کشمیر کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زمانہ قدیم میں کشمیر ناگ مت، ہندومت، شیومت، رشی مت، اسلام اور سکھ مت جیسے مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ موجودہ ریاست جموں کشمیر چار حصوں میں تقسیم ہے۔ یعنی آزاد کشمیر، گلگت بلتستان، اقصائی چین، بھارتی مقبوضہ کشمیر، اس میں اسلام، بدھ مت، اور ہندومت کے پیروکار موجود ہیں۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے حصوں لداخ میں ۵۰ فیصد بدھ مت، ۴۷ فیصد اسلام اور ۳ فیصد دیگر مذاہب کے پیروکار رہتے ہیں۔ جموں میں ۶۶ فیصد ہندومت، ۳۰ فیصد اسلام اور ۴ فیصد سکھ مت و دیگر مذاہب کے پیروکار رہتے ہیں۔ وادی میں ۹۵ فیصد اسلام، ۴ فیصد بدھ مت اور ایک فیصد دیگر مذاہب کے پیروکار ہیں۔ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں ۹۹ فیصد اسلام اور ایک فیصد دیگر مذاہب کے پیروکار رہتے ہیں۔ اس سے با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جموں کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

رہن سہن:

کشمیریوں میں ثقافت کی جڑیں گہری اور مختلف علاقوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ بہت زیادہ سخت جان ہیں ان کا زیادہ وقت بوٹس کے اندر رہ کر گزرتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ رات بھی اسی میں گزارتے ہیں۔ مکان لکڑی کے بنانے کا رواج ہے۔ اسی میں رہتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ بہت غریب ہیں۔ مشکل سے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ اپنے گھروں کو خوبصورت بنانے کے لیے چھتوں پر پھول اگاتے تھے۔ کھانے میں چاول ان کی بنیادی خوراک ہے۔ اس کے علاوہ گندم اور مکئی کی روٹی بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اسے اگاتے ہیں اور خوب محنت کرتے ہیں۔ سبزیاں اور پھل ان کے اپنے ہوتے ہیں۔ مویشی وغیرہ پالتے ہیں۔ یہ لوگ ناشتے میں دہی، نان، اور کشمیری چائے استعمال کرتے ہیں۔ شادی بیاہ ہوں یا اموات، تقریبات میں کھانا ان کی روایت ہے۔ گلابی اور کالی چائے کے ساتھ کشمیری چائے کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔ کشمیری چائے میں نمک کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

لباس:

کشمیر میں خواتین خود کو خوبصورت زیورات، بالیوں، ہار، نتھ، چوڑیوں کان کی بالیوں اور رنگا رنگ لباس سے

مزین کرتی ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتے اور پسند کرتے ہیں۔ مرد شلوار قمیض بہت شوق سے پہنتے ہیں۔ خواتین سر اور جسم کا اوپر والا حصہ ڈھانپنے کے لیے شال (چادر) اوڑھتی ہیں۔ مرد روایتی لباس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ فرن ایک اونی لباس ہے جس پر پھولوں کی شکلوں کی رنگا رنگ پیچ دار اور سجاوٹ کا کام ہاتھوں سے کیا ہوتا ہے۔

زبان:

زبان کسی بھی علاقے کی طرز معاشرت اور رابطے کی عکاس ہوتی ہے۔ اردو، کشمیری اور گوجری یہاں کی سرکاری زبانیں ہیں۔ ہندی، پہاڑی اور لداخی زبان بھی کشمیر کے کچھ حصوں میں بولی جاتی ہے۔ کشمیر کے وہ علاقے جو زیادہ تر پہاڑی ہیں وہاں پہاڑی زبان بولی جاتی ہے۔ ہر جگہ زبان میں مختلف قسم کی تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی تلفظ اور مطالب تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہاں کا مقامی رسم الخط عربی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے علاوہ سرحدی علاقوں میں قدیم فارسی اور پنجابی بھی بولی جاتی ہے۔

رسم و رواج:

ہر قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو پسند کرتی ہے۔ اور اسی میں خوش رہتی ہے۔ کیونکہ جن باتوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ وہی دل کو اچھی لگتی ہیں۔ ریاست جموں کشمیر تاریخی ثقافتی ورثے کا گھر ہے۔ ان ثقافتوں اور روایتوں کے رنگ جموں کشمیر میں بہت سے میلوں اور تہواروں میں ظاہر ہوتے ہیں یہاں کی مسلمان آبادی روایتی مذہبی تہوار عقیدت اور احترام سے مناتی ہے۔ ریاست کے بقول تہواروں میں عیدالاضحیٰ، عید میلاد النبیؐ، لوہری، ہولی، تراتری وغیرہ شامل ہیں کشمیری آج بھی امن اور مساوات کے خواہش مند ہیں۔ اس لیے وہ اپنے مسائل علاقے میں موجود خانقاہ یا مسجد میں اکٹھے ہو کر حل کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس بچے کا نام اسلامی نسبت سے اسلامی مہینے کا نام دیا جاتا ہے۔ یا اس کے علاوہ صوفیاء سے محبت کرتے ہوئے ان کی نسبت سے نام رکھا جاتا ہے۔ یہ صوفیاء کے مزارات پر بکثرت حاضری دیتے ہیں۔ اور ان کی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ شادیوں کا اہتمام بڑی سادگی اور دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ خوب ہلا گلا اور موسیقی کا تڑکا بھی لگاتے ہیں۔ انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ جب کوئی مہمان آ جائے تو اس کی مختلف روایتی کھانوں سے خوب مہمان نوازی کرتے ہیں

موسیقی اور رقص:

ریاست کشمیر میں موسیقی، رقص اور ڈرامہ کی روایت تاریخی اور بہت گہری ہے۔ ریاست کی لوک موسیقی اور رقص

کشمیریوں کی زندگی میں شامل ہے۔مختلف مواقع اور رسموں، شادیوں اور مذہبی تہوار کے مطابق مختلف قسم کے رقص کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ریاست کے مقبول رقص میں سے ایک ماسک رقص ہے جو ہر سال میلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ اکثر رقص متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو رنگا رنگ بروکیڈ کا لباس اور بھاری ماسک پہنتے ہیں۔ ریاست میں شادی کی تقاریب میں حقیقتاً رقص کیا جاتا ہے۔ جہاں نوجوان کشمیری بڑے بچے نغمہ رقص پیش کرتے ہیں۔ موسیقی کے آلات میں سب سے مشہور رباب ہے۔ اور تمام موسیقی کے آلات میں دکرا سیتارا اور ناگرا ہیں۔ یہاں پر تین قسم کی موسیقی اہمیت کی حامل ہے۔ صوفی، غزل اور چورل موسیقی، واناوون بھی ایک موسیقی ہے۔ جو عام تقریبات کے دوران گائی جاتی ہے۔

زرعی پیداوار:

ریاست جموں وکشمیر ایک زرعی ریاست ہے۔ یہاں کے اسی فیصد باشندے زراعت سے وابستہ ہیں۔ ریاست میں صرف آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار ایکڑ زمین زیر کاشت ہے۔ باقی زمین پہاڑی ہونے کی وجہ سے بے کار پڑی ہے۔ ریاست کو مختلف فصلوں کے حوالے سے کس طرح تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی حوالے سے جی ایم میئر رقمطراز ہیں:۔

> صوبہ لداخ میں سخت سردی اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے پچیس فیصد سے بھی کم زمین زیر کاشت ہے۔ ریاست زیر کاشت زمین میں ۲۹ فیصد پر مکئی، ۲۶ فیصد پر دھان، ۲۲ فیصد پر گیہوں اور ۹ فیصد پر دالیں کاشت ہوتی ہیں [۴۶]

اس ریاست کو زراعت کے حوالے سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

صوبہ جموں کا زرعی خطہ

صوبہ کشمیر کا زرعی خطہ

لداخ کا زرعی خطہ

جموں کا زرعی خطہ:

جموں کی پہاڑیوں کے دامن کے ساتھ ساتھ زرخیز زمین کا ایک لمبا تنگ خطہ ہے۔ اس میں آب پاشی مصنوعی ذرائع سے ہوتی ہے۔ خطہ کا ۲۰ فیصد حصہ زیر کاشت ہے۔ جس میں ضلع جموں اور کٹھوعہ میں گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ ضلع ڈوڈہ پونچھ اور اودھم پور میں مکئی، جو، جوار، باجرہ اور دالیں کاشت ہوتی ہیں۔ کنڈی کے علاقے میں ٹیوب ویلز کے ذریعے آبپاشی ہوتی ہے۔ یہاں چاول مکئی اور گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ پیدرواہ اور کشتواڑ میں زیرہ الائچی اور

گلاب گڑھ میں شہتوت اگائے جاتے ہیں۔ جن کے پتوں پر ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں۔

کشمیر کا زرعی خطہ:

وادی کشمیر میں سطح ہموار، مٹی زرخیز اور آب پاشی کے تقریباً تمام وسائل موجود ہیں۔ لیکن آب و ہوا چونکہ سرد ہے اس لیئے سال میں ایک ہی فصل ہوتی ہے۔ دریائے جہلم اور دیگر چھوٹے دریاؤں اور نالوں سے سیراب ہونے والی زمینیں بہت زرخیز ہونے کے علاوہ ہموار ہیں۔ ان میں اعلیٰ قسم کے چاول پیدا ہوتے ہیں۔ جو کہ کشمیر کے لوگوں کی تمام خوراک ہے۔ یہاں کی ۵۰ فیصد زمینوں پر ناشپاتی، اخروٹ، آڑو، آلو بخاری، خوبانی اور انگور وغیرہ شامل ہیں۔

کشمیر کی کچھ زمین شوپیاں سے بارہ مولا تک باقی زمین سے اونچی ہے۔ اسے کربوہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسلام آباد کے قریب بھی پہاڑ کے دامن میں ایک وسیع کربوہ ہے۔ ان میں دھان کے علاوہ مکئی کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ ان کربوہ میدانوں کی بڑی جغرافیائی اہمیت ہے۔ جی ایم میئر کشمیر کا جھیل ہونے کی نشاندہی کچھ یوں کرتے ہیں:

> ارضیاتی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وادی کشمیر کا کسی زمانے میں ایک وسیع جھیل ہونا محض/افسانوی تصور نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت ہے اور کربوہ میدان اسی جھیل کی تہہ میں بیٹھی ہوئی زرخیز مٹی کے باقیات ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا کربوہ ۵۰ میل لمبا اور ۱۶ میل چوڑا شوپیاں اور بارہ مولہ کے درمیان پھیلا ہوا ہے[۴۷]

اس کے علاوہ وادی کشمیر میں ریشم کے کیڑے پالنے کے لیے شہتوت کے درخت بھی اگائے جاتے ہیں۔

لداخ کا زرعی خطہ:

ضلع لداخ وادی کشمیر کے شمال مشرق میں ہمالیہ کے سلسلوں کے درمیان واقع ہے۔ سارا پہاڑی علاقہ ہے۔ آب وہوا انتہائی سرد اور خشک ہے۔ تاہم یہاں بھی رویشو سے لے کر کارگل اور دراس تک قدیم جھیل کی باقیات ملتی ہیں۔ یہاں کی زمین کے ۲۲ فیصد رقبہ پر گندم اور باقی پر باجرہ، جوار اور دالیں اگائی جاتی ہیں۔ اس کے مزید علاقوں سے متعلق جی ایم میر لکھتے ہیں کہ:

> شمالی علاقہ جات میں میوہ جات کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ جن میں خوبانی، شہتوت، اخروٹ، انگور، ناشپاتی، سیب، بادام، آڑو، انار، انجیر، آلوچہ اور چیری (گیلاس) شامل ہیں۔ گلگت اور دیامیر کے اضلاع میں بارہ سو مربع میل پر جنگلات پھیلے ہوئے ہیں۔ جن سے سالانہ تقریباً چھ لاکھ فٹ اعلیٰ

قسم کی لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں کے جنگلات میں ۶ ہزار فٹ تک ایش، زیتون، بدم، چلغوزہ، اور شاہ بلوچ کے درخت پائے جاتے ہیں۔ اس سے اوپر بھوج پتر کے درخت پائے جاتے ہیں۔ جن کی چھال قدیم زمانے میں کاغذ کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ کشمیری میں اس کو برزہ کہتے ہیں۔ اور انگریزی میں BIACH شمالی علاقہ جات میں قیمتی جڑی بوٹیاں بھی اگائی جاتی ہیں۔ جن میں کٹھ، زیرہ، گچھی، مشک بالا، ممیرہ، گیاندر، وغیرہ قابل ذکر ہیں ۴۸

ریاست جموں وکشمیر کو باغات، جھیلوں، چشموں، دریاؤں اور جنگلات کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ اسی حوالے سے مُنیر احمد بخاری لکھتے ہیں:

باغات:

ریاست جموں کشمیر میں بے شمار حسین باغات ہیں۔ ان میں شالا مار باغ، نشاط باغ، نسیم باغ، نگین باغ، چشمہ شاہی باغ، بادامی باغ اور حضوری باغ زیادہ مشہور ہیں۔ یہ تمام باغات سرینگر اور اس کے گردونواح واقع ہیں۔ شالا مار باغ جھیل ڈل کے آخری کنارے پر واقع ہے۔ نہروں، پھولوں، بارہ دریوں اور فواروں کی وجہ سے انتہائی خوبصورت ہے۔ نسیم باغ میں چناروں کے بہترین درخت ہیں۔ نشاط باغ بھی ڈل کے کنارے ہی واقع ہے۔ سرینگر سے دو میل دور جموں روڈ پر بادامی باغ اور آٹھ میل دور حضوری باغ واقع ہیں۔

جھیلیں:

جنت نظیر خطہ کشمیر میں بہت سی جھیلیں بھی ہیں ان میں جھیل ڈل، جھیل ولر، جھیل مانس بل، جھیل شیش ناگ، جھیل رتی گلی، جھیل نگہن، جھیل آبخار، جھیل ہوکرسر، جھیل گنگامل، جھیل تار مارسَر، جھیل نیلہ ناگ، جھیل کرشن سَر اور دشن سَر، ال پتھر جھیل، رتی گلی جھیل، منکلا جھیل، شندور جھیل، جوتیال سز جھیل، کتوال سَر جھیل، پورٹ جھیل، ابر کچورا جھیل، جھیل سَرن سر، جھیل مانسر، جھیل سناسر، جھیل باگ سر، جھیل نیل سر وغیرہ مشہور ہیں۔ ڈل سب سے خوبصورت جھیل ہے۔ جو سرینگر کے قریب پہاڑوں میں واقع ہے۔ دو ننھے جزیرے روپ لنکا اور سونا لنکا اس کے قدرتی حسن میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ اس کے قریب و جوار میں تخت سلیمان، شاہی چشمہ اور نشاط باغ واقع ہیں۔

چشمے:

۱۔ چشمہ ویری ناگ: اس کی گہرائی ۵۰ فٹ اور محیط ۱۰۰ فٹ ہے۔ دریائے جہلم اسی سے نکلتا ہے۔

۲۔ اشت ناگ: ''اس چشمے کا پانی گرم اور گندھک آمیز ہے۔ جلدی بیماریوں کے لیے اکسیر ہے''

۳۔ چشمہ مارتنڈ:

۴۔ اچھ بل

۵۔ ککڑ ناگ: ''پانچ چھوٹے چشموں کا مجموعہ ہے''

۶۔ چشمہ کھیر بھوانی

۷۔ چشمہ شاہی: ''اس کا پانی بوتلوں میں بھر کر باہر بھیجا جاتا ہے''

۸۔ چشمہ تتہ پانی: ''گندھک آمیز گرم پانی، جوڑوں کے درد اور جلدی امراض کے لیے شفا بخش ہے''
(ضلع پونچھ (آزاد کشمیر) کے قصبہ ہجیر سے ۲۵ کلومیٹر مشرق کی طرف جبکہ کوٹلی سے ۳۷ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے)''

۹۔ تتہ پانی پرمنڈل: ''راجوری جموں روڈ پر کالاکوٹ کے مقام پر واقع ہے''

۱۰۔ تتہ پانی دگجن: ''ہیر پور سے ۱۰ میل مشرق کی جانب مغل شاہراہ پر واقع ہے''

۱۱۔ تتہ پانی ہروری گوجراں: ''رجوری میں واقع ہے۔ اس کے پانی سے گندھک کی بو نہیں آتی''

جنگلات:

ایک اندازے کے مطابق کشمیر کے تقریباً ۱۱۰۰۰ مربع میل علاقے پر جنگلات ہیں۔ جن میں مشہور درخت دیودار، چیل، نیندر اور پاپولر وغیرہ کے ہیں۔ دیودار کا درخت سب سے اعلیٰ درخت ہے۔ یہ پانچ ہزار فٹ سے زائد بلندی پر واقع خطہ زمین پر ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر میں یہ درخت مظفر آباد کے علاقے میں ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے باقی جنگلات مقبوضہ کشمیر میں واقع ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں کئی چھوٹے بڑے دریا ہیں جن میں سے بڑے دریاؤں کی تعداد آٹھ ہے۔ اور چھوٹے معاون دریاؤں کی تعداد تقریباً چھتیس ہے۔ جن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ **دریائے سندھ:**

اس کا انگریزی نام INDUS سنسکرت نام سندھ، یونانی نام سنتھوس Sinthos، سنگھے خباب Sanghe

Khabad شہر کے دہانے والا ہیں۔ایک انگریز نے اسی نام سے کتاب ''شیر دریا'' تحریر کی ہے۔ یہ دریا مغربی تبت میں۰۰۰،۱۷فٹ کی بلندی پر جھیل مانسر دور سے جنم لیتا ہے۔لداخ میں داخل ہو کر۳۰۰میل تک شمال مغرب کی جانب لداخ اور ترنسکار کے درمیان سفر جاری رکھتا ہے۔گلگت میں داخل ہونے کے بعد اس کا رخ جنوب کی جانب ہو جاتا ہے۔ دریائے زنکار، شیوک، شیگر اور گلگت کو لے کر پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں تربیلا کے مقام پر ایک عظیم بند تعمیر کیا گیا ہے۔لداخ میں داخل ہونے سے سزین کے مقام پر ریاست کی حدود سے نکلنے تک اس میں ۲۵ چھوٹے دریا (ندیاں) شامل ہوتے ہیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ھاتلے ندی، کھرنا ندی، زنسکار ندی، سور (Suru) ندی، دراس ندی، شنگھ ندی، شنگر ندی، استور ندی، تانگیر ندی۔

۲۔ دریائے شیوک:

لداخ کے شمال میں واقع شیوک ڈیم سے جنم لیتا ہے۔ جنوب مشرق کی طرف بہتا ہوا شیوک ٹاؤن پہنچ کر شمال مغرب کی سمت اختیار کر لیتا ہے۔ کیرس(Kiris) کے مقام پر دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے معاون دریا/ندیاں مندرجہ ذیل ہیں۔ چپ چاپ ندی، گلوان ندی، چنگ چن مو، نوبراندی، سلتورندی، پانگ کانگ ندی۔

۳۔ دریائے گلگت:

صوبہ گلگت کے انتہائی شمال اور شمال مغربی علاقوں کے مختلف گلیشیر اور وادیوں سے بہہ کر آنے والے ندی نالوں کے اجتماع سے بنتا ہے۔ اس میں ندیاں شامل ہیں۔

خنجراب ندی، گوجراب ندی، مسگر ندی، چیرسن ندی، شمشال ندی، ہنزہ(Hunza) ندی، اشکومن ندی، یاسین ندی، دریائے غذار (Ghzar)۔

۴۔ دریائے نیلم (کشن گنگا):

صوبہ کشمیر میں وادی تلیل کے مشرقی حصہ سے نکل کر مغرب کی جانب بہتا ہوا وادی نیلم میں داخل ہوتا ہے۔۱۸۰میل کی مسافت طے کر کے مظفر آباد پہنچ کر دریائے جہلم میں شامل ہو جاتا ہے۔

۵۔ دریائے جہلم:

اس کا منبع چشمہ ویری ناگ ہے۔ جو سطح سمندر سے۰۰۰،۶فٹ کی بلندی سے نکلتا ہے۔ اس کی کل لمبائی۴۵۰میل ہے۔شاہ آباد، ڈورد، اسلام آباد، بیج پہاڑہ، اونتی پور، سرینگر، بارہ مولہ، اوڑی، مظفر آباد اور کوہالہ کے شہر

اور قصبے اس کے کنارے آباد ہیں۔ وادی کشمیر میں ۹۰ میل تک اس میں کشتی رانی ہوتی ہے۔ منگلا کے مقام پر اس پر بند باندھ کر بجلی گھر بنایا گیا ہے، جہاں ایک ہزار ۰۰۰، امیگا واٹ بجلی کی صلاحیت موجود ہے۔ وادی کشمیر میں مہورہ کے مقام پر اس کے پانی سے ۵۰،۰۰۰ کلو واٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اسی پر تعمیر ہونے والا ولر بیراج مجاہدین نے تباہ کر کے پاکستان کو خشک سالی سے بچالیا ہے۔ اس کے معاون دریا/ندی نالوں کے نام درج ذیل ہیں:

آرہ پتھ، ساندرن، برنگی، لدر، وشیوندی، دودھ گنگا ندی، سند ندی، پوپرو ندی، کہنار ندی، جھیل میں شمال مشرق کی طرف دریائے پونچھ بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔

۶۔ دریائے پونچھ:

یہ سلسلہ پیر پنجال کی مغربی ڈھلوانوں پر نیل کنٹھ گلی اور جمیاں گلی سے نکل کر شمال مغرب کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں اس کا نام ''سرن'' ہے۔ وادی پونچھ کے مغرب میں منڈی کی طرف سے آنے والی ایک ندی اس میں مل جاتی ہے۔ شہر پونچھ کے مغرب میں ایک اور ندی ''بیتاڑ'' شامل ہو جاتی ہے۔ یہ دریا جولکھ کے مقام پر منگلا جھیل میں شامل ہو جاتا ہے۔ پونچھ شہر، سہڑا، تتہ پانی اور کوٹلی شہر اس کے کنارے آباد ہیں۔

۷۔ دریائے چناب:

بھارت کے صوبہ ہماچل پردیش سے جنم لینے والا ''چندر بھاگا دریا ریاست جموں کشمیر میں ارتھل سے کشتواڑ تک شمال مغرب کی طرف بہتا ہے۔ جہاں سے رخ موڑ کے جنوب کی سمت بہنے لگتا ہے۔ کشتواڑ کے مقام پر ''وارڈون'' اس میں شامل ہوتا ہے۔ رام بن، سلدل، رہاسی، اکھنور کے مقامات پر مختلف رخ تبدیل کرتا ہے۔ جہاں زنبیر نہر اور پرتاپ نہر نکالی گئی ہیں۔ جو جموں کو سیراب کرتی ہیں۔ منبع سے پنج ندی تک اس کی کل لمبائی ۹۵۰ میل ہے۔ اس کے معاون دریاؤں ندی نالوں میں وارڈون (Wordwan) دریائے توی (Tawi)، منادر توی، شامل ہیں۔

۸۔ دریائے راوی:

بھارت کے صوبہ ہماچل پردیش میں پیدا ہوتا ہے۔ مغرب کی طرف بہتا ہوا، چمبہ سے گذر کر جموں میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں سے سرحد کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا جنوب کا رخ کرتا ہے۔ بسونی، مادھوپور سے ہوتا ہوا کھٹوعہ کے قریب پنجاب میں داخل ہو جاتا ہے۔ ۴۵۰ میل سفر کر کے احمد پور سے ۱۰ میل جنوب میں چناب میں شامل ہو جاتا ہے۔ اوجھ ندی (ojH) یاس کُند ندی سے نکل کر راوی میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح ریاست کے چھوٹے بڑے دریاؤں کی تعداد ۴۵ بن جاتی ہے۔

گھریلو دستکاریاں اور کارخانے:

گھریلو دستکاریاں کشمیر کی قدیم ترین روایت رہی ہے۔ قدیم زمانے میں بھی ان دستکاریوں کی مانگ چین، یورپ اور وسطی ایشیا تک رہی ہے۔ یورپ کے شاہی خاندانوں میں کشمیری شال کا استعمال عام تھا اور وہ اسے بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اب اس کی مانگ پوری دنیا تک پھیل چکی ہے۔ یہاں کی گھریلو دستکاریوں میں شال بافی، پیپر ماشی، قالین بافی، وڈ کارونگ، غدہ سازی، کشیدہ کاری وغیرہ شامل ہیں۔ ان دستکاریوں کا آغاز پندرھویں صدی میں سلطان زین العابدین نے کروایا۔ یہ ۱۴۲۰ سے ۱۴۷۰ کا دور ہے۔ جب سلطان نے اپنے بیٹے شاہی خان کو سمرقند بھیجا کہ وہ وسط ایشیا سے ماہر کاریگر لے کے آئے تا کہ اس صنعت کو مزید وسعت دی جائے۔ شاہی خان اپنے ساتھ بہت سارے قالین باف، مینا کار زین ساز اور پیپر ماشی کے ماہر لے کے آیا جن کی وجہ سے اس صنعت کو عروج حاصل ہوا۔

آریاء:

آریاء کسی نسل یا قوم کا نام نہیں ہے۔ بلکہ آریاء وہ لوگ ہیں جن کا آبائی وطن خوارزم اور بخارا کا خطہ تھا اور جنہوں نے دو ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ وسطی ایشیا کی چراگاہوں سے نکل کر جنوب مغربی ایشیا کا رخ کیا تھا۔ ان کو اپنی برتری پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اس لیے یہ اپنے آپ کو برتر کہنے کے لیے آریاء کہتے تھے۔ سنسکرت میں آریاء کے معنی اونچی ذات، شریف اور آزاد کے ہیں۔ یہ لوگ دراصل کاشتکار نہیں تھے۔ بھیڑ بکریاں پالتے تھے۔ اور ان کی زندگی کا انحصار انہیں مویشیوں پر تھا۔ تو گویا یہ اپنے ساتھ سنسکرت لے کے آئے تھے۔ ان میں جو بھیڑ بکریوں کو پالنے کے لیے استعمال ہوتا تھا اُسے گاوشی کہتے تھے۔ اور یہ لفظ جنگ کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ گھوڑا ان کی سواری کا جانور تھا اور یہ رتھ کا استعمال جانتے تھے۔ یہ چونکہ سرد علاقوں سے آئے تھے تو یہ اونی لباس پہنتے تھے۔ ان کے مرد اور عورتیں دونوں پگڑی باندھتے تھے اور یہ لوگ لمبے بال رکھتے تھے۔ اور عورتیں اوپر باندھتی تھیں۔ گوشت زیادہ کھاتے تھے۔ سورا ان پسندیدہ مشروب تھا۔ ایک خاص مشروب جو یہ عبادت کے دن میں پیتے تھے اسے سوم رس کہتے تھے۔ ان کا معاشرہ قبیلہ واری تھا ان کے سربراہ مرد تھے۔ ایک گھرانے کے لوگ اکٹھے جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ یا نمدے کے خیمے بنا لیتے تھے۔ ہر گھر میں ''اگنی شالہ'' تھا جس میں آگ جلائی جاتی تھی۔ اور ایک الگ زنان خانہ بناتے تھے۔ جہاں عورتیں الگ رہتی تھیں۔ گھر کے مالک کو یہ دم پتی کہتے تھے اور عورت کا درجہ مرد سے کم تھا۔ البتہ جو انہوں نے رگ وید لکھے ان میں کچھ عورتوں کے نام بھی ہیں۔

بیاہ کی رسمیں یہ لڑکی کے میکے میں مناتے تھے۔عموماً ان کے ہاں ایک مرد اور ایک عورت کا رواج تھا۔لیکن بعض اوقات مرد کی ایک بیوی اور کئی بیویاں ہوسکتی تھیں۔بستی کا رواج نہ تھا۔ بلکہ یہ لوگ بیواؤں کی شادی کر دیتے تھے۔ان کے ہاں گھڑ دوڑ، رتھوں کی دوڑ بہت مشہور تھی۔جنگلی جانوروں کا شکار کھیلتے تھے۔ جوا یہ کھیلتے تھے۔ ریگ وید میں یہ پانسہ پھینکتے تھے۔تو ریگ وید نے انہیں کہا کہ پانسہ نہ پھینکو کھیتی باڑی کرو۔ ناچ اور رقص کے بہت زیادہ شوقین تھے۔ بانسری اور چھانچھ کی دھن پر عورتیں ناچتی تھیں۔آریاء تین طبقوں میں تقسیم تھے اور ان کے ہاں چھوت چھات نہیں تھی۔

۱۔ سب سے پہلا قبیلہ چھتری کہلایا۔جنگ کرنے والے

۲۔ براہمن۔یہ مذہبی رسوم ادا کرواتے تھے

۳۔ ویش۔اس میں مختلف لوگ تھے جو مختلف کام کرواتے تھے۔ طبقے ہونے کے باوجود ان کا آپس میں امتیاز نہیں تھا۔ یہ آپ میں شادی کر لیتے تھے بلکہ پیشے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی جو کوئی چاہیے اختیار کرے

ان کا معاشرتی نظام کئی درجوں میں ہے۔ایک خاندان کی جو سماجی وحدت ہے اُسے گراما کہتے تھے۔اور اگر کوئی گھر کا بزرگ ہوتا تھا۔اُسے یہ گرامی کہتے تھے۔گراما سے بڑی وحدت ویش کہلاتی تھی اور اس کا سربراہ ویش پتی کہلاتا تھا۔ پھر اس سے بھی ایک بڑی وحدت تھی جیسے گنا یا جن کہتے تھے۔اس کا جو سردار ہوتا تھا وہ گن پتی کہلاتا تھا۔اس پورے قبیلے کا نظام چلانے کے لیے جو کمیٹی ہوتی تھی اُسے ''سمیتی'' کہتے تھے۔اور اس میں سب لوگ بالغ ہوتے تھے۔ اور اس میں سارے لوگ ممبر تھے۔اور روزمرہ کے جو امور تھے اس کے لیے ایک اور کمیٹی تھی اس کا نام تھا ''سبھا'' اس میں قبیلے کے بزرگ شامل ہوتے ہیں۔

یہ خانہ بدوش تھے خانہ بدوشوں کے ہاں نہ کوئی عبادت گاہ تھی اور نہ مورتیوں کو پوجنے کا رواج۔لیکن ان کے مذہب میں مظاہر فطرت کو دیوتاؤں کا مرتبہ حاصل تھا گویا ان دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے بھجن بھی گاتے اور جانوروں کی قربانی بھی کرتے تھے۔ان کے سب سے بڑے دیوتا کا نام ہے ''درونا'' یہ ان کا آسمان کا دیوتا ہے۔ دوسرا ان کا دیوتا ہے ''اگنی'' یہ ان کا آگ کا دیوتا ہے۔تیسرا ان کا دیوتا ہے ''وایو'' یہ ان کا ہوا کا دیوتا ہے۔اور ''مترا'' دیوتا ان کا سورج دیوتا ہے۔ورونا سب سے بڑا دیوتا تھا اور یہ آریہ عفو تقصیر کے لیے ورونا ہی سے دعا کرتے تھے۔

ہندو کلچر:

ہندی تہذیب کی یہ خاصیت رہی ہے کہ اس نے نئی نویلی تہذیبوں کو اپنے اندر اسقدر سمویا ہے کہ وہ اپنی اصل شناخت برقرار نہ رکھ سکیں۔ان نو وارد تہذیبوں کی آمیزیش سے اس کا اپنا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ بیرونی تہذیبیں جو

روایات واقدار اور تہذیب وثقافت ساتھ لے کر آئیں ان سب کو نہ صرف برعظیم کی ہندو تہذیب نے اپنایا بلکہ ان سے دو چار بھی ہوئی جس سے جدیدیت کے رجحانات بھی پیدا ہوئے۔

ہندو کلچر سے مُراد برصغیر کے سب سے بڑے ملک بھارت کی تہذیب، مذہب، فرقے، رہن سہن اور برادریاں اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی بولیاں اور زبانیں ہیں۔ بھارت کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔اسی وجہ سے ایک جغرافیائی خطہ ہونے کی حیثیت سے کافی چیزیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ اس کی آبادی زیادہ تر ہندومت سے تعلق رکھتی ہے۔لیکن اس کے بارے میں بھی بہت ساری چیزیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ آریاء کو اگر دیکھیں تو وہ بت پرستی نہ مانتے ہوئے پھر بھی ہندو ہیں۔ برہمو سماج کو دیکھیں تو وہ بھی توحید کا عقیدہ رکھتے ہوئے بھی ہندو ہیں۔ ہندو دھرم کے زیادہ تر لوگ بت پرستی کے قائل ہیں۔اور اگر کوئی ملحد ہے تو وہ بھی ہندو ہے۔

ہندی تہذیب میں برہمنوں کو اولیت حاصل رہی ہے۔ اور انہوں نے اپنے بنائے ہوئے ذات پات کے چھوٹے چھوٹے طبقوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور انہیں حقوق دینے سے محروم رکھا۔ برہمنوں کی حکومت پورے برصغیر پر تھی ان کے احساس برتری اور زعم نے محکوم طبقات کے اندر احساس محرومی کے جذبات پیدا کیے۔ جس سے برصغیر کی تہذیب وثقافت کو نقصان پہنچا۔ بقول قرۃ العین حیدر:۔

> سارے دیش میں برہمنوں اور کھشتریوں کا راج تھا۔ سندھ کی وادی میں برہمنوں کی حکومت تھی۔ سراوستی والے مگدھ کے باسیوں کے پہلے ہی کب خاطر میں لاتے تھے۔ برہمنوں کا احساس برتری آریوں کے اس دور کی یادگار تھا جب انہیں ڈینیوب کے ساحلوں پر قبائلی فوقیت حاصل تھی ۴۹

ہندی تہذیب کبھی جمود کا شکار نہیں ہوتی حالانکہ بعض عوامل کی وجہ سے اس کے خدوخال بنتے اور بگڑتے رہے اور اس کی شکلیں بھی تبدیل ہوتی رہیں۔ یہ تبدیلیاں کبھی کسی انقلاب کے زیر اثر اور کبھی کسی حادثے کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئیں۔ گویا ہندی تہذیب کا سفر زمانے کے نشیب وفراز کے ساتھ جاری رہا اور یہی نشیب وفراز اس تہذیب کی پہچان اور انفرادیت کو واضح کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی آمد:

آٹھویں صدی عیسوی میں برعظیم میں مسلم تہذیب کے حوالے سے تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں مسلمان فاتحین اور تاجروں کی رفتہ رفتہ آمد کے بعد ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے دیبل سے ملتان تک کا علاقہ فتح کیا اس طرح علاقے میں اسلام کی آمد ہوئی۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں ہندو راجہ کی حکومت تھی۔ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ اس خطہ زمین

پر ایک نئی ثقافت کا دور شروع ہوا۔ بھمبھو اور منصورہ کے شہروں سے مسجد کے آثار کے علاوہ عرب دور کے کچھ سکے بھی ملے ہیں۔ اس عہد میں فن تعمیر، مصوری، خطاطی اور موسیقی کے فن کو ترقی ملی۔ اس خطہ زمین پر مسلم تہذیب جس کی بنیاد محمد بن قاسم نے رکھی، مختلف حکمران خاندانوں غزنوی، غوری، خلجی، تغلق، سادات، سید، لودھی اور مغلوں سے ہوتی ہوئی ہمارے ثقافتی ورثے کی صورت میں ہم تک پہنچی اور آج ہم اسے ''ثقافتی تاریخ'' کہتے ہیں۔

ہندوستان میں بڑھتے ہوئے ظلم وستم کو دیکھتے ہوئے عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو چند ہزار فوج اور کچھ سامان حرب ضرب کے ساتھ راجا داہر کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی فوج کی راجہ داہر کی فوج سے زبردست لڑائی ہوتی اور راجہ داہر مارا گیا۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کی سرزمین کو ظلم وستم اور سرکشی سے پاک کر دیا۔ پھر محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کئی علاقوں پر حملے کیے اور انہیں فتح سے ہمکنار کیا۔

محمد بن قاسم کے بعد متعدد مسلم حکمران آئے۔ اور تھوڑی تھوڑی مدت میں بدلتے رہے۔ جس کی وجہ سے پہلے کی بانسبت نظم ونسق خاصا اثر انداز ہوا۔ اس کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دور اقتدار میں اہل سندھ اور ہند کو دعوتی خطوط جاری کیے جن میں توحید و رسالت کی دعوت اور بت پرستی سے دور رہنے کی بات کی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سارے لوگ اور سرداران اسلام میں داخل ہوگئے۔ جن میں سرفہرست ''جے سنگھ'' بن داہر تھا۔ مسلمانوں کا یہ سلسلہ عبدالملک بن شہاب ۷۷۶ء تک چلا اس کے تقریباً دوصدی بعد ۹۹۷ء میں محمود غزنوی آئے۔ اور متعدد حملوں کے بعد حکومت ہند کو اپنے قبضے میں لیا۔ ان کے بعد ۱۱۷۱ء میں محمد غوری آیا اور کئی معرکہ آرائیوں کے بعد فتح حاصل کی۔ اور سلاطین ہند میں اپنا نام شامل کروایا۔ لیکن ہندوستان پر باضابطہ مسلمانوں کی طویل حکومت کا آغاز ظہیر الدین بابر سے ہوا۔ اس سے پہلے جو بھی آیا اس کی حکومت محدود علاقے تک رہی لیکن محمود غزنوی نے اس میں کافی اضافہ کیا۔

کشمیر کی مخلوط ثقافت:

قدیم زمانے میں انسان خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتا تھا جب اس کی روزی روٹی کا مسئلہ حل ہوگیا۔ یعنی اس کے پاس غذائی اجناس جب وافر مقدار میں آگئیں تو وہ اس فکر سے آزاد ہوگیا کہ آج تو میرے پاس ہے نہیں معلوم کل ہوگا کہ نہیں۔ وہ ان مسائل سے جیسے ہی آزاد ہوا تو تہذیب نے جنم لیا۔

انسانی ذہن کے اندر جب ایک خیال بنتا ہے تو اسے ہم تہذیب کہتے ہیں۔ اور جب وہ چیزیں بن کر تیار ہو جاتی ہیں تو انہیں ہم ثقافت کا نام دیتے ہیں۔ ہماری تہذیب کا مطلب ہے مل جل کر رہنا کیونکہ ہم دریائے سندھ، گنگا اور جمنا کے درمیان کی پیداوار ہیں اس لیئے ہم تہذیب کے اعتبار سے ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ایک مخلوط کلچر کا ماخذ

ہے۔ جس میں لوگ جو مختلف زبانیں رکھتے تھے آ کر آباد ہوئے۔ ان میں سے کچھ تاجر تھے اور کچھ خانہ بدوش۔ کسی بھی کلچر یا تہذیب کے لیے وہاں کی زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، اخلاق و عادات، رسم و روایات، علم و ادب، حکمت و فلسفہ، عقائد، فنون لطیفہ، خاندانی تعلقات وغیرہ بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں مختلف طرح کے لوگوں کے آنے سے جس کلچر نے وجود پایا اُسے بعد میں مخلوط کلچر کا نام دیا گیا۔ کیونکہ یہ کلچر بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور بھوٹان میں بسنے والے لوگوں کا مشترکہ کلچر تھا۔ اور آج یہ ان ممالک میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ موجود ہے۔

ہڑپہ، موئن جوداڑو اور ٹیکسلا کی تہذیبیں بہت ہی قدیم اور مشہور ہیں۔ ٹیکسلا کا پرانا نام تکسا شیلا ہے۔ وسطی ایشیا کے میدانوں سے آنے والے آریاء کا یہاں کی تہذیب و ثقافت میں بہت اہم کردار مانا جاتا ہے۔ اس حوالے سے سبط حسن لکھتے ہیں: ''آریوں نے بعد میں جو شہر بسائے ٹیکسلا، پش کلاوتی (چارسدہ) اور پورشاپور (پشاور)۔ وہ بھی شمال ہی میں واقع ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مرکز ٹیکسلا تھا''۵۰

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آریا بھی ہندوستان کی تہذیب و ثقافت میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ تاریخ کے مطابق ٹیکسلا میں آریا سے پہلے کوئی ایسی قوم گزری ہے جو ناگ پوجا کرتی تھی۔ اس کے آثار کشمیر میں آج بھی موجود ہیں۔ بھارت کے صوبے آسام میں ان کی اکثریت ہے اور یہ برما اور وسطی ہند میں بھی رہتے ہیں۔

جس طرح ہندوستان کو سندھ، گنگا اور جمنا کی تہذیب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جموں و کشمیر میں جہاں جہاں پانی کی گزرگاہیں تھیں ان کے اردگرد انسانیت نے جنم لیا۔ یہ کیونکہ ایک ہی خطہ تھا اس لیے لوگ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے۔ اسی حوالے سے ذوالفقار ارشد گیلانی کچھ اس طرح سے لکھتے ہیں:

> محققین اس امر کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وادی پر تر شکار (یعنی کشن) عہد کے آغاز قبل دو سو سے زائد سال تک یونانی نژاد بھارتی بادشاہ حکمران رہے۔ کننگھم نے ورمولا اور جہلم کے درمیان پہاڑی سلسلے میں وتاست (دریائے جہلم) کے کنارے ایزس اور ایزی لیس کے بہت سے چاندی کے سکے (انڈو سمتھین سکے) دریافت کیئے۔ یونانیوں کے ساتھ وادی کشمیر کے تعلق کا ثبوت یہاں کی خوبصورت عمارتوں اور مندروں کے ڈیزائن اور بعد میں برسر اقتدار آنے والے کشمیری بادشاہوں کے سکوں کی صورت میں موجود ہے''۵۱

کشمیر چونکہ برصغیر کے اندر موجود ہے اور اس وقت یہ سب کچھ ہندوستان کہلاتا تھا۔ اس لیے جس طرح کا کلچر

باقی ہندوستان میں پروان چڑھ رہا تھا اسی کے ساتھ ملتا جلتا کلچر کشمیر میں بھی پروان چڑھ رہا تھا کچھ تضادات ضرور تھے کیونکہ ہندوستان کے میدانی علاقوں کے لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے اور مال مویشی پالتے تھے۔ جبکہ کشمیر میں یہ چیزیں بہت کم تھیں یہاں کے لوگ مزدوری کرتے تھے اور مرد و خواتین ہاتھوں سے چیزیں بناتے اور بیچتے تھے۔ روایتی دستکاری میں یہ ہاتھ کے لیئے مشہور ہیں۔ کشمیری لوگ مختلف قسم کی دستکاریاں، شال اور قالین کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لکڑی کے کام اور رسی والے جوتے بھی بہت خوبصورت بناتے ہیں۔ پورے دنیا سے لوگ ان کی چیزیں خریدنے آتے تھے۔ روایتی موسیقی اور تہوار ہر کسی کے اپنے اپنے انداز میں ہوتے تھے۔ ہندوستان کے مخلوط کلچر میں کشمیر کی بھی ایک اہمیت ہے۔ کیونکہ یہاں کے لوگ بھی مقامی نہیں ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ اس لیئے پورے ہندوستان کا کلچر ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ان میں سے بعض چیزیں ایک جیسی ہیں اور بعض مختلف۔ کشمیر میں بھی چونکہ ہر طرح کے لوگ رہتے تھے اس لیئے ہر ایک کا کلچر دوسرے سے تھوڑا بہت مختلف تھا۔ لیکن جیسے ہی ہندوستان میں اسلام نے قدم رکھا تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں رائج مخلوط کلچر تقسیم ہوتا گیا۔ پھر ہر کوئی اپنے مذہب کے مطابق رسم و رواج اور تہوار منانے لگا۔ لیکن کافی عرصہ اکٹھے رہنے کی وجہ سے آج بھی بہت ساری چیزیں مشترک ہیں۔

لیکن اس ہندی، مسلم تہذیب کے اشتراک سے جو فطری آمیزہ وجود میں آیا وہ نہ تو اسلامی تھا اور نہ ہی ہندی بلکہ دونوں تہذیبوں کے ملاپ سے ایک مشترک چیز وجود میں آئی اور پھر صدیوں تک جاری رہی۔ شہزاد حسین کی رائے ملاحظہ فرمائیں:۔

> مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی رات کو جب ڈھولک لے بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں۔۔۔ پھر گگری موری ڈھرکائی شام۔۔۔ کرشن کنھیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر حرف نہ آتا تھا۵۲

> ہندو اور مسلمانوں میں سماجی طور پر کوئی فرق نہ تھا خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے پاجامے پہنتیں اودھ کے بہت پرانے خاندانوں کی بیگمات اب تک لہنگے پہنتی ہیں۔ بن بیاہی لڑکیاں دونوں ساڑھی کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنتیں۵۳

ثقافت کسی زبان، معاشرے یا ملک کی پہچان ہوتی ہے۔ معاشروں کے مستقبل کا تعین بھی ثقافتی ورثے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جموں و کشمیر کی ثقافت بہت زیادہ نشیب و فراز سے ہوتے ہوئے آج کسی نہ کسی حالت میں موجود ہے۔

حالانکہ کشمیری اپنی ثقافت کے بہت زیادہ وفادار نہیں رہے۔ ریاست جموں کشمیر قدیم ترین ریاستوں میں سے ایک ریاست کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن کشمیری اپنا ماضی تقریباً بھلا چکے ہیں۔ کشمیر کی ثقافت میں شمالی جنوبی ایشیائی اور وسطی ایشیا کی ثقافت کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ کشمیر کا خطہ اپنی لازوال خوبصورتی اور تاریخی ثقافت کے باعث دنیا بھر میں ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں مسلمان، سکھ، ہندو اور بدھ آباد ہیں۔ جن کے اپنے اپنے جداگانہ طرز زندگی نے یہاں کی ثقافت کو تقویت دی ہے۔ آزاد کشمیر کی ثقافت میں پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شمالی علاقے پر پوٹھوہاری ثقافت کے بہت سے اثرات پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے زیادہ تر باشندے اردو، پوٹھوہاری اور پہاڑی زبان بولتے ہیں۔ صرف پانچ فیصد لوگ مقامی زبان بولتے ہیں۔ یہاں کی خواتین کا روایتی لباس پہاڑی طرز میں شلوار قمیض ہے۔ مرد بھی شلوار قمیض شوق سے پہنتے ہیں۔ خواتین سَر اور جسم کے اوپر کے حصے کو ڈھانپنے کے لیے شال (چادر) اوڑھتی ہیں۔ یہاں کی ثقافت کی جڑیں گہری اور دوسرے علاقوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ چاول کشمیریوں کی بنیادی خوراک ہے اس کے علاوہ زیادہ تر لوگ اپنے روزمرہ میں گندم اور مکئی کی روٹی پسند کرتے ہیں۔ گندم، مکئی، سبزیاں، پھل، اور چاول خود اگاتے ہیں۔ مقامی سطح پر زیادہ تر لوگ مویشی خود پالتے ہیں۔ جن میں گائے، بکریاں اور مرغیاں شامل ہیں۔ یہ لوگ بہت زیادہ محنتی اور جفاکش ہیں۔ اس لیئے خود چیزیں اگاتے اور مویشی پالتے ہیں۔ کیونکہ ان کا گزر بسر انہیں چیزوں پر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیئے ان کی دستکاریاں، قالین اور شالیں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اگر دنیا کے ساتھ رہنا اور ان کو اپنی ثقافت سے روشناس کروانا ہے تو اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔

ہر قوم کی اپنی ایک تہذیبی شخصیت یا پہچان ہوتی ہے۔ کشمیر کی تہذیب ہزاروں سال پرانی تہذیب ہے۔ کشمیر کی تہذیب دنیا کی کئی تہذیبوں سے پرانی اور نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس تہذیب کے بعض پہلو دوسری تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن بعض ایسی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جو ایک قوم کو دوسری قوم کی تہذیب سے الگ اور ممتاز کرتی ہے۔ ہر قوم اپنی تہذیبی خصوصیات سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ اٹک زمانہ قدیم ہی سے ہندوستان پر بیرونی حملہ آوروں کی گزرگاہ اور تجارتی مرکز رہا ہے۔ یہاں سے کابل، سمرقند، بخارا، کشمیر، ہزارہ، سنکیانگ چین، ہند اور سندھ کو راستے نکلتے تھے۔ اس لیئے کشمیر کی تہذیب میں ٹیکسلا اور وادی سواں کی تہذیب کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تہذیب و ثقافت ایک ایسی انسانی میراث ہے جو دنیا کی تمام زمینوں، زمانوں اور مذہبی روایات کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے۔ کشمیر کا خطہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ اور دنیا بھر میں اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں مختلف قومیں آباد ہیں۔ جن کا الگ الگ تہذیبی انداز ہے۔ کشمیری مرد اور عورتیں کھلے کھلے کپڑے پہنتے ہیں۔ جسے یہاں

کا روایتی لباس کہا جاتا ہے۔ خواتین سَر اور دھڑ کو ڈھانپنے کے لیئے بڑی چادر کا استعمال کرتی ہیں۔ وادی کشمیر میں کترس، پہاڑی، گجری، ڈوگرا، کارگلی، لداخی، ہنزہ، گلگتی اور بلتی باشندے مختلف علاقوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اردو، کشمیری اور گوجری یہاں کی سرکاری زبانیں ہیں۔ جبکہ ہندی، پہاڑی اور لداخی زبان بھی کچھ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ کشمیری اپنے مکانات لکڑی سے بناتے ہیں۔ جو کہ ان کی قدیم روایت ہے۔ یہ بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں یہ لوگ انہیں میں رہتے ہیں۔ یہاں کے مشہور کھانوں میں کشمیری کباب، روغن جوش، رستا جگر، کلیجی، میتھی، قیمہ، آلو سمیت بہت سے دیگر پکوان شامل ہیں۔ مختلف اقسام کی خشک اور تازہ سبزیاں مختلف طریقوں سے پکائی جاتی ہیں۔ زرخیز خطہ ہونے کی وجہ سے کشمیری چاول اور گندم اپنے لیے کاشت کرتے ہیں۔ یہاں گندم کی روٹی اور کشمیری کلچا بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ میٹھے میں گلاب جامن، سویاں، فرنی اور برفی بہت مشہور ہیں۔ یہاں گرم دودھ کی چائے اور قہوہ لوگ شوق سے پیتے ہیں۔ یہاں کے لوگ بہت مہمان نواز تصور کیئے جاتے ہیں۔ وادی کشمیر کے مسلمانوں کی سماجی زندگی میں برادری ازم اور قبیلہ ازم نہیں ان میں کافی حد تک ثقافتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ سماجی تقسیم معاشی حالت پر بستی ہے۔ جبکہ آزاد کشمیر اور جموں کشمیر کے وہ علاقے جو بھارت کے زیر قبضہ ہیں۔ مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی زندگی میں قبیلہ ازم کا عنصر پایا جاتا ہے۔ عام لوگوں کے اندر یہ چیزیں آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے مختلف قبیلوں میں رشتے ناطے اور بھائی چارہ بڑھ رہا ہے۔

تقسیم ہند کے فارمولے کے تحت کشمیر اخلاقی، ثقافتی، تہذیبی اور علاقائی طور پر پاکستان کا حصہ ہے۔ پاکستان اور کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور علاقے آپس میں ملتے ہیں۔ کشمیر کے سارے دریا بھی پاکستان کی طرف بہتے ہیں اور سارے زمینی راستے بھی سوائے درہ دنیال کے، یہ درہ بھی کسی سازش کے تحت بھارت کو دیا گیا تھا۔ کشمیر کی زیادہ تر آبادی مسلمان ہے۔ غیر مسلم تقریباً ۱۰ فی فیصد ہیں۔

تقسیم سے قبل کشمیر کے مسائل:

تقسیم سے قبل کشمیر کئی طرح کے مسائل کا شکار تھا۔ جن میں سرفہرست معاشی، معاشرتی، سیاسی و سماجی، اقتصادی بدحالی اور طبقاتی آویزش ہیں۔ اس کے علاوہ ہر دور کے حکمران عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ جن میں سے ڈوگرہ شاہی دور قابل ذکر ہے۔ ان کے دور میں عوام پر طرح طرح کے ٹیکس لگائے گئے، لوگوں کی عزت نفس کے ساتھ کھیلنا جاگیرداروں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ کیونکہ جاگیرداروں کا نظام قائم تھا۔ زمین کا مالک جاگیردار یا زمین دار ہوتا تھا۔ جاگیرداروں کو عوام کی زمین پر ہی نہیں ان کے گھر اور مال و دولت پر بھی اختیار حاصل تھا۔ غریب لوگوں کی عزت کو پامال کرنا اور ان کی بہو بیٹیوں کے ساتھ کھیلنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ لوگ مزدوری کرتے تو ان کی مزدوری ضبط کر لی

جاتی تھی اور انہیں مار دینے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ لوگ کھیتوں میں کام کرتے، فصل اگاتے لیکن پھر بھی اپنے اہل وعیال کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام نہ کر پاتے۔ شوہروں کو اس قدر مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنی بیویاں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حوالے کر دیتے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں جنسی بے راہ روی کا رواج عام ہوا۔ لوگ بیچارے سارا سارا دن کام کرتے اور انہیں اجرت نہ ہونے کے برابر ملتی۔ تمام تر فائدہ بڑے بڑے سرمایہ دار تاجر اٹھاتے۔ کشمیر کی پرانی اور مشہور صنعت قالین بافی کی صنعت ہی ہے۔ لیکن بیوپاری یہ قالین کشمیر سے سستے داموں خریدتے اور دنیا بھر کی منڈیوں میں مہنگے داموں فروخت کرتے تھے۔ لیکن بے چارے قالین باف ہنرمند غربت کی چکی میں پسے رہتے انہیں اس کا کچھ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ بھولی بھالی عوام بھوک، افلاس اور ظلم وستم سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ علاج کے لیے بہتر مواقع نہیں تھے۔ کشمیر میں جو کچھ تھا وہ باہر کے لوگوں کے لیے تھا مقامی لوگ انتہائی پریشان حال تھے۔

انصاف کا کوئی نظام نہیں تھا بادشاہوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے احکامات چلتے تھے۔ روزگار کے مواقع نہیں تھے۔ تعلیم صرف امیر لوگوں کے لیے تھی۔ غریب کشمیری صرف مزدوری کر سکتا تھا۔ بازاروں میں زیادہ تر مزدور کشمیری عورتیں مزدوری کرتی تھیں۔ اشرافیہ کی خواتین پردے میں رہتی تھی۔ گورنمنٹ اور سرکاری محکموں کا نام تک نہ تھا۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ خواتین اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لیے جسم فروخت کرتی تھیں۔ فیکٹریاں اور کارخانے نہیں تھے، لوگ ہاتھوں سے پتھر کی اشیاء بناتے، ہیرے جواہرات تلاش کرتے، مچھلیاں پالتے، شالیں اور قالین بناتے اور اپنا گذارا کرتے۔ اس سب کچھ کی وجہ سے کشمیریوں کی زندگی انتہائی ذہنی اذیت سے دوچار تھی۔ ایک طرف محرومی تھی تو دوسری طرف ڈوگروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا تشدد اور گھروں کی تلاشیاں اور توڑ پھوڑ جس کی وجہ سے عام کشمیری آواز بلند کرنے کی بجائے ڈرا سہما رہتا تھا۔ کہ کہیں کرائے کے غنڈے اُسے بھی تشدد کا نشانہ نہ بنا دیں۔

کہا جاتا ہے کہ ملک کشمیر ۱۵۸۶ء تک ایک خودمختار، منفرد اور مخصوص طرز زندگی، تہذیب وثقافت اور لسانی مذہبی رواداری کے لیے مشہور تھا اور ذہین و باسلیقہ ہنرمندوں اور کاری گروں کی وجہ سے ایران صغیر کہلاتا تھا۔ لیکن بادشاہوں اور ظالموں سے یہ چیز نہ دیکھی گئی جس کے لیے وہ اس کو برباد کرنے کے لیئے چڑھ دوڑے۔ کشمیری اپنی خطا یا رضا و رغبت کی وجہ سے اس صورت حال سے دوچار نہیں ہوئے۔ بلکہ شرافت سادگی اور سچائی کے باعث اس مصیبت میں مبتلا کر دیئے گئے۔ جغرافیائی حالات کے ساتھ ساتھ پرسکون فضاؤں اور تہذیبی ورثے کے باعث یہ قوم بے حد صلح پسند، پر امن اور روحانی طرز حیات کی دلدادہ تھی۔ لیکن بعض اوقات شرافت اور سادگی جب حد سے بڑھ جائے تو اسے بزدلی کا نام دیا جاتا ہے۔ بس یہی کچھ کشمیر اور کشمیریوں کی ابتلاء اور آزمائش کا سبب بنا۔

د۔ کشمیر کی تہذیب و ثقافت پر دیگر اقوام، حملہ آور، مذاہب، رسم و رواج، عقائد کے اثرات:

تہذیب و ثقافت کو قوموں کے تشخص کا اصلی سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی قوم کی ثقافت اُسے ترقی یافتہ، باوقار، مضبوط، عالم و دانشور، فنکار و ہنرمند اور عالمی سطح پر محترم و باشرف بنا دیتی ہے۔ اگر کسی ملک یا ریاست کی ثقافت انحطاط کا شکار ہو جائے یا کوئی ملک گنوا بیٹھے تو باہر سے ملنے والی ترقی اُسے وہ مقام نہیں دلا سکے گی جب تک اس میں اس کی ذاتی دلچسپی شامل نہیں ہوگی۔

جموں و کشمیر کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس خوبصورت ریاست نے ان گنت اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ مقامی افراد و اقوام نے اس کا انتظام و انصرام بڑے زبردست طریقے سے چلایا۔ لیکن جب باہر سے بیرونی حملہ آوار آئے اور انہوں نے قبضہ کیا تو انہوں نے مقامی لوگوں کا بہت استحصال کیا۔ بیرونی حملہ آوروں نے سینکڑوں سال کشمیر پر حکومت بھی کی اور مقامی لوگوں کو لوٹنے کے ساتھ تشدد کا نشانہ بھی بنایا۔ بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ کشمیر کی تاریخ شاید اس سے بھی پرانی ہے۔ جیسا کہ ذوالفقار ارشد گیلانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> حضرت سلیمان علیہ السلام ۹۶۴ قبل مسیح سے ۹۲۴ قبل مسیح تک پیغمبری اور بادشاہت کے مرتبہ پر فائز رہے۔ اس لحاظ سے جھیل کا کشمیر بننا اس عہد کی یادگار ہو سکتا ہے[۵۴]

ہندو عقائد اس سے اختلاف کرتے ہیں اور کشمیر کو ہندو مذہب کے بنیادی دیوتا شو کی بیوی پاربتی کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں کشمیریوں کے اجداد کے ہاں مذاہب کے حوالے سے کوئی خاص تفصیل میسر نہیں ہے۔ حالانکہ بعد میں مختلف اقوام نے کشمیر پر حکومت کی ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مذہب تھا اور اس نے اسی کا زیادہ پرچار کیا۔ مذہب اور تہذیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں بھی انسانی زندگی میں سلیقہ، حسن و زیبائش نظر آتے ہیں۔ وہاں مذہب کا چرچا ضرور ہوتا ہے۔ ہر مذہب تہذیبی ثقافتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں تہذیب، ثقافت، تمدن اور کلچر سب پہ تمدن کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مذہب انسان کی اولین اور اہم ترین ضرورت ہے۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ انسان کی تاریخ میں کوئی معاشرہ تہذیب یا قوم ایسی نہیں ہے۔ جو مذہب سے بالاتر ہو۔ دنیا میں ہر قوم یا نسل کوئی نہ کوئی مذہب ضرور رکھتی ہے۔ عالم ہو یا جاہل، شریف ہو یا بدمعاش، وحشی ہو یا تعلیم یافتہ سب اس لحاظ سے برابر ہیں کیونکہ کوئی نہ کوئی مذہب رکھتے ہیں۔

۱۸۴۶ء میں ڈوگرہ حکمران مہاراجہ گلاب سنگھ (والیٔ جموں) نے انگریزوں کو تاوان ادا کر کے انگریز سرکار سے معاہدہ امرتسر کے تحت یہ ریاست حاصل کی اور یہاں شخصی حکومت کی بنیاد رکھی اور یہاں کے باشندوں پر ظلم کے پہاڑ

توڑنے شروع کیئے۔لیکن اس کے باوجود تاریخ اور سماجیات کے ماہرین تسلیم کرتے ہیں۔کہ کشمیری ہر دور میں اپنی تہذیب وثقافت کا دفاع کرتے رہے۔انتہائی مشکل حالات میں بھی اپنے رسم ورواج اور عقائد کو نہیں چھوڑا اور بنیادی انسانی اقدار کی پرورش برابر جاری رکھی۔حالانکہ یہاں پر مسلمان، ہندو، سکھ، راجپوت اور ڈوگر رہائش پذیر تھے۔کشمیری قوم اپنی خصوصیات کی وجہ سے بہت منفرد ہے۔جنگ کا میدان ہو یا امن کا زمانہ،علم کا میدان ہو یا سیاست کا اس ریاست کے لوگوں نے ہمیشہ اپنی اقدار اور پرچم کو بلند رکھا ہے۔

تحقیق کے مطابق کشمیر میں کئی مذاہب آئے۔اور تصوف کے کئی دبستان کھلے جن میں ناگ مت، ہندمت، بدھ مت، شیومت، رشی مت، اسلام اور سکھ مت قابل ذکر ہیں۔اسلام کی اشاعت سے پہلے انتشار کی کیفیت تھی بدھ مت اور ہندومت کے افکار وتصورات باہم دست وگریبان تھے اس کشمکش نے شیومت کو جنم دیا۔شیومت کے بعد رشی مت کا دور رہا۔اسلامی مورخین کے مطابق رشی مت کشمیر میں اسلامی اور غیر اسلامی، مذہبی اور معاشرتی عوامل کے باہمی ربط کا نتیجہ ہے۔اسے کشمیر کا مقامی تصوف بھی کہا جاتا ہے۔اس کی ترکیب قطعی غیر اسلامی ہے۔ان تمام مذاہب اور عقائد کے باوجود کشمیری اپنے عقیدے پر قائم رہے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص: ۴۱، ۴۲

۲۔ مفتی عکسی، پاکستانی ثقافت، الفیصل لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۳

۳۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۴، ۳۵

۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، سنگ میل لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۹۳

۷۔ ایضاً، ص ۱۷

۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مضمون، کلچر کی لہریں، مشمولہ: ادب اور کلچر مکتبہ عالیہ لاہور، س ن، ص: ۲۱۰

۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، مضمون، ثقافت، ادب اور جمہوریت، مشمولہ: کلچر، از اشتیاق احمد (مرتب) بیت الحکمت لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۵۲۶

۱۰۔ محمد مجیب، دنیا کی تاریخ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۷

۱۱۔ رابرٹ بریفالٹ" (مترجم، عبدالمجید سالک) تشکیل انسانیت، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۶

۱۲۔ عمر زبیری، پروفیسر، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، دارالشعور لاہور ۲۰۰۹ء ص: ۲۰

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۲۰۰۸ء ص ۱۶۷

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۲۰۰۸ء ص ۱۶۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۱۶۔ جلالپوری، علی عباس، روح عصر، تخلیقات لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۵

۱۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۸

۱۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۷

۱۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۵

۲۰۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، خطباب اقبال، بک کارنر جہلم ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۵

۲۱۔ محمد مجیب، تاریخ تمدن ہند، نگارشات لاہور ۱۹۹۵ء، ص ۶۲

۲۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مترجم) برصغیر میں اسلامی کلچر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۱

۲۳۔ خاور جمیل، ادب، کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی کراچی ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۵

۲۴۔ صباح الدین عبدالرحمن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، روہتاس بکس لاہور س ن، ص ۳۷۶

۲۵۔ تاراچند، ڈاکٹر، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، مجلس ترقی ادب لاہور ۲۰۰۰ء، ص ۳۱۳

۲۶۔ قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء، ص ۸۶

۲۷۔ شمیم احمد، ناول نگاری کا غالب رجحان۔ تخلیقی ادب، جلد: ۲ مینا پریس کراچی ۱۹۸۰ء، ص ۳۲

۲۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۷

۲۹۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، لاہور دانیال لاہور ۲۰۱۷ء، ص ۲۲

۳۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل فاؤنڈیشن اسلام آباد ۲۰۰۸ء، ص ۴۲

۳۱۔ بخاری، مُنیر احمد، کشمیر حقائق کے آئینے میں، احباب پبلیشرز لاہور ۱۹۹۸ء، ص ۳۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۲

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۲

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۲، ۳۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۲، ۳۳

۳۶۔ ایضاً، ص ۳۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۴

۳۸۔ ایضاً،ص۳۵

۳۹۔ ایضاً،ص۳۵

۴۰۔ ایضاً،ص۳۵،۳۶

۴۱۔ ایضاً،ص۳۸،۳۹،۴۰،۴۱،۴۲

۴۲۔ ایضاً،ص۴۹۴

۴۳۔ گیلانی، ذوالفقارارشد،تاریخ کا سفر،علم دوست پبلی کیشنز،س ن ص۴۹۶

۴۴۔ ایضاً،ص۵۰۵

۴۵۔ ایضاً،ص۵۰۵

۴۶۔ میر، جی ایم،جموں کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں،مکتبہ رضوان آزاد کشمیر۲۰۰۱ء،ص۱۳۹

۴۷۔ میر، جی ایم، جموں کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں،مکتبہ رضوان آزاد کشمیر۲۰۰۱ء،ص۱۴۰

۴۸۔ ایضاً،ص۱۴۱

۴۹۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۲۰۰۰ء،ص۳۴

۵۰۔ سبط حسن،پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، لاہور دانیال لاہور۲۰۱۷ء،ص۷۷

۵۱۔ گیلانی، ذوالفقارارشد،تاریخ کا سفر،علم دوست پبلی کیشنز،ص۲۷۰

۵۲۔ شہزاد حسین (مرثیہ) افسانے ،نذر سنز لاہور۱۹۹۲ء،ص۱۸۵

۵۳۔ شہزاد حسین (مرثیہ) افسانے ،نذر سنز لاہور۱۹۹۲ء،ص۱۸۶

۵۴۔ گیلانی، ذوالفقارارشد،تاریخ کا سفر،علم دوست پبلی کیشنز،ص۴۹۱

باب دوم

آگ اور شکست کا موضوع اور کشمیر کی تہذیب و ثقافت

ا کرشن چندر کا تعارف

ب ناول شکست کا تعارف

ج شکست کا موضوع بحوالہ کشمیر کی تہذیب و ثقافت

د عزیز احمد کا تعارف

ہ ناول آگ کا تعارف

ر آگ کا موضوع بحوالہ کشمیر کی تہذیب و ثقافت

س اُردو ناول میں کشمیر

ا کرشن چندر کا تعارف

کرشن چندر۱۹۱۳ء میں بھرت پور میں پیدا ہوئے۔لیکن۱۹۱۸ء میں ان کے والد کشمیر کے علاقے پونچھ میں بحیثیت میڈیکل آفیسر تعنیات ہوئے وہ اپنے ساتھ اہل خانہ کو بھی لے آئے۔اگر دیکھا جائے تو یہیں سے کرشن چندر نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا۔ان کی زندگی کے بہترین دن کشمیر کے علاقے میں گزرے جو ان کی شخصیت کی نشو ونما میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔وہ کشمیر کے قدرتی حسن میں پلے بڑھے اور یہاں کے لوگوں کی زندگی کے نشیب وفراز کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔کرشن چندر نے کشمیر کے سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی حالات کا بہت گہرا مشاہدہ کیا۔ساتھ ہی ساتھ وہ کشمیر کے لوگوں کے ناگفتہ بہ سیاسی اور اقتصادی حالات سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔یہ کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کا دور تھا۔یہ وہ دور تھا جب کشمیر کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے قصے زبان زدِ عام تھے۔عوام پر ہر طرح طرح کے ٹیکس عائد تھے، لوگوں کی عزت نفس کے ساتھ کھیلنا جاگیرداروں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔کرشن چندر نے چونکہ اسی دور میں پرورش پائی اور یہاں کی عوام کو ان مظالم کو سہتے ہوئے دیکھا۔

یہی وجہ تھی کہ کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ان کے افسانوں میں کشمیر کا پس منظر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں میں کرشن چندر نے کشمیر کے قدرتی مناظر، خوبصورتی، غربت اور کشمیریوں کے استحصال کو موضوع بنایا۔ان کے کشمیر پر لکھے گئے بعض افسانے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ان میں ''پرانے خدا''، ''جھیل سے پہلے جھیل کے بعد''، ''سڑک کنارے''، ''کشمیر کو سلام''، ''آنسوؤں والی''، ''سفید پھول''، ''محبت کی گھاٹی''، ''کالا سورج''، ''حسن اور حیوانی'' اور ''پورے چاند کی رات'' شامل ہیں۔اردو دنیا میں ''کرشن چندر'' آئے تو افسانہ نگار کی حیثیت سے تھے لیکن ناول نگاری میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

۱۹۴۳ء میں ناول شکست لکھ کر انہوں نے ناول نگاری میں قدم رکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ناولوں کا ایک انبار لگا دیا۔جن کی کل تعداد ۴۵ ہے۔ان ناولوں کے موضوعات میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ناول شکست کے بعد۱۹۵۲ء جب کھیت جاگے لکھا اور پھر۱۹۵۴ء میں طوفان کی کلیاں لکھا۔

گؤدان کی طرح اس ناول میں بھی دیہاتی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔یہ وہ دیہاتی زندگی ہے جسے کرشن چندر نے رومانی پس منظر میں پیش کیا ہے۔اس ناول میں ناول نگار نے برسراقتدار طبقے کے مظالم اور غریب وفادار لوگوں کی مجبوری کو موضوع بنایا ہے۔یہ ناول اس دور میں لکھا گیا۔جب سرمایہ دارانہ نظام اپنے پورے عروج پر تھا اور آزادی کی جدوجہد انتہائی تیز تھی۔سیاسی وسماجی تحریکیں مسلسل چل رہی تھیں۔ان سب کا مقصد صرف آزادی حاصل کرنا تھا۔جن میں ''ایک عورت ہزار دیوانے''، ''درد کی نہر''، ''غدار''، ''ایک گدھے کی سرگذشت''، ''برف کے

پھول''، ''جب کھیت جاگے''، ''پھول کی کلیاں''، ''کاغذ کی ناؤ''، ''آسمان روشن ہے''، کافی مقبول ہوئے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب کئی ناول نگار اپنی تخلیقات کے جوہر پیش کر رہے تھے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کرشن چندر نے ''پریم چند'' کی طرح ایک صنف کو آگے لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ناولوں کی تخلیق اور ان کی زندگی میں مختلف قسم کے مسائل کو فرد اور جماعت کے فکری، جذباتی اور اخلاقی رشتوں سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو بہترین انداز سے پیش کیا۔ آزادی سے پہلے اور بعد کے ہندوستان کی معاشرت میں تغیرات کی جولہر چلی اور انقلاب کے نعرے لگے، ''کرشن چندر'' نے اپنے ناولوں میں بھرپور ترجمانی کی۔ ناولوں کے اسلوب اور موضوعات کی سچائی نے مل کر ایک متوازن ہم آہنگی پیدا کی اور بعد میں یہی امتزاج ان کی انفرادیت کی پہچان بنا۔

کرشن چندر نے اپنے ناولوں میں داخلی اور خارجی منظر کا مکمل نقشہ تیار کرنے میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ ماحول نگاری، جذبات نگاری اور فطرت نگاری کے سلسلے میں ان کا قلم اپنے فن کا اظہار دکھاتا ہے اس لحاظ سے کرشن چندر کا فن بے حد پختہ اور دیرپا حسن کا حامل ہے۔

''برف کے پھول'' ان کا ایک ایسا ناول ہے جس میں کشمیر کی رومانوی فضا میں دو محبت کرنے والوں کی ناکامی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ طاقت اور اقتدار کے بل بوتے پر انسان سے اس کا بنیادی حق یعنی محبت کا جذبہ بھی چھین لیا جاتا ہے۔

''کرشن چندر'' کے سامنے کسی بھی قسم کا موضوع رکھ دیا جائے وہ اسے بہت ہی خوبصورتی سے تخلیق کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ موضوعات کا جیتا جاگتا خزانہ تھے۔ وہ سیدھے سادے موضوع کو ایسی بلندی عطا کرتے کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے جو عوامی ہوتے اور جنہیں عام انسان آسانی سے سمجھ لیتا۔ انہوں نے رومانیت اور حقیقت پسندی کو اپنے ناولوں میں بہت اہمیت دی ہے۔ طبقاتی کشمکش، جاگیردارانہ نظام رائج تھا۔ انہوں نے اس کو بدلنے کی بھرپور کوشش کی ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور بسے ہوئے طبقے کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ شکست جس کا پلاٹ کرشن چندر نے کشمیر کے نظام زندگی سے اخذ کیا ہے اس میں وہاں کے فرسودہ سماجی نظام میں دو محبت کرنے والوں کی ناکامی شامل ہے۔ اسی طرح ''جب کھیت جاگے'' کا پلاٹ ناول نگار نے تلنگانہ کسان تحریک سے لیا ہے جس میں جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے کے لیے کسانوں نے منظم تحریک چلائی تھی۔

اسی طرح ''طوفان کی کلیاں'' کا پلاٹ کشمیر کی ڈوگرہ شاہی حکومت کی غریب مزدوروں اور کسانوں پر مظالم سے لیا ہے۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے۔ اس میں براسر اقتدار طبقے کی استحصالی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے محنت کش طبقے کی مظلومیت اور بے بسی کی ایک تصویر کھینچی ہے۔

''باون پتے'' کا پلاٹ کرشن چندر نے بمبئی کی فلم انڈسٹری سے لیا ہے اور پہلی بار فلمی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔کرشن چندر نے ہمیشہ انقلاب اور جدوجہد کی بات کی ہے۔ وہ لوٹ کھسوٹ، استحصال اور غلامی کے دشمن ہیں لیکن وہ خونی جنگ بھی نہیں چاہتے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر انسانیت پرست ہیں اور سبھی کو خوش اور مسکراتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ب ناول شکست کا تعارف

''شکست'' کرشن چندر کا پہلا ناول ہے جو۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔اس کا موضوع طبقاتی کشمکش اور عشق ومحبت کی داستان ہے۔اس ناول کے اندر فرسودہ نظام کے مقابلے میں ایک ایسے نوجوان کا ذکر ملتا ہے جو صحت مند فکر بہترین ذہن رکھتا ہے۔اسی نوجوان کی فطری و سچی محبت کو''شکست'' کے اندر جدید دور کے انتشار، بے چینی اور کرب کو پیش کیا گیا ہے۔کرشن چندر کا یہ ناول رومانیت کی ایک ایسی داستان ہے جس میں قدیم فرسودہ رسم ورواج اور ذات پات کی درجہ بندی کے خلاف احتجاج ہے۔

اس ناول میں دیہاتی کشمیری عوام کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جس کے اندر کرداروں کے ذریعے اس نظام اور فرسودہ روایات کو توڑنے کی در پردہ خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ یہی اظہار بعد میں فکر کی تبدیلی اور ناول میں ترقی پسند عناصر پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ کرشن چندر کا یہ ناول کسی حد تک رومانوی بھی ہے اور اصلاحی بھی۔ جو سماج میں زمانہ قدیم سے رائج ذات پات اور سماجی بندھنوں کے خلاف تحریر کیا گیا ہے۔

کرشن چندر خود بنیادی طور پر اشتراکی تھے۔ان کا خیال تھا کہ جب تک جھوٹ جھاٹ، ذات پات، اور اونچ نیچ کا خاتمہ ہمارے سماج سے نہیں ہوگا۔تب تک پورے ملک میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔اور وہ اس کی سب سے بڑی وجہ اقتصادیات کو سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ان سارے مسائل کا حل اشتراکیت ہی میں ممکن ہے۔اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔اس ناول کی اہمیت نئی اور پرانی قدروں کی آمیزش کی وجہ سے ہے۔شکست کا انداز بیان شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں خوبصورت مناظر کے تذکرے ہیں اور کردار رومان پسند ہیں۔لیکن ناول نہایت ہی سفاک اور دردناک حقیقت پر مبنی ہے۔

ج۔ شکست کا موضوعاتی مطالعہ بحوالہ تہذیب وثقافت:

شکست کا اصل موضوع دو نوجوان دلوں کی محبت میں ناکامی کا مسئلہ ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ذمہ دار ایسا سماج ہے۔ جہاں پر مذہب، دھرم اور اندھی روایات کے نام پر محبت جیسے انسان کے بنیادی جذبے کا استحصال کیا

جاتا ہے۔ اس موضوع کو کشمیر کے فطری حسن کے پس منظر میں پیش کر کے ناول نگار نے فطرت کی خوبصورتی اور انسانی اعمال کی بدصورتی کے تضاد کو پیش کیا ہے۔ اور ایسے سماجی نظام کو تبدیل کر دینے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ جس میں انسان کو محبت کرنے کی آزادی، مذہب کے نام پر لوٹ کھسوٹ جاری ہو، اور انسانوں کے درمیان ذات پات کے فرق نے جینا مشکل کر دیا ہو۔ دراصل یہی وہ ترقی پسندانہ فکر ہے۔ لیکن وہ یہاں اس کی واضح خواہش کا اظہار نہیں کر پاتے اور مسلسل تذبذب کا شکار ہیں کہ اگر اس نظام کو ہٹا دیا تو اس کی جگہ کون سا لے کے آئیں گے۔ شکست سے کرشن چندر کے بنیادی میلانات اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ جنھوں نے آگے چل کر ایک واضح صورت اختیار کر لی تھی۔ مثلاً وہ یہاں پر ایسی حکومت کے خواہش مند ہیں جہاں ظلم و تشدد نہ ہو لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی حکومت ایسی نہیں جہاں جبر و تشدد سے کام نہ لیا گیا ہو، اس جگہ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس ناول میں سرمایہ دارانہ نظام اور مذہبی ٹھیکیداروں پر سخت طنز کیا گیا ہے۔ جس نے آزادی سے پہلے پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس ناول میں دو کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ ایک کا ہیرو ''شیام'' جو تحصیل دار کا لڑکا ہے اور اس کی محبوبہ ''ونتی'' ایک ایسی عورت کی لڑکی ہے جس کو سماج کے ٹھیکیداروں نے سماج سے باہر نکال دیا ہے۔ انھوں نے شیام کے کردار میں اس دور کے نوجوان کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو اشتراکی ہے اور سماج سے بغاوت کا جذبہ رکھتا ہے۔ مگر اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ جب ''ونتی'' کی شادی نام نہاد مذہبی پیشوا سروب کشن کے لڑکے درگا داس سے ہوتی ہے تو وہ اس شادی کے خلاف ہوتے ہوئے بھی مخالفت نہیں کرتا۔ لیکن اس کے برخلاف ''ونتی'' جب یہ سنتی ہے کہ ''شیام'' کی شادی کہیں اور ہو رہی ہے تو وہ غم برداشت کر سکتے ہوئے جان کی بازی ہار جاتی ہے۔

دوسری طرف ''چندرا'' اور ''موہن سنگھ'' کی محبت کا پہلو ہے۔ ''موہن سنگھ'' ایک راجپوت گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اور ''چندرا'' ایک اچھوت لڑکی دونوں اپنے سماج سے بغاوت کرتے ہیں۔ ''موہن سنگھ'' زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے موت کی آغوش میں پناہ لیتا ہے تو چندرا اس کے غم کی وجہ سے نڈھال ہو جاتی ہے۔

کرشن چندر نے اس کہانی کو کشمیر کے فطری حسن کے پس منظر میں پیش کر کے ہر جگہ فطرت کے حسن اور سماج کی بدصورتی کو ظاہر کیا ہے۔ یعنی مصنف نے اس ناول میں فرسودہ سماجی نظام میں دو محبت کرنے والوں کی ناکامی کو پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف سرمست: ''شکست میں فرسودہ نظام کے مقابلے میں صحت مند اور تازہ و توانا نوجوان کی فطری اور صحت مند محبت کی شکست پیش کی گئی ہے''[۱]

شکست میں عصری مسائل، بے چینی اور سماجی کرب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ناول محض نوجوان مرد اور

عورت کی محبت کی داستان نہیں بلکہ یہ اس عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ شیام اس ناول کا اصل ہیرو ہے۔ شیام کے کردار کی انفعالیت کا تجزیہ کرتے ہوئے جگدیش چندر ودھاون لکھتے ہیں:۔

> شیام باغیانہ اور انقلاب پسندانہ خیالات کا حامل ہے اور وہ فرسودہ اور بوسیدہ معاشرے کو بدل کر رکھ دینا چاہتا ہے لیکن اسے اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت و حوصلہ نہیں۔ اس کی یہی بے عملی اور پست ہمتی اسے ایک انفعالی کردار بنا دیتی ہے[۲]

شکست کا موضوع سماج اور محبت کرنے والوں کی آویزش ہے۔ کرداروں کی محبت کی ناکامی کا ذمہ دار سماج اور اس کی روایت پسندانہ مذہبی تنگ نظر ہے۔ طبقاتی کشمکش اور مذہبی اجارہ داری، رسوم و رواج میں جکڑے انسان مسلسل استحصال کا شکار ہو رہے ہیں اور وہ اسے بدلنے کی خواہش میں خود رزق خاک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً چندرا اپنے محبوب موہن سنگھ کو نہیں مل سکتی کہ مذہب کے اجارہ دار پنڈت سروب کشن کو یہ گوارہ نہیں کہ راجپوت نسل خراب ہو، اس طرح شیام برہمن ہے اور وہ نیچ ذات اور سماج کی دھتکاری ہوئی ونتی سے شادی نہیں کر سکتا، نہ ہی ونتی کی خودکشی پہ کوئی افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

''چندرا'' جو کہ شکست ناول کا اہم کردار ہے۔ ناول میں ایک جگہ پر شیام کے سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ اپنا تعارف کچھ یوں کرواتی ہے:

> میرا نام چندرا ہے، میرا گھر ان درختوں کے جھنڈ کے پرے گھاٹی کے اوپر ہے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہوں، جو ایک بیوہ ہے۔ ہمارے گھر میں ایک کتا بھی رہتا ہے، اس کا نام بھی جاننا چاہتے ہو۔ اس کا نام شیر ہے۔ اجنبیوں اور بدمعاشوں کو مار بھگانے میں وہ سچ مچ ایک شیر ہے[۳]

''چندرا'' موہن سنگھ سے محبت کرتی ہے۔ موہن سنگھ ایک راجپوت گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اور چندرا ایک اچھوت لڑکی۔ موہن سنگھ اپنے عزم و ارادے کا پکا ہے اور چندرا اپنے اس سماج برادری اور سماجی ٹھیکیداروں سے نفرت کرتی ہے اور اپنے باغیانہ خیالات کی وجہ سے وہ سماج سے بغاوت کر دینا چاہتی ہے۔ اس کے کردار کا تعارف کرشن چندر کچھ اس طرح کرواتے ہیں۔ اسے گاؤں والوں، برادری، مہاجنوں، سرکاری عہدے داروں، پنڈت سروب کشن کسی پر اعتبار نہ تھا۔ سب ظالم تھے۔ چور، ڈاکو، اچکے بدطینت چندرا کو بخوبی اپنی غربت اور اچھوت پن کا احساس تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ موہن سنگھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ حالانکہ وہ جانتی ہے کہ گاؤں والے اس محبت کو برداشت نہیں کریں گے اور کبھی نہ کبھی مصیبت کی دیوار اس کی راہ میں حائل ہو گی۔ پھر بھی اس کے حوصلے اور ارادے پست نہیں

ہوئے۔ اُسے نہ تو گاؤں والوں کا ڈر ہے اور نہ ماں کی ناراضگی کی پرواہ۔ اس کی نظر میں سب کچھ موہن سنگھ ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ موہن سنگھ تمام خطرات کے باوجود اس کا بنا رہے۔ لیکن جب موہن سنگ کی محبت پر اُسے شک ہونے لگتا ہے تو وہ اُسے عجیب وغریب انداد سے دھمکاتے ہوئے کہتی ہے۔ میرے لیے تمہیں سب کچھ ہو۔ لیکن یاد رکھو، اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو میں تمہارا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ دوں گی۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے۔

واضح رہے کہ موہن سنگھ کی محبت کے سامنے چندرا کے لیئے اس کی ماں، پنڈت سروب کشن، برادری اور گاؤں والے سب بے حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی محبت پر پہاڑ کی طرح قائم رہتی ہے۔ اسے جب کسی وقت اس کرب وعذاب کا خیال آتا ہے جس سے ماضی میں اس کی بیوہ ماں کو گزرنا پڑا تھا تو اسے تمام گاؤں والے خبیث اور کمینے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کو حوصلہ دیتی ہے۔ ماں کے سمجھانے پر وہ بپھر جاتی ہے۔ اور چیخ کر کہتی ہے:۔

> برادری جائے چولہے میں، بھاڑ میں برادری نے ہمیں کونسا سکھ پہنچایا ہے، جو میں ان کی خوشامد کرتی پھروں۔ اور پھر اب میری کون سی برادری ہے۔ میں نے سوچا، اور موہن سنگھ سے بھی صلاح کر لی ہے۔ جب وہ اچھا ہو جائے گا، پھر ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کسی اور علاقے میں جا بسیں گے، جہاں ہمیں کوئی نہ جانتا ہو۔[۴]

چندرا کا کردار ایک باغی کردار ہے جو سماج اپنی ماں، برادری اور پنڈت سروب کشن کسی سے بھی نہیں ڈرتی ہے۔ چندرا جاہل ہوتے ہوئے بھی ترقی پسندیت پر قائم ہے۔ اس کے برخلاف شیام کا کردار ہے۔ جس کے خیالات ترقی پسندیت والے ہیں۔ مگر اس میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ شیام خود بھی چندرا کی بے پناہ جرأت اور محبت کا قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تعریف کچھ یوں کرتا ہے: ''شیام اس کا منہ تکنے لگا۔ چندرا کی جرأت، اس کا دلیر تخیل اُسے ہمیشہ حیران کر دیا کرتا ہے''۔[۵]

شیام اُسے دیکھ کر سوچتا ہے کہ کس طرح دلیر عورت کے دل میں ایک نیا اور خطرناک ارادہ جڑ پکڑ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اُسے سراہنے لگا: ''کاش وہ بھی اتنا دلیر ہوتا اتنے ہی فولادی عزم کا انسان ہوتا۔ کاش وہ بھی ونتی کو اٹھا کر کسی غیر علاقے میں بھاگ سکتا''۔[۶]

موہن سنگھ کے غیر متوقع حادثے کی وجہ سے اس کی ہمت اور حوصلے یکسر ختم ہو جاتے ہیں۔ اب اُسے اپنی بے بسی اور مجبوری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اب وہ اپنی بے بسی اور مجبوری کی وجہ سے موہن سنگھ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ اس پر موہن سنگھ کی محبت اس قدر غالب آ جاتی ہے کہ وہ نہ اپنا خیال کرتی ہے اور نہ بستی والوں کی

مخالفت کا۔اس مقام پر وہ ہمیں بجائے معشوقہ کے عاشق نظر آتی ہے۔سوائے موہن سنگھ کے اُسے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اس کی زبان سے ایسے الفاظ ادا ہونے لگتے ہیں کہ قاری کے دل میں اس کے لیئے ہمدردی پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔حسن مجبور کا ایک حسین پیکر اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔شیام جب گاؤں والوں کی مخالفت کی بات کرتا ہے تو چندرا اپنی تمام تر مجبوریوں کو بلائے طاق رکھ کر کہتی ہے:''میری ماں کی آپ فکر نہ کریں، اس سے میں خود نبٹ لوں گی۔۔۔ جگ ہنسائی کی میں پروانہیں کرتی، اور پنڈت سروب کشن بولے گا، تو میں اس کا منہ جھلس دوں گی۔''[۷]

چندرا کی مشکلات میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب موہن سنگھ چندرا کی بے عزتی کا بدلہ لینے کیلئے بسنت کشن پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے۔اس کے بعد موہن سنگھ پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔اور چندرا کو اس سے ملنے سے روک دیا جاتا ہے۔لیکن اس کے باوجود وہ ہسپتال کی چار دیواری کے اندر رہتی ہے۔اور ہر تکلیف کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔اس پر شیام، چندرا کی ہمت اور جرأت پر حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔اس کی اس ہمت کو دیکھ کر قاری کو بازار حسن''(پریم چند)'' کی سمن'' یاد آتی ہے۔ان دونوں کے درمیان کو خاص فرق نہیں ہے۔ان دونوں کے درمیان بڑی حد تک برابری نظر آتی ہے۔ چندرا ایک کمزور عورت ہونے کے باوجود موہن سنگھ کو جیل سے بھگانے کی کوشش کرتی ہے۔تا کہ وہ دونوں کسی دوسرے گاؤں میں جا کے چین سے زندگی گزار سکیں۔لیکن چندرا کی تمام کوششیں بیکار ہو جاتی ہیں۔آخر کار موہن سنگھ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بستا ہے۔

موہن سنگھ کی موت چونکہ چندرا کا سب سے بڑا المیہ ہے۔اس لیے وہ پاگل ہو جاتی ہے۔اس کے کردار کی تبدیلی''ونتی'' کی موت کی طرح قاری کو مستجب نہیں کرتی۔موہن سنگھ چندرا کے لیئے دنیا کی سب سے عزیز ہستی تھی۔ عزیز ہستی کے اچانک چھن جانے کے بعد پاگل ہو جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔مختصر یہ کہ کرشن چندر نے چندرا کے کردار کو اتنی جلدی سے پیش کیا ہے کہ شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

ناول نگار نے موہن سنگھ اور چندرا کے کردار میں آنے والے اس روز کی بشارت دی ہے۔جس میں قدیم مہاجنی نظام کے خلاف جس نے انسان کے بنیادی جذبہ محبت کو پروان نہ چڑھنے دیا۔ بغاوت کا پرچم بلند کیا جائے گا۔اور ان کی جگہ ایک بہتر نظام حیات اور نظام حکومت کے لئے جدوجہد کا آغاز ہوگا۔ جہاں پر محبت کے لئے آزادی اور انسانی مساوات کا بول بالا ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے ایک جگہ پنڈت سروب کشن اور چندرا کے کردار کا موزانہ کرتے ہوئے کچھ یوں لکھا ہے:

اگر چندرا باغی تھی تو سروب کشن روایت پرست، ایسا کٹر روایت پرست اس نے اپنی زندگی میں بہت

کم دیکھا تھا۔ وہ موجودہ تہذیب سے کہیں بھی، کسی حالت میں بھی صلح کرنے کو تیار نہ تھا۔ کس طرح وہ سازش، مکر، فریب کے داؤ چلا کر تاریخ کے اس پہاڑ کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا، جو ایک سیلاب عظیم کی صورت میں جمہور کے ضمیر پر چھا رہا تھا۔ اور پرانی قدروں، پرانی روایتوں اور پرانی ریتوں کے خس وخشاک کی طرح بہا لے جا رہا تھا۔ یہاں اس ماندر کی وادی میں شاید یہ سیلاب ابھی نہ آیا تھا۔ لیکن کیا چندرا کی باغی طبیعت اس آنے والے طوفان کا پیش خیمہ نہ تھی؟ کیا موہن سنگھ کی سرکشی اُسی نئے دور کی غمازی نہیں کر رہی تھی؟ ۸

''شیام''، تحصیل دار کا بیٹا ہے اور اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی لڑکی سے محبت کرتا ہے جو نچلے طبقے کی ہے اس کا نام ''ونتی'' ہے۔ ''ونتی'' ایک ایسی عورت کی لڑکی ہے جس کے کردار کو سماج کے پاسبان اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہ نائب تحصیل دار ''علی جو'' کا بہت ہی گہرا دوست ہے جو قدامت پرستی کا حامی ہے۔ شیام اشتراکی خیالات کا حامل تو ہے۔ مگر اس کے خیالات جتنے باغیانہ اور انقلاب پسندانہ ہیں، وہ عمل کے میدان میں اتنا ہی کورا ہے۔ دراصل شیام کے روپ میں اس دور کے نوجوان کی تصویر کشی کی ہے۔ جو سماج کو بدلنے کی خواہش تو رکھتا ہے مگر اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھانے کی اس میں ہمت نہیں۔ صرف زبانی جمع خرچ سے کام لیتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس کردار ''علی جو'' ہے جو رجعت پسند خیالات کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ شیام کی بحث بڑی دلچسپ ہے جو کرشن چندر کے خیالات کی غمازی کرتی ہے۔ جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ دراصل مصنف خود بول رہا ہے۔ شیام دراصل ایک ایسی حکومت کا خواہش مند ہے جہاں ظلم وتشدد ہرگز نہ ہو۔ مگر جب وہ دنیا کے حالات پر نظر دوڑاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی ایسی حکومت کی مثال نہیں ملتی۔ جہاں جبر وتشدد سے کام نہ لیا جائے تو وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے:

حکومت چاہے جمہوری یا اشتراکی ہو۔ جبر اور تشدد اس کی بنیاد ہے۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ حکومت ہو۔ کیا انسان کی زندگی حکومت کے بغیر بسر نہیں ہو سکتی۔ کیا ابھی تک انسان کو خوف کا احساس کرائے بغیر اس سے کوئی اچھا کام نہیں کروایا جا سکتا۹

پر انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ خواب اشتراکی نظام حکومت کو لائے بغیر پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ کرشن چندر کی نظر میں تمام تر برائیوں اور بے اعتدالیوں کا سبب اقتصادی حالت ہے۔ جس کا حل اشتراکیت ہی میں مضمر ہے۔ لیکن اس ذہنی کشمکش کے عالم میں بھی جس جانب ان کا رجحان زیادہ ہے وہی اشتراکیت ہے۔ جسے وہ سارے مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ شیام کہتا ہے:۔

کیا کوئی ایسی حکومت ہو سکتی ہے، جو حکومت نہ ہو، جو جبر پر قائم نہ ہو، جہاں دنیا کے آزاد انسان ایک آزاد انداز سے ایک دوسرے سے آزاد تعاون کر سکیں، جبر و استبداد کے بغیر۔ شاید یہ انسانی زندگی کی معراج ہوگی، شاید اس منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ہمیں اشترا کی رہگذار پر چلنا ہوگا۔[۱۰]

شیام کے بالمقابل کرشن چندر نے علی جو کو ایک قدامت پسند خیالات کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ جو اب تک قدیم نظام تعلیم کا دلدادہ ہے۔ اور حکومت کے متعلق اس کا خیال یہ ہے کہ جبر و تشدد کے بغیر رعایا پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ انہیں طاقت کا احساس دلانے کے لیے ان پر ظلم روا رکھنا چاہیے۔ وہ عوام میں سیاسی بیداری کو ایک ڈرامہ قرار دیتا ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہی نہیں کہ عوام بھی ایک منظم طاقت بن سکتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے خیال میں:۔

عوام تو ایک غیر منظم، منتشر قوت ہے۔ اسے سنبھالنا، اسے استعمال کرنا چند سمجھدار لوگوں کا کام رہا ہے۔ شروع سے چند لوگ بہت سے لوگوں پر حکومت کرتے آئے ہیں، ہمیشہ سے، چاہے یہ حکومت جاگیردارانہ ہو، یا جمہوریت، یا آمریت، شیام صاحب بات دراصل یہ ہے کہ یہ سب اصطلاحیں ہیں۔ عوام کو گمراہ کرنے کے لیے، انہیں اپنے قابو میں لانے کے لیئے گھڑی گئی ہیں۔[۱۱]

اس طرح کرشن چندر نے دو کرداروں کے ذریعے قدیم و جدید ذہن کے فرق کو مکمل طور پر واضح کر دیا ہے اور شیام کے روپ میں قدامت پسند خیالات پر بھرپور تنقید کی ہے۔ اس لیئے کہ قدامت پسند خیالات کی دکھتی رگ کو پکڑ کے قدیم و جدید کے فرق کو نمایاں کیا ہے۔ ''شیام'' انقلاب پسندانہ خیالات کا حامل ہے۔ اور وہ اس فرسودہ اور بوسیدہ معاشرے کو بدل کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے اندر اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں ہے۔ اس کی یہی بے عملی اسے ایک انفعالی کردار بنا دیتی ہے۔ شیام ونتی سے محبت کرتا ہے اور ونتی اس پر جان چھڑکتی ہے۔ ونتی کو جب شیام کی محبت کا حساس ہوتا ہے تو وہ اس کے گلے لگ جاتی ہے اور کہتی ہے:

میں مَر جاؤں گی'' اور وہ اس کی آغوش میں کانپی، پھر وہ اس کی ٹھوڑی سے کھیلنے لگی۔ ''شیام'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وعدہ کرو کہ مجھ سے کبھی نہ جدا ہو گے۔ جب تک زندہ ہوں، تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گا۔

شیام میں بہت پڑھی لکھی نہیں ہوں، پر میں اپنی جان تم پر نچھاور کر سکتی ہوں۔ شیام میں بالکل سچ کہتی ہوں۔ میرا جسم، میرا جسم تو کچھ نہیں ہے، تم اسے اگر اپنے پاؤں کی جوتی بنا کر پہن لو گے، تو بھی مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ لیکن میرے اندر جو دل ہے شیام، اسے ٹھیس نہ پہنچانا میں مر جاؤں گی۔[۱۲]

شیام کے والدین اس کی رضا کے بغیر جب کسی اور لڑکی سے اس کی شادی کر دیتے ہیں تو وہ کچھ بولے اُسے تسلیم کر لیتا ہے۔ اسی طرح جب ''ونتی'' کی شادی اس کی مرضی کے بغیر کسی اور لڑکے سے کر دیتے ہیں۔ جس کا نام درگاداس ہے تو وہ اُسے بھی کسی ردعمل کے بغیر قبول کر لیتا ہے، دوسری طرف ''ونتی'' کا کردار ہے۔ وہ شیام سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے لیکن ایک عورت ہونے کے ناطے اپنے لب نہیں کھولتی اور ایک بے بس عورت کی مانند اپنے رنج وغم کو اندر ہی اندر پی جاتی ہے۔

کرشن چندر اپنے ناول شکست میں کشمیر کے لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں جس طرح لکھتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ بہت ہی مشکل حالات کے اندر اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس دوران انہیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ بہت کم اجرت پر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ سارا دن کام کرتے ہوئے گزارتے ہیں اور میلوں کا سفر خچروں پر طے کرتے ہیں۔ انہیں کے ذریعے وہ سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کے آتے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ تو ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی زندگی تک کا بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ بچ جائے گی یا نہیں اسی سفر میں یہ کئی کئی گھنٹے بھوکے پیاسے گزارتے ہیں۔ کیونکہ بعض جگہیں ایسی بھی آجاتی ہیں جہاں پانی بہت دور ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

> غلام حسین ادھر کوئی چشمہ نزدیک ہوگا بہت پیاس لگی ہے۔ بس کوئی دس پندرہ قدم آگے یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ کو یہیں آکر پیاس لگی، ورنہ دس قدم کے بعد خچروں کے قدم خود بخود رک گئے شاید خچر بھی پیاسے تھے[۱۳]

کشمیری لوگ بھیڑیں، بکریاں گائیں اور بھینسیں پالتے ہیں کیونکہ سرکاری نوکریاں بہت ہی کم لوگوں کو ملتی ہیں اور اگر یہ ساری چیزیں نہ پالیں تو ان کا گزارا نہیں ہوسکتا۔ یہ لوگ کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں اور جانور اور مرغیاں بھی پالتے ہیں۔ اسی منظر کی ایک ہلکی سی جھلک کرشن چندر ناول شکست میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:۔

> ایک لڑکی بھینس کے تھنوں سے دودھ دوھ رہی تھی۔ ایک گوجر اس کے پاس کھڑا تھا۔ یہاں ایک مکان تھا۔ ایک لالہ دھوتی باندھے ہوئے ننگی کھاٹ پر گھٹنے اوپر اٹھائے حقہ پی رہا تھا۔ قریب ہی ایک چولہے میں ایک بڈھیا لکڑیاں لگا رہی تھی۔ آٹا گوندھ کر پاس دھرا تھا۔ قریب ہی دو ایک گائیں ڈکرانے لگیں۔ ایک بچھیا پیشاب کرنے لگی۔ آگ، دھواں، گوبر، پیشاب، حقے کی گڑ گڑاہٹ، بھٹوں کی سوندھی خوشبو، اور جھاڑیوں پر کھلے ہوئے جنگلی گلاب، نیل دھاری کی بیلیں، جن میں بے

شمار چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ یہ سب چیزیں اس کے احساسات پر اس طرح حاوی ہوگئیں کہ وہ بالکل خالی الذہن ہوکر اونگھنے لگا اور اس کے جسم کی ہر حرکت خچر کی چال سے ہم آہنگ ہوگئی اور اس کے دونوں پاؤں بے طور جھولنے لگے[۱۴]

غربت اس قدر زیادہ تھی کہ لوگوں کا گزر بسر نہیں ہوسکتا تھا وہ جو کچھ ہاتھ سے بناتے اس کی اصل قیمت تو وہ وصول کرتا جوان سے کوڑیوں کے بھاؤں چیزیں خریدتا تھا۔ غربت کی وجہ سے حالات اس قدر شدید ہو جاتے کہ عورتیں مجبوری کی وجہ سے اپنی عصمت دری کرواتی تھیں۔ امیر لوگوں کے لیے عیاشی کا سامان تھیں۔ یہ بات درست ہے کہ مجبور عورت کو زمانے نے بہت بُری طرح استعمال کیا ہے۔ کشمیری عورتیں بہت زیادہ محنت مزدوری بھی کرتی ہیں۔ لیکن زندگی کو جینے کے لیئے وہ امیر لوگوں کے ہاتھوں استعمال ہوتی ہے۔ بعض خاوند بھی ایسے ہیں جو اپنی بیویوں کو اس کام کے لیے بھیجتے ہیں اور پیسے وصول کرتے ہیں۔ کئی عورتیں اسی بھوک کی وجہ سے دوسروں مردوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں اور باقی زندگی چھپ کر گزارتی ہیں۔ محبت اور روٹی کے حوالے سے کرشن چندر اپنے ناول شکست میں کچھ یوں لکھتے ہیں: ''ہاں وہ بہت پیار کرتا تھا۔ وہ تلخ لہجے میں بولی۔ فاقے کراتا تھا، ہر روز پیٹتا تھا، ہر روز رات کو ہم بستری کرتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں زندگی تلخ ہوگئی۔ پھر میں اسے چھوڑ کر بھاگ آئی۔[۱۵]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''سچ ہے، محبت کو بھی روٹی کی حاجت ہے محبت بھی چاہے وہ کتنی ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو، محض خالی خولی ہم بستری کے سہارے نہیں جی جاسکتی۔ عشق کو بھی روٹی چاہیے''[۱۶]

بعض لوگوں کے حالات اتنے کمزور تھے کہ وہ بڑی مشکل سے زندگی بسر کرتے تھے۔ شکار کرتے تھے جنگلوں میں رہتے تھے بعض کی زندگی سے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے جنگل کے ساتھ شادی کر رکھی ہو۔ اس جنگل نے بعض لوگوں کو بہت زیادہ نقصان سے دو چار کیا کیونکہ جنگل میں بہت زیادہ تعداد میں درندے رہتے تھے۔ کرشن چندر اپنے ناول میں ایک ایسے واقعے کا ذکر بھی کرتے ہیں جب شیام ایک لڑکی کو بھگا کر جنگل میں لایا اس وقت شیام کی عمر بیس بائیس برس تھی۔ کہتا ہے میں دھیر کوٹ سے نورنیشاں کو بھگا کر لایا تھا کبھی کسی کسان کے ہاں رہتا تو کبھی جنگلوں میں بسیرا کرتا۔ کیونکہ سماج اس چیز کی ہرگز اجازت نہیں دیتا جو میں کر چکا تھا۔ جو کچھ ملتا ہم دونوں کھا لیتے اس تمام تر سفر کے دوران نورنیشاں کو کئی بار اٹھانا پڑا جب وہ تھک جاتی۔ اسی حوالے سے کرشن چندر اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ عشق بھی کیا کچھ نہیں کرواتا۔ ''صاحب اگر مرد اور عورت دونوں، ایک دوسرے کو پیار کرتے ہوں تو جنگل سے زیادہ دلفریب جگہ اور کوئی نہیں ہوتی۔[۱۷]

گلا کہتا ہے مجھے وہ دن ابھی تک نہیں بھولے۔ ابھی تک ویسے کے ویسے یاد ہیں جیسے کل کی بات ہو، ہم جنگل میں جب راتیں گزارتے تھے تو ہم آگ کے الاؤ جلا لیتے ایک دوسرے کے منہ میں نچے ڈالتے اور کھاتے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیتے۔ بعض اوقات وہ میرے چہرے کے بھید پڑھ کر شرم سے نگاہیں جھکا لیتی۔ لیکن وقت بہت ظالم ہے یہ صدا برقرار نہیں رہتا یہ تیتر کی اڑان کی طرح ہے۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ وہ دن واپس آ جائیں جب ہم دونوں جنگل میں راتیں گزارتے تھے۔ شام سے صبح ہونے تک میں پہرا دیتا اور وہ سو جاتی اور جب صبح کی پو پھوٹنے لگتی تو وہ اٹھ جاتی اور میں سو جاتا۔ جنگل بہت گھنا تھا اس لیئے آگ ساری رات جلتی اور بندوق بھی اپنے پاس رہتی۔ لیکن اسی جنگل نے مجھے بہت زیادہ نقصان دیا اور مجھ سے میری نور نیشاں چھین لی۔ ایک دن میں جب کھیتوں سے کام کے بعد واپس آیا تو ابھی تک واپس نہیں آئی تھی وہ جنگل میں لکڑیاں چننے جایا کرتی تھی۔ میں اسے ڈھونڈنے نکلا تو کہیں نہ پایا پھر ایک دن اس کی ہڈیاں ایک جھاڑی کے نیچے سے ملیں۔ ایک آدم خور چیتے نے اُسے کھا لیا تھا۔

ایک اور جگہ کرشن چندر لکھتے ہیں:

> وہ اب ایک تہذیب یافتہ انسان نہ تھا۔ بلکہ جنگل ہی کا ایک جانور، جیسے آج سے ہزاروں سال پہلے وہ تھا۔ اس کے اعصاب میں، اعضاء میں، عروقوں میں، شریانوں میں، گوشت کے ایک ایک عضلہ میں، وہی وحشی انسان پھر بیدار ہو گیا تھا۔ یہ بھی جنگل ہی کا معجزہ تھا۔ اس کے ساتھ اُسے یہ بھی معلوم کہ اس کی سینکڑوں سال کی محنت سے حاصل ہوئی تہذیب کا ملمع کتنا پتلا تھا۔[۱۸]

سیداں کو ساری برادری اچھی طرح جانتی ہے کوئی بھی اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اس نے گاؤں کے باہر اپنا مکان بنا رکھا ہے۔ لیکن وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔ اور بیٹی بھی اس کے ساتھ ہے۔ خاوند نے اسے نکال دیا ہے۔ اب اس ماں بیٹی کی دیکھ بھال جیالال کرتا ہے جو کہ سیداں کا بھائی ہے۔ سیداں نے اپنی دوکان بھی بنا رکھی ہے۔ اور وہ اسے کمال ہوشیاری سے چلاتی ہے۔ برہمنی لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ اسے نکال دیا جائے۔ مگر یہ عورت ڈٹی ہوئی ہے۔ اس کے کئی مقامی لوگوں کے ساتھ بہترین تعلقات ہیں اور یہ ہر کسی کی خالہ ہے۔ دوپٹی اوڑھ کر رکھتی ہے۔ اس کا ایک پلوٹخنوں تک آیا ہے۔ لیکن عورت کو کچھ تو شرم ہونی چاہیے۔ لیکن اس نے تو بالکل ہی اُگ سگ بنا دی ہے۔ یہ عورت بڑی جی دار ہے اس کی برادری کے لوگ یہ چاہتے ہیں۔ کہ یہ اپنی بیٹی ونتی کی شادی سروب کشن کے بیٹے درگا داس سے کر دے۔ لیکن یہ ہے کہ ان کی سنتی ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ کشمیر کی عورتیں زیادہ تر خود محنت مزدوری کرتی ہیں۔ اسی طرح سیداں بھی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے ہر طرح کا کام کرتی ہے۔ سیداں ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ میں درانتی اور کدالی ہوتی تو کبھی مویشیوں کے لیے گھاس کا گٹھا، مکئی کا

گٹھا، چری اور ساگ کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا کیونکہ وہ مزدور تھی۔ وہ اتنا کام کرتی تھی کہ اس کی قمیض کہنیوں کے قریب سے پھٹ گئی تھی۔ ہاتھ متواتر کام کرنے سے بدنما اور بدصورت دکھائی دیتے تھے۔ لیکن جہاں سے قمیض پھٹی ہوتی وہاں سے رنگت دودھ کی طرح صاف اور بے داغ دکھائی دیتی تھی۔ کرشن چندر اپنے ناول میں اس منظر کو کچھ یوں لکھتے ہیں:

> بے چاری سیداں مزدور عورت کی جوانی کیا ہے سچ مچ ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے، دو دن میں ساری آب، ساری چمک جاتی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فطری حسن مشاطگی کا اس قدر محتاج نہیں ہوتا، اور مزدور عورت کی جوانی اور خوبصورتی دیر تک قائم رہنی چاہیے کیونکہ وہ مزدور ہے۔ کام کرتی ہے، اوپر کے طبقے کی عورتوں کی طرح دن بھر ناول، ساری، غازہ، پوڈر کے فیشنوں میں غرق نہیں رہتی۔[19]

کشمیر میں بسنے والے لوگوں کے نزدیک پیروں کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ مختلف تقریبات میں ان کو بڑے مہمان کی حیثیت سے بلایا جاتا ہے۔ مختلف مواقع پر ان سے دعا کروائی جاتی ہے۔ حالانکہ ان کے درباروں پر ہر وقت لوگ آتے رہتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کا ایک عقیدہ بن چکا ہے۔ کہ جو پیر صاحب کہیں گے وہی کرنا ہے۔ ان کے ہاں مختلف قسم کے سالانہ میلے لگتے ہیں۔ جن میں عوام بڑے شوق سے آتے اور جو انہوں نے منتیں مانگی ہوتی تھیں وہ بھی لے آتے تھے۔

ان میں سے ایک میلہ ہر سال اگست کے وسط میں لگتا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ دو تین دن یہاں خوب رونق ہوتی ہے۔ شیام اس حوالے سے کہتا ہے عجیب بات ہے ایک ہی مقام کو ہندو اور مسلمان بہت عزت و احترام دیتے ہیں۔ اور اپنی اپنی رسومات ادا کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کے ایک دوسرے کی تقریبات میں شرکت بھی کرتے ہیں۔ نیازیں بھی بانٹتے ہیں۔ دُکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ لیکن علی جو شیام سے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ کہ ایک ہی مقام کو دونوں احترام سے دیکھتے ہوں۔ اور یہ صورت حال آج سے نہیں کئی سو سال پہلے کی ہے۔ کہا جاتا ہے اس کے لیے اس وقت کے بزرگوں نے بہت دانش مندی سے کام لیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے درمیاں پیار محبت کی فضا ہے۔ اسی حوالے سے کرشن چندر کی رائے یہ ہے:۔

> دراصل ہمارے بزرگوں نے نہایت دانش مندی سے کام لیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیب و کلچر میں سمونے کے لیے یہ مقام بہت اہمیت رکھتے تھے۔ یہاں پیر کی قبر اور

> پانڈوؤں کے محل ساتھ ساتھ ہیں۔ انت ناگ میں مسلمانوں کی عبادت گاہ اور ہندوؤں کا مقدس تالاب ایک ہی جگہ پر ہیں۔دونوں اپنے اپنے طریق پر خدا کی عبادت کرتے ہوئے یعنی ایک خاص یگانگت محسوس کرتے تھے۔اکثر دیہاتوں میں مندر، دھرم شالائیں اور مسجدیں ساتھ ساتھ ہوتی تھیں۔[۲۰]

یہ وہ دور تھا جب سب کے درمیان پیار اور محبت کی فضا تھی۔کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہیں تھا کیونکہ اس وقت دلوں میں قدورت نہ تھی دل صاف تھے۔لیکن اب جھگڑے انہیں جگہوں پر زیادہ ہو رہے ہیں جہاں مسجد اور مندر ایک ساتھ ہیں۔لیکن ابھی بھی دیہاتوں میں یہ وبا بہت زیادہ نہیں پہنچی۔لیکن جیسے تعلیم عام ہوتی جائے گی لوگ اپنے اپنے مذاہب کے بارے میں معلومات حاصل کرتے جائیں گے مسائل بڑھتے جائیں گے اور پھر یہ پیار محبت دشمنی میں بدل جائے گا۔

پنڈت سروب کشن جو کہ برہمنوں کا سردار تھا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کافی امیر تھا اس کے پاس جاگیر تھی اس کے برعکس اس کا بھائی اس جیسا امیر نہیں تھا اور لوگ بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔پنڈت سروب کشن کے حصے میں دھرم شالہ آئی جو کہ درختوں کی اوٹ میں تھی۔کہا جاتا ہے کہا ان کے بزرگوں کو جاگیر بھی اسی دھرم شالہ کی وجہ سے ملی تھی۔تاکہ اس کا خرچ چلتا رہے۔لیکن اب پنڈت سروب کشن نے اس پر ایک پجاری کو رکھ لیا تھا۔جو کہ اکثر بیمار رہتی تھی۔اس کی والدہ پوجا پاٹ کرتی تھی۔یہ پجاری خود تو سکھ تھا۔لیکن اس کی والدہ سنائن دھرمی عقائد کی پابند تھی۔لیکن جب یہ کچھ بہتر ہوتا تو گورو گرنتھ کا پاٹ کرتا۔اور اس کی آواز قریب کے گاؤں میں سنائی دیتی۔شیام ان مورتیوں کے حسن کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔اس نے ہندوستان میں مورتیاں دیکھی تھیں۔لیکن یہاں دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔کیونکہ ان پر تو کوئی جل بھی نہیں چڑھاتا تھا اور یہاں خواتین انہیں دودھ سے دھویا کرتیں تھیں۔کرشن چندر اپنے ناول میں انہیں شکستہ مورتیوں کے بارے میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ان شکستہ مورتیوں میں ایک دیوی کا سر بھی تھا، اس قدر خوبصورت کہ اس پر یونانی اصنام گروں کا کاری گری کا دھوکا ہوتا تھا۔دراصل اس کی تراش خراش صاف کہے دیتی تھی کہ اس مورتی کے سنگتراش کے ہر فن پر اصنام گروں کا اثر پڑا ہے۔خاص طور پر بالوں کے باندھنے کا انداز تو قطعاً غیر ملکی تھا۔[۲۱]

شیام نے پجاری سے پوچھا کہ یہ مورتی یہاں کیسے آئی ہے اسی حوالے سے کرشن چندر اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

جی، یہ پنڈت سروب کشن جی کے دادا کو زمین کھودتے وقت ملی تھی اس دھرم شالہ کے پاس یہ اور دیگر مورتیاں جو اس کے ساتھ پڑی ہیں، یہیں سے ملی تھیں جب وہ یہاں اس کھیت میں'' اس کے دھرم شالہ سے ملحق کھیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، 'مینڈھ کو چوڑا کرنے کے لیے زمین کھود رہے تھے، ان کی کدالی کسی سخت چیز سے ٹکرائی اور زمین سے لہو کی دھار بہہ نکلی، وہ کانپ گئے اور آہستہ سے مٹی پرے ہٹانے لگے جب انہوں نے مٹی پرے کی تو انہیں اس دیوی کا سر نظر آیا خون میں لت پت تھا۔۲۲

لیکن شیام نے اس پجاری کا جواب سننے کے بعد کہا اس کا سر تو پتھر کا ہے اور حیران بھی ہوا تو پھر خون کیسے؟

اور پھر وہ وہی بات دھراتا کہ یہ تو دیوی کا سر تھا اور سروب کشن کے دادا سے انجانے میں خون ہوا تھا۔ بہر حال وہ زمین کھودنے لگے تا کہ اس کے دھڑ کو بھی نکالا جائے لیکن وہ اسے تلاش نہ کر سکے۔ اس سے ان کی عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ لیکن اس دوران انہیں بہت ساری اور چیزیں اور کافی مورتیاں ملیں۔ پجاری جب شیام کے سوال کا جواب نہ دے سکا تو بولا جب دیوی کا دھڑ نہ ملا۔

عام کشمیریوں میں اب توہمات عام ہیں جب بھی کچھ ہو جائے تو فوراً یہ کہا جاتا ہے کسی نے جادو کر دیا ہے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ پھر ایک پیر کے پاس تو کبھی دوسرے کے پاس کیونکہ ان کا یہ عقیدہ بن چکا ہے کہ دیوی اور مورتیوں کی پوجا یا پیروں کے آگے ماتھا ٹیکنے سے مسئلے کا حل نکل آتا ہے اسی حوالے سے تحسین جعفری کشمیری اپنی کتاب کشمیر لوگ روایات کے آئینے میں میں ایک جگہ توہمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عام کشمیری جن میں ان پڑھ لوگوں اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہے مختلف قسم کی توہمات میں مبتلا رہتے ہیں۔ بلکہ عورتیں تو زیادہ ہی اس مرض کا شکار ہیں۔ کوئی تکلیف ہو، بیماری یا پریشانی ہو، اسے کسی نہ کسی ان دیکھی بلا کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ کسی نے جادو کر دیا۔ کسی کی نظر لگ گئی، بھوت پریت کا سایہ پڑ گیا۔ یہی توہمات ان کی زندگی کا بڑا روگ بن جاتے ہیں۔۲۳

کرشن چندر کے بیشتر کردار دھرم کے نام پر دھندا چلاتے ہیں جو عملی لحاظ سے انتہائی گرے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے مذہب کی تعلیمات کو کبھی چھوا تک نہیں وہی مذہب کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں۔ کرشن چندر ایسے لوگوں سے بڑی سختی سے پیش آتے ہیں۔ پنڈت کی بیوی درگا کے بارے میں وہ کچھ یوں لکھتے ہیں:۔

درگا کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کی نفرت، بدصورتی اور کراہت کا احساس ہوتا تھا۔ درگا کی چھوٹی چھوٹی

آنکھوں اور پتلے لبوں پر ہر وقت ایک نہ بجھنے والی ہوس کی چمک موجود رہتی تھی۔ یہ چمک دیکھنے والے کو پہلی نگاہ ہی میں اُس سے متنفر کر دیتی تھی۔[۲۴]

یہاں جب کوئی شادی ہونے لگتی تو اس کے لیے اور کچھ ہو نہ ہو ہارمونیم اور پیتل کے بینڈ باجے ضرور ہوتے تھے۔ کیونکہ یہ ان کا رواج تھا اور وہ اس رواج کو ہر صورت پورا کرتے تھے۔ لیکن شیام کو اس سے بہت زیادہ نفرت تھی البتہ وہ ہارمونیم سے زیادہ تنگ نہیں ہوتا تھا۔ اس حوالے سے کرشن چندر اپنے ناول میں ایک اور جگہ بینڈ باجے کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ان کی شادیوں کے لیے کتنا ضروری سمجھا جاتا ہے:

ہر بیاہ میں پیتل کا بینڈ باجا ضرور ہوگا۔ چاہے لڑکے کا باپ اس بیاہ میں شامل ہو یا نہ ہو۔ چاہے سارے باراتی شادی میں شامل ہونے سے انکار کر دیں۔ لیکن یہ پیتل کا بینڈ ضرور شامل ہوگا۔ دولہا آنکھ سے کانا، ٹانگ سے لنجا ہو۔ لیکن بینڈ ضرور گائے گا۔[۲۵]

پنڈت سروب کشن گاؤں کی پر امن اور خوشحال زندگی کو تخریب کی جانب موڑنے کا فریضہ یوں سرانجام دیتا ہے کہ گاؤں کے ''بڑوں'' کو بلا کر ان کے ذہنوں میں قابل نفرت بھاشن بھرتا ہے:۔

پنڈت سروب کشن گرج کر بولے۔ آپ کے سامنے آپ کا دھرم ڈبویا جا رہا ہے اور آپ کو شرم نہیں آتی۔ وہ بدمعاش چندرا جسے آپ نے اور ساری برادری نے اُس کی ماں کے ساتھ اُسے باہر نکال دیا ہے۔ آج پھر اسی گاؤں میں آ کر ایک راجپوت کا جنم بھرشٹ کر رہی ہے۔ کیا آپ لوگوں کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ ایک راجپوت گھرانے کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ اور آپ لوگ اس طرح آنکھیں بند کیئے بیٹھے ہیں۔ وہ مسلمان ڈاکٹر بھی اس اچھوت کی طرفداری کر رہا ہے۔ آپ لوگ یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور چپ سادھے بیٹھے ہیں۔[۲۶]

اس طرح پنڈت ایک تیر سے کئی شکار کرتا ہے۔ ذات پات اور فرقہ واریت کو بڑھاوا دینے کیلئے بہت کچھ کرتا ہے:

پنڈت جی بولے میں آپ کو ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے خلاف تو ایک رجسٹری اسی وقت حکام اعلیٰ کی خدمت میں دینی چاہیے، باقی رہی چندرا، تو اس کے متعلق بھی میں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے۔[۲۷]

ایک طرف پنڈت لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنے، فیصلے صادر کروانے اور جذبات کا مذاق اڑانے کی ترکیبوں میں

لگا ہوا تھا اور دوسری طرف اس کی بیوی اپنے کرموں کے حساب سے اس پر سبقت لے چکی تھی۔

پنڈت سروب کشن اپنے بیٹے درگا داس کے لیے ونتی کا ہاتھ مانگتے ہوئے اس کے ماموں سے بات کرتا ہے۔ لیکن یہ سارا معاملہ ہوز بردستی رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ ونتی نہیں چاہتی کہ اس کی شادی درگا داس سے ہو۔ پنڈت اور ونتی کے ماموں روشن کے بیچ یہ سودا بارہ سو روپے میں طے ہو جاتا ہے۔ ونتی کا سرپرست یعنی روشن، ونتی کی ماں کو کسی دوسرے شہر بھیج کر یا پھر تشدد کر کے اس کے بیاہ کی ذمہ داری اٹھاتا ہے:۔

> دو طمانچے کھا کر سیدھی ہو جائے گی۔ بیاہ کے وقت اسے ایک الگ کوٹھڑی میں بند کر دوں گا عورت ذات کا کیا ہے۔ اور پھر ونتی؟ ونتی بچی ہے بے چاری لڑکی میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ میرے سامنے چوں بھی کرے وہ تو میرے سایہ سے بھی ڈرتی ہے۔ روشن نے فخریہ لہجے میں کہا۔[۲۸]

لیکن اس وقت اس المیے کی انتہا نہیں رہتی جب پنڈت کے بیٹے درگا داس کی شادی میں پنڈت کی دلچسپی کا راز کھل جاتا ہے:۔

> پنڈت جی نے اُس (روشن) کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کوئی چنتا نہ کرو بیٹا۔ مجھے بھی اپنی بہو تم سے کم عزیز نہ ہوگی اسے یہاں ہر طرح کا عیش آرام ہوگا۔ اس علاقے کی وہ رانی ہوگی اور پنڈت جی کے چہرے پر اس وقت ایک حریصانہ نگاہ چمک رہی تھی جسے اگر روشن بھی دیکھتا تو خوف سے کانپ اٹھتا لیکن روشن کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔[۲۹]

تمام مذاہب کی تعلیمات نے ہمیشہ پیار و محبت، انسانیت اور تہذیب نفس دیا ہے۔ اور انسان کو رواداری کے ساتھ ایک ہمہ گیر حقیقت سے روشناس کروایا ہے۔ انسان نے اپنی مرضی سے حقیقت کی تلاش اور جستجو کے لیے مختلف راستے چنے۔ ہندوستان کی سرزمین اس کے لیے ساز گار رہی ہے۔ اس بات کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی ادیبوں نے اپنی تخلیقات کی بنیاد محبت پر رکھی لیکن کرشن چندر نے اس مسئلے کو بہت آسان نہیں لیا انہوں نے مذہبی اداروں کا محاکمہ کرتے وقت بھی اپنے کرداروں کے اعمال کو پیش نظر رکھا۔ مندر اور مندر سے جڑی نفسیات اور دھرم سیوا کرنے والوں کو کس طرح پیش کرتا ہے۔ محمد اویس قرنی اپنی کتاب میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

> جس دن وہ کوئی اچھی خاصی جیب کاٹ لیتا یا باہر دی داس کے دیول پر ضرور چڑھاوا چڑھاتا تھا اور ہر وقت اس کی جیب کتروں پر نظر ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں میں نے ایسے ایسے چور اور جیب کترے بھی دیکھے ہیں جو لاکھوں اور کروڑوں کا گول مال کرنے کے بعد ایک نیا مندر تک بنوا

ڈالتے ہیں کلاس وہی ہے بس درجے کا فرق ہے۔[۳۰]

شیام کہتا ہے کہ ہندوستان کے بیشتر لوگ اپنی عورتوں کو گھوڑی کا لقب دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی عورتوں کے لیے بھی وہی زیور بنواتے جو وہ اپنی گھوڑیوں اور بھینسوں کے گلے میں ڈالتے تھے اور شادی کے لیے بھی انہیں اس طرح بیچتے تھے جیسے گھوڑیاں اور بھینسیں بیچی جاتی ہیں۔لیکن اسی دوران شیام کو خیال آیا کہ یہ سارا کچھ تو اس کے طبقے اور اس کے اوپر کے طبقوں میں بھی ہوتا ہے۔ گو تمام طبقوں میں عورت کی حالت بہت بری تھی لیکن کسانوں اور مزدوروں کے طبقوں میں اس کی حالت قدر بہتر تھی کیونکہ یہاں عورت مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے۔ ہل چلاتی ہے۔نالائی کرتی ہے۔ ریوڑ چرانا، جنگل سے لکڑیاں لے کے آنا، فصلیں کاٹنا، کھیتوں کو پانی دینا اور گھر کا کام کاج کرتی ہے۔اور اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ اپنے مردوں سے زیادہ کام کرتی ہے۔شیام کہتا ہے کہ یہاں میں نے وہ سب کچھ دیکھا جو میں نے کسی اور جگہ نہیں دیکھا۔مختلف لوگوں کے اپنے رواج تھے۔ جاگیردار اپنے کام عام لوگوں سے کرواتا تھا اور انہیں اجرت بہت کم دیتا تھا اور وہ اتنی سختی کرتا تھا کہ اُس کے لیے ہر چیز مہیا ہونی چاہیے جس کے لیے پولیس بھی اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اسی حوالے کرشن چندر ایک جگہ لکھتے ہیں:

> پولیس والے گاؤں کے گاؤں باندھ لاتے تھے۔ جو سامنے آیا لاٹھی سے آگے دھکیل لاتے۔اس طرح شکار ہوتا تھا۔سینکڑوں آدمی ہنکیئے بنے ہوئے تھے۔ جاگیردار صاحب کے لیے مچانیں بنائی جا رہی ہیں انکے عملے کے لیے دودھ، مکھن، مُرغیاں، انڈے، عورتیں، شراب ہر چیز باافراط مُہیا کی جاتی تھی تب جا کے شکار ہوتا تھا۔[۳۱]

شادی بیاہ کی رسمیں کشمیر اور ہندوستان میں کیا پوری دنیا میں بسنے والوں کی اپنی ہیں ہر کوئی اپنے رواج کے مطابق شادی کی تقریبات سجاتا ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے دائروں میں رہ کر شادی بیاہ کرتا ہے۔لیکن یہ ضرور دیکھا جاتا تھا کہ حسب ونسب کیسا ہے۔ امیر ہے یا غریب، اونچی ذات سے ہے یا نیچی ذات سے، مسلم ہے یا غیر مسلم۔ دنیا میں بہت سارے ملکوں میں شادیاں کورٹ شپ کے ذریعے ہوتی ہیں۔ اور بہت سارے ملکوں میں جماعتی دائروں کے اندر رہ کر یعنی اس میں خاندان کی مرضی شامل ہوتی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ مغرب میں کورٹ شپ شادی سے پہلے شروع ہوتی ہے۔ یہاں شادی کے بعد۔مسلمان گھرانے کوشش کرتے ہیں کہ وہ خاندانی شادی کو ترجیح دیں۔ جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے:

> مسلمانوں میں یہ رسم ہے کہ ہم اپنے ہی خاندان میں شادی کر لیتے ہیں۔اس کا سب سے بڑا فائدہ

یہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے مزاج سے پہلے ہی واقف ہوتے ہیں۔ خاندانی پیار کی وجہ سے صلح و آشتی کا رجحان پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ زندگی آرام سے گزر جاتی ہے۔[۳۲]

لیکن اس کے برعکس ایک اور جگہ کرشن چندر لکھتے ہیں کہ:

موہن سنگھ کو لیجئے۔ راجپوت ہے، خوبصورت ہے، اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ صاحب جائیداد ہے۔ لیکن دیکھئے اپنی زندگی اپنے ہاتھوں تباہ کر رہا ہے۔ اس اچھوت لڑکی سے عشق لڑا رہا ہے۔ جسے ساری برادری نے خارج کر دیا ہے۔ کیا اس کا نتیجہ اچھا نکل سکتا ہے۔ شیام صاحب سماج بڑی بھاری طاقت ہے۔ سماج انسان کی اجتماعی عقل، اجتماعی قوت کا دوسرا نام ہے۔ سماج سے انحراف کی صورت اچھا نہیں ہوسکتا۔[۳۳]

سینکڑوں برسوں کے آزمائے ہوئے رسم و رواج دو چار کتابوں نظریوں سے نہیں جھٹلائے جاسکتے۔ نائب تحصیلدار نے شیام سے کہا تمہارے ذہن میں شاید مغربی کورٹ شپ کی دلفریبیاں گھوم رہی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مغرب میں بھی شادی اسی طرح ہی ہوتی ہے جیسے یہاں یہ کوئی حیرانی والی بات نہیں ہے۔ وہاں بھی گھر خاندان، ذات پات اس طرح دیکھی جاتی ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ لارڈ کا لڑکا کسی مزدور کی لڑکی سے شادی کرے۔ ایک دفعہ میری ملاقات امریکن پادری سے ہوئی تو وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ شادی کے وقت حسب ونسب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر شخص خاندان کو دیکھ کے اور اپنی مرضی سے شادی کرتا ہے۔

کشمیر لوگ روایات کے آئینے میں شادیکے کے حوالے سے تحسین جعفری کاشمیری کچھ یوں لکھتے ہیں:

پہلا مسئلہ موزوں رشتے کی تلاش ہے۔ جس کے لیے فریقین کو کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ جب کسی جگہ رشتہ طے ہو جائے تو لڑکے والے خاندان کی معزز خواتین لڑکی والوں کے ہاں مٹھائی وغیرہ اور لڑکی کے لیے انگوٹھی اور کپڑوں کا جوڑا لے کر جاتے ہیں۔ اس رسم کا نام ''نشانی'' ہے۔ اس رسم کے بعد دونوں خاندان ایک مضبوط رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی خوشی، غمی، دکھ، سکھ ہر چیز میں شامل ہوتے ہیں۔[۳۴]

یہاں پر بسنے والے لوگوں کے رواج میں شامل ہے کہ یہ شادی بیاہ پر تو ڈھول کوٹتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی بھی خوشی ہو یا فصل کی کٹائی کا آغاز ہو ڈھول اور باجے بجائے جاتے ہیں۔ تاکہ لوگ بڑی تیزی کے ساتھ اپنے کام کو مکمل کریں کیونکہ ڈھول کے بجنے سے لوگ جذبات میں آجاتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک تھکاوٹ کا اثر ختم ہو جاتا

ہے۔بعض جگہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ یہ اپنی درانتی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور کسی حد تک اُسے تہذیب کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ اسی حوالے سے شکست میں کچھ یوں لکھا ہے:۔

> شاباش میرے بیٹے۔ درانتی چلائی جا، یہ تیری تہذیب کی بنیاد ہے ترے مذہب کی خالق ہے، ترے جسم کی روح ہے۔ اسی سے تیزی مسرتوں اور شادمانیوں کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اسی سے تیرے ادب کو رفعت اور تیرے فلسفے کو برتری حاصل ہوتی ہے۔اسی سے تیری قوم کی آزادی اور تری عورتوں کی عصمت محفوظ ہوتی ہے۔۳۵

شادی بیاہ کے موقع پر مختلف قسم کے گیت پڑھے جاتے ہیں۔ یہ گیت عمر کا ہر فرد گا سکتا ہے۔ پڑھ بھی سکتا ہے۔ لیکن عام طور پر یہ گیت لڑکیاں گاتی ہیں۔لڑکے،نوجوان اور بوڑھے ان کے گیت سنتے ہیں۔

برات کے روانہ ہونے پر دولہا کے سر پر پیسے اور چھہارے وغیرہ نچھاور کیے جاتے ۔ روانگی کے وقت عورتیں دولہا کو دعائیں دے کر رخصت کرتی ہیں۔ اور دعائیہ گیت گاتی ہیں۔ اسی طرح جب برات دلہن کے گھر کے قریب پہنچتی ہے تو وہاں بھی خواتین اکھٹے ہو کر استقبالیہ گیت گاتی ہیں۔ ان کی رسوم میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ دولہا اور دلہن کو پہلو بہ پہلو بٹھاتے ہیں۔ دونوں کے سروں پر قرآن پھیرتے ہیں۔ دونوں کو شربت پلاتے ہیں۔ اور شیشے میں دونوں کو منہ بھی دکھاتے ہیں۔لیکن اس دوران گیتوں کا سلسلہ شروع رہتا ہے۔

د عزیز احمد کا تعارف

عزیز احمد جو کہ ۱۱رنومبر ۱۹۱۴ء اتر پردیش میں پیدا ہوئے جو ان دنوں برطانیہ کے زیر قبضہ تھا اور ۱۶ردسمبر ۱۹۷۸ء کو کینڈا میں وفات پائی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ سے ایف اے کیا اور پھر ۱۹۳۴ء میں اعلیٰ نمبروں کے ساتھ بی اے (آنرز) کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۳۵ء انگلستان چلے گئے اور پھر واپس آ کر ۱۹۴۶ء میں ایک بار پھر جامعہ عثمانیہ کو رونق بخشی۔ ۱۹۴۹ء تک درس و تدریس میں مشغول رہے اور پھر پاکستان آ گئے۔ پاکستان آنے کے بعد مختلف اداروں میں ذمہ داریاں ادا کیں۔

عزیز احمد کئی زبانیں جانتے تھے جن میں سے اردو، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی پر انہیں عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ترکی، اطالوی اور جرمن زبانوں میں بھی گفتگو کر لیتے تھے۔عزیز احمد کی پہلی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے چھپی۔

عزیز احمد ایک قابل ذکر افسانہ نگار تھے البتہ انہیں زندگی میں تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے دو مختصر کہانی مجموعے

''رقص ناتمام'' اور ''بیکار دن اور بیکار راتیں'' سگمنڈ فرائیڈ اور ڈاتج لارنس کے گہرے مطالعے کا نتیجہ تھا۔

عزیز احمد کے وہ ناول جو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں پاکستان بننے سے پہلے حیدرآباد دکن میں لکھے گے ان میں جاگیرداری نظام، سماجی ناہمواری اور طبقاتی درجہ بندی کی کڑی تنقید ملتی ہے۔ انکے عظیم اردو ناولوں میں سے گریز، ایسی بلندی ایسی پستی، آگ، ہوس اور شبنم سرفہرست ہیں۔ ان ناولوں میں سے ''آگ'' جو کہ ۱۹۴۶ء میں چھپا عزیز احمد اس میں ۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک کے کشمیری معاشرے کی حقیقت پسندانہ تصویر پیش کی ہے۔ جو کہ تین نسلوں پر محیط ہے۔ ایسی بلندی ایسی پستی میں انہوں نے جاگیرداروں اور نوابوں کی معاشرت پر مبنی ایک داستان سنائی ہے جس میں جنیات، عصری شعور، فرسودہ رسوم، انسانی نفسیات وغیرہ کو بڑی خوش اسلوبی سے کہا گیا ہے۔

انسانی نفسیات اور داخلی احساسات کو پیش کرتے ہیں ''عزیز احمد'' کو کافی مہارت حاصل ہے۔ قاری ان تمام چیزوں کو ان کے ناولوں میں محسوس کرسکتا ہے۔ البتہ ''ہوس'' اور ''مرمر اور خون'' میں ان کا عصری شعور پوری طرح اجاگر نہیں ہوتا۔ فن کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ''گریز'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں نفسیات کے حوالے سے فرائیڈ کے نظریات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کا تصادم، متوسط طبقے کی نفسیات پیچیدگیوں اور جنسی رویوں کو کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔

ایک نقاد کی حیثیت سے عزیز احمد کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' بہت ہی اہمیت کی حامل کتاب ہے اور اسے ایک مستند کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ عزیز احمد مختلف کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے بھی ایک نام رکھتے ہیں۔ ان ترجموں میں دانتے، شیکسپیئر، ہیرلڈ لیمب، گارچن دی طاسی اور ارسطو کی کتابیں شامل ہیں۔ عزیز احمد نے اپنے ناول ''شبنم'' میں ارشد علی خان اور شبنم کے مابین خطوط میں دو عاشقوں کے دلی جذبات کی داستان پیش کی ہے۔ انہیں کرداروں کی نفسیات کا پورا اندازہ ہوتا ہے اور پھر وہ انہیں کی مناسبت سے جذبات پیش کرتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناولوں میں مکالمے بہت کم پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ مکالموں کے ذریعے کرداروں کی تعمیر میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن جہاں جہاں مکالمے پیش کیے ہیں۔ وہاں کرداروں کو مدنظر رکھا ہے۔

عزیز احمد کے ناولوں میں اپنے عہد کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔ لوگوں کا رہن سہن، لباس، رسوم و عقائد، شادی بیاہ، علمی و ادبی محفلوں کی نشست و برخاست ان سب باتوں کے نمونے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ناولوں کا اسلوب بیانیہ اختیار کیا گیا ہے وہ واقعات جذبات اور نفسیاتی کیفیتوں کو ان کے حقیقی رنگ میں بیان کرتے ہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے اردو میں کوئی ناول نہیں دیکھا البتہ انہوں نے اپنے آپ کو انگریزی ادب اور اسلامیات کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے انگریزی میں ان کی شاہکار کتابیں شائع ہو

چکی ہیں۔ اور ان کے بعض ناولوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ بہر حال عزیز احمد نے اردو میں جتنے بھی ناول لکھے وہ اردو ناول کی تاریخ میں ہمیشہ موضوعات خصوصیات کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔ اور جب بھی اردو ادب یا اردو ناول کی تاریخ لکھی جائے گی عزیز احمد کا نام نمایاں نظر آئے گا۔

ہ ناول آگ کا تعارف

آگ ۱۹۴۶ء میں شائع ہونے والا بہترین ناول ہے اس میں کشمیر کی شہری زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ناول بیسویں صدی کی ابتداء سے لے کر قیام پاکستان تک کے زمانے پر محیط ہے۔ اس ناول میں کوئی ہیرو نہیں ہے بلکہ ملک کی اہم سیاسی تحریکات، مختلف سیاسی پارٹیوں کی جدوجہد اور طریقہ کار کو پیش کیا گیا ہے۔ عزیز احمد اس ناول میں حقیقت سے کام لیتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہاں تاجروں و سرمایہ داروں کا ایک سلسلہ ہے۔ جو کشمیری مزدوروں اور ان کی عورتوں کے استحصال و لوٹ کھسوٹ پر قائم ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کشمیر کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جہاں کا حسن غربت، بے بسی، بھوک اور جاگیردارانہ نظام کی نذر ہو گیا ہے۔ ''آگ'' ایک ایسا ناول ہے جس میں کشمیر کی زندگی تمام تر مسائل اور مشکلات کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس میں کشمیری عوام کی حقیقی تصویر ایسے انداز سے پیش کی گئی ہے کہ امراء، سرمایہ دار، سیاست دان اور تاجر طبقے سے لے کر غریب و مزدور طبقے تک ہر ایک کی زندگی واضح نظر آتی ہے۔

بنیادی طور پر یہ ایک ایسا ناول ہے جو کشمیر کی زندگی کے موضوع پر لکھا گیا ہے اس میں بہت ساری سیاسی تبدیلیوں بالخصوص برصغیر پر اس کے اثرات کو واضح دکھایا گیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کشمیر کے حالات کو دیکھ کر سارے ہندوستان میں سیاسی بیداری اور آزادی کی جدوجہد پھیلتی جا رہی ہو۔ دوسری جنگ عظیم کے ہندوستان پر اثرات، کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات، ہندوستان کو آزاد کرنے کی خواہش اور اس لیے جدوجہد، سیاسی شورشیں، ہنگامے اور کشمیر میں پھیلتی بے چینی کو عزیز احمد نے بہترین انداز سے ناول میں بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عزیز احمد کی منظر نگاری، حقیقت پسندی اور بہترین موضوع کی وجہ سے ''آگ'' کو اردو کے اہم ناول کا مقام حاصل ہے۔

ر آگ کا موضوعاتی مطالعہ بحوالہ تہذیب و ثقافت:

آگ کا پس منظر بظاہر کشمیر کی زندگی ہے لیکن کشمیر کے حوالے سے اس میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تحریک پاکستان جس انداز میں کشمیر پر اثر انداز ہو رہی تھی اس کی ایک جھلک بھی آگ میں نظر آتی ہے۔

کشمیر کی تاریخ اور تہذیب ہی آگ کا اصل موضوع ہے۔ اس ناول کا مرکز و محور کشمیری مسلمان ہیں۔ نقادوں کی

بہت بڑی تعداد نے اس ناول کو غلامی میں سلگتے اور آزادی کی جدوجہد میں اُبلتے کشمیر کا ترجمان قرار دیا ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ خود مصنف کو اپنے ناول میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ بلکہ وہ اس بات پر افسردہ ہیں کہ وہ بھرپور انداز میں کشمیر کی داخلی کیفیات کا اظہار نہیں کر سکے اور جو کچھ انہوں نے کشمیری مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے وہ بڑا 'خارجی' سا ہو گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

'آگ' سے میں مطمئن نہیں ہو۔ کشمیر کی وادی کے مسلمانوں کی زندگی کو میں نے باہر سے دیکھا ہے اگرچہ ان سے ملنے جلنے، ان کے شادی وغم میں شریک ہونے، ان کے ساتھ لیل ونہار گزارنے کے مجھے بہت مواقع ملے ہیں لیکن میرے خیال میں وادی کشمیر کو جدید اُردو ادب میں بہت غلط پیش کیا گیا ہے۔ ''شکست'' کے کرداروں کی زندگی، ان کا لباس ان کے خیالات، ان کی زبان ممکن ہے پونچھ کے رہنے والوں کے ہوں لیکن نہ کرشن چندر اور نہ راما نند ساگر (حالانکہ وہ پکے کشمیری ہیں) کے کسی افسانے میں کشمیری مسلمانوں کے اصلی خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں تو معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں ہزاروں نوراں، نورنیشاں قسم کی کشمیری لڑکیاں محض اس انتظار میں جہلم کے کنارے، پہل گام کی گھاٹی اور پیر پنجال کی چوٹیوں پر کھڑی ہیں کہ کرشن چندر کے افسانوں کے بدمعاش رویے پھینک کے انہیں تاریک کوٹھڑیوں میں لے جائیں یا انہی افسانوں کے ہیرو شبنم سے مُنہ دھو کے برف سے دانت مانجھ کے ان کے لب لعلیں کے بوسے لیں۔

آگ میں کشمیری مسلمان گھرانوں کا بیان بڑا ''خارجی'' سا ہو گیا ہے۔ اور ناول کے ابتدائی حصے میں بیانیہ عنصر قصہ پر بھاری ہو گیا ہے۔ اس کا آخری حصہ بڑی عجلت میں لکھا گیا۔ ناول کا معاہدہ شیخ نذیر احمد مرحوم مالک تاج آفس سے ہوا تھا۔ ہر ہفتہ ان کا تقاضے کا خط آتا کہ ناول کو جلدی مکمل کیجئے۔ آخری حصے میں کرداروں کی خاطر خواہ نشوونما نہ ہو سکی۔ میں سکندر جو کے مرض الموت کو خصوصاً زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا وقت نہیں ملا۔ بہت سے کردار غیر ضروری آ گئے ہیں، نقش ابھر نہ سکے اور یہ بھی عجلت ہی کی وجہ سے۔[۳۶]

آگ میں عصری صورت حال زیادہ شدت سے ظاہر ہوئی ہے۔ گریز میں ہندوستان عصریت بالعموم مغربی تناظر میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن آگ میں ہندوستان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کرشن چندر کے ناول شکست کے بعد آگ دوسرا ناول ہے جس کا پس منظر وادی کشمیر ہے۔ غربت اور سماجی استحصال دونوں ناولوں کا مشترکہ موضوع ہے۔ آگ کے موضوع پر سلیمان اطہر کچھ یوں لکھتے ہیں:۔

گریز کے پس منظر میں اپنے عہد کی سیاست جس قدر بھی ہو آگ میں اس کا تناسب افزوں ہو گیا ہے۔ یہ سیاست مقامی بھی ہے اور عالمی بھی۔ بنیادی طور پر کشمیر، کشمیر کی تہذیبی زندگی بلکہ کشمیری مسلمانوں کی تہذیبی زندگی آگ کا موضوع ہے۔[۳۷]

اس ناول کا زمانہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کا ہے۔ ناول دو حصوں پر ''شنیدہ'' اور ''دیدہ'' پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ ناول کشمیر کی سیاسی، تمدنی، جغرافیائی اور تاریخی زندگی کے تناظر میں ہندوستانی زندگی کی مرقع کشی کرتا ہے۔ ہندوستان کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور معاشی صورت حال میں جو تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ اس کے براہ راست اثرات کشمیر کی زندگی اور سماج پر بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ آگ میں کشمیر کو موضوع بنانے کا خیال ممکن ہے کہ عزیز احمد کو گریز لکھتے ہوئے ہی آ گیا ہو کیونکہ گریز کے آخر میں تقسیم کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ گریز میں بھی ناول نگار نے کشمیر کی سماجی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ کشمیر جسے لوگ جنت نظیر کہتے ہیں آگ میں گھرا ہوا ہے۔ کشمیر اور اس کے عوام کے مقدر میں بھوک، افلاس، استحصال، استبداد، حق تلفی اور عصمت فروشی ہی ہے۔

اپنے ملک کی حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ہم لوگوں سے تو بھیڑ بکریاں، گھوڑے، خچر بھی اچھے ہیں۔ وہ مار کھاتے ہیں تو کبھی کبھی سرکشی بھی کرتے ہیں۔ ہمیں تو کسی چیز کا احساس ہی نہیں۔ یہ بھوک، غربت اور افلاس دیکھ کر خون کھولتا ہے۔

انور سدید مصنف کے بیان کی تردید کرتے ہوئے اس ناول کے ڈانڈے کشمیر میں ڈوگرہ راج کے دوران سلگتی آگ سے جا ملاتے ہیں۔ وہ اسے مہاجنی نظام کو بھسم کر دینے والی آگ دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق یہ ناول اشتراکی تصورات کا حامل ہے لیکن انہیں اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ اس کا سب سے زیادہ بائیکاٹ ترقی پسند نقادوں نے کیا تاہم وہ اس کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکے۔ اس صورت حال کو انور سدید کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

عزیز احمد نے اجتماعی زندگی پر انسانی استحصال کو اپنے ناول آگ میں بڑی خوبی سے موضوع بنایا ہے اور (اُس) آگ کو جو دوسری جنگ عظیم کے دوران ڈوگرہ راج میں کشمیر میں سلگ رہی تھی۔ اسے بڑی فنکاری سے سماجی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ عزیز احمد نے اساسی طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا یہ آگ مہاجنی نظام اور جاگیرداری ماحول کو بھسم کرنے میں معاونت کر سکے گی؟ چنانچہ کشمیر میں اصل لڑائی طبقاتی سطح پر سامنے نہیں آتی بلکہ عزیز احمد نے سرمائے کو انسان کا دشمن قرار دیا۔ وجہ یہ ہے کہ

سرمایہ فرقہ واریت پیدا کرتا ہے اور طبقاتی تضاد کو عمل میں لاتا ہے۔ ناول آگ اشتراکی تصورات کا فکری زوایہ پیش کرتا ہے۔ اس سے ذہن میں شدید کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جرت کی بات یہ ہے کہ ترقی پسند ناقدین نے اس ''ناول'' کا سب سے زیادہ بائیکاٹ کیا ہے اور اس کی انقلابی حقیقت کو پاسنگ کے برابر بھی اہمیت نہیں دی۔ حالانکہ ترقی پسند نظریے کو جس مثبت انداز میں آگ میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثال تو ترقی پسند ناول نگاروں کے ہاں بھی نہیں ملتی۔ ۳۸

ڈاکٹر عقیلہ بشیر نے آگ کو جنسی اور رومانوی پہلو سے دیکھتے ہوئے بعض تلخ حقائق کو چھیڑ دیا ہے جس میں غریب کشمیری شوہر خود اپنی بیویوں کو پیسوں کے عوض بدچلنی پر مجبور کرتے اور کم پیسے لانے پر مار پیٹ کرتے ہیں:۔

کشمیر، کشمیر کی تہذیبی زندگی بلکہ کشمیری مسلمان کی تہذیبی زندگی عزیز احمد کے ناول آگ کا موضوع ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی روح بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے۔ یہاں جھیلوں، سبزہ زاروں اور برف پوش چوٹیوں کا ذکر تو ہوا ہی ہے۔ ساتھ ساتھ کشمیر کے بازاروں میں رواں دواں زندگی اور مکانوں کی کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے خوبصورت چہرے اور نیلی آنکھیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ وادی کشمیر کی دختر کے ساتھ ساتھ بے شمار وہ نسوانی کردار بھی سامنے آتے ہیں۔ جو شہروں اور دوسرے ملکوں سے بغرض سیاحت، کشمیر میں وارد ہوتے ہیں۔ کشمیر اگرچہ مناظر فطرت سے مالا مال ہے مگر یہاں بسنے والے اپنے پیٹ کو بمشکل ایندھن فراہم کر پاتے ہیں۔ جہاں بھوک زیادہ ہو یا پیٹ زیادہ بھرا ہوا ہو وہاں بدکاری آسانی سے پنپتی ہے۔ ۳۹

آگ میں کشمیریوں کی زندگی کے تہذیبی، معاشرتی، سیاسی و سماجی پہلوؤں کو فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عزیز احمد نے اس عرصہ میں ہندوستان اور دنیا کے حالات کو پیش نظر میں رکھا اور ان حالات کے کشمیری زندگی پر اثر انداز ہونے والے اثرات کو بھی پیش کیا ہے، ان میں خاص طور پر ایشیا اور یورپ کے ممالک کے سیاسی حالات، انقلابات اور صنعتی ترقی کا تذکرہ اہم ہے اس طرح عزیز احمد کا یہ ناول ایک تاریخی دستاویز بھی بن جاتا ہے۔ آگ میں عزیز احمد نے کشمیری زندگی کے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے، اور بتایا ہے کہ جنت نظیر کشمیر میں بھی طرح طرح کے مسائل ہیں جن سے لوگ دو چار ہیں۔ اس ناول میں کشمیر کے غریب عوام کے مسائل، بھوک، افلاس، گندگی، بیماریوں کا تذکرہ ہے، اسی کے ساتھ دولت مند سرمایہ داروں کی زندگی کی رونق، ان کی شایان شان زندگی اور دولت کے بل بولتے پر غریب بھولے بھالے عوام پر ان کی ظلم و زیادتی، اور ان کی اخلاق سوز حرکتیں ان سب کا ذکر ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس عہد کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات، جدوجہد آزادی کا ذکر بھی ملتا ہے۔

آگ میں چونکہ کشمیر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس لئے عزیز احمد نے کشمیر کے قدرتی مناظر چنار کے درختوں، جھیلوں، جھیلوں پر تیرتے شکاروں، زعفران کی خوشبو، سیب سے لدے درختوں کی منظر کشی ناول میں جا بجا دلفریب انداز میں کی ہے، یہ مناظر کشمیری زندگی کو سمجھنے اور اجنبیت کے احساسات کو دور کرتے ہیں۔ عزیز احمد موضوع سے متعلق جزئیات کو باریکی سے پیش کرتے ہیں۔ اس ناول میں عزیز احمد کے محبوب موضوع جنسیات کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ حالانکہ تہذیبی و معاشرتی ناول میں اس کی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ لیکن عزیز احمد نے اس موضوع کے متعلق مواد حاصل کر لیا ہے۔ ناول میں فضلی اور زون کے کرداروں کی پیشکشی میں عزیز احمد نے اس موضوع کو برتا ہے کہ ایک مزدور عورت کا مشاہدہ کیسے کیا جاتا ہے۔ دیکھیے مزید وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں: ''اور بارہ مولا میں ایک دیوانی عورت، جوان، بال تیل میں چپڑتے ہوئے کپڑے تار تار اور بایاں سینہ کپڑوں کے شگاف سے جھانکتا ہوا، تیزی سے آنکھیں مٹکاتی گذر جاتی ہے''۔[۴۰]

فنی حیثیت سے عزیز احمد کا ناول آگ ایک کامیاب ناول تصور کیا جاتا ہے، تہذیبی و معاشرتی ناول ہونے کی وجہ سے اس میں قصہ یا کیسانی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے ناول کا پلاٹ پھیلا ہوا ہے۔ عزیز احمد نے یہ ناول ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۲ء کے عہد کو مختص کرتے ہوئے تحریر کیا اور اس عرصے کے تاریخی واقعات کی مدد سے اپنے پلاٹ کو پھیلایا ہے۔ ناول میں پیش کیے جانے والے کردار حقیقی زندگی کے کردار ہیں۔ چنانچہ ان کے ارتقاء میں حقیقت کا عنصر شامل ہے۔ ناول لکھتے ہوئے عزیز احمد نے بیانیہ انداز اختیار کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو بطور واحد متکلم پیش کیا ہے۔ ناول نگاری کی تکنیک کے حوالے سے عزیز احمد کے بڑے بڑے لوگ قائل ہیں۔ ناول آگ میں اہم بات وقت کے بہاؤ کے ساتھ حالات کی پیشکشی ہے۔ ناول کے تینوں کردار غضنفر جو، سکندر جو، انور جو کی زندگی اپنے عہد سے مطابقت رکھتی ہے۔ زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ ڈھلنا عزیز احمد کی تکنیک کی بڑائی ہے، یوسف سرمست کے مطابق: ''آگ میں وقت کا یہ فطری بہاؤ اپنے حقیقی ترین رنگوں میں نمایاں کیا گیا ہے، جو اس ناول کو غیر معمولی اہمیت بخشتا ہے''۔[۴۱]

آگ ایک کشمیری خاندان کی تین نسلوں کی کہانی ہے۔ ناول نگار نسل در نسل استحصال اور استحصالی طبقات کی داستان لکھنا چاہتا ہے۔ اس ناول میں کشمیری زندگی کے وہ تمام نشیب و فراز موضوع بنتے ہیں۔ جو بالعموم تمام برصغیر کے لوگوں کی سماجی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں اس کہانی میں اس عہد کی ہندوستانی سیاست کو بھی موضوع بنایا جاتا ہے۔ اور ہندوستان کی معاشرت اور معیشت کو بھی۔ کیونکہ مصنف کو احساس ہے کہ یہاں کا سماج مسلسل آگ میں جل رہا ہے اور کشمیر جو برصغیر کی خوبصورتی کا استعارہ بھی ہے۔ اس کے آگ میں جلنے سے ناول نگار کی مراد برصغیر کی

خوبصورتی کا سامراج اور اس کے گماشتوں کے ہاتھوں نابود ہونا ہے۔ یہ آگ دراصل نئے سماجی حالات، سیاسی استحصال، اقتصادی کسمپرسی، آزادی کے شعور اور نظام کو بدلنے کی آگ ہے۔ عزیز احمد کا سیاسی شعور ہندوستانی تاریخ میں اس امر سے آگاہ ہے کہ یہاں غلامی اب مزاجوں کا جز بن گئی ہے اور یہ تہہ در تہہ غلامی کشمیر کی زندگی ہی نہیں بلکہ اس عہد کے عام ہندوستانی کی زندگی کو بھی متاثر کر رہی ہے، عزیز احمد نے کشمیر کی زندگی پر سے پردہ اٹھانے کے جس مقصد سے ناول لکھا ہے، اس میں وہ کامیاب رہے ہیں، یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ناول نگار کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی تبدیلی کے پس منظر میں کشمیری زندگی کی تبدیلی کو پیش کرنے کی انتہائی کامیاب کوشش کی ہے۔ نئے حالات کی رو نئے خیالات کی آمد، نئے رجحانات، نئی بیداری، نئی سماجی اور سیاسی تبدیلی کشمیری زندگی میں سراہت کرتی دکھائی گئی ہے۔[۴۲]

ناول آگ میں کشمیر کی حقیقی اور واضح تصویر جس طرح عزیز احمد نے پیش کیا ہے۔ اس طرح شاید کسی اور ناول نگار نے پیش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ عزیز احمد نے اس ناول میں کشمیری عوام، کشمیر کے قدرتی مناظر، جھیلیں، ہاؤس بوٹیں، شکاریوں کے شکار، کشمیری مزدور غریب عوام کی محنت کش زندگی کی حقیقی تصویر کو پیش کیا ہے۔ جب یہ تمام چیزیں سامنے آتی ہیں تو ساتھ ہی کشمیر کی وادی کے قدرتی حسن کا احساس اور جنت نشان کشمیر، شعراء اور ادیبوں کے خوابوں کی جنت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یہ احساس عام طور پر باہر رہنے والے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں کشمیر کے اس دلفریب حسن کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام کی وہ زندگی بھی ہے۔ جو انتہائی مشکل حالات کی وجہ سے پریشانیوں اور مصائب میں گھری ہوئی ہے۔ اور یہ کشمیری عوام ہی زیادہ محسوس کر سکتے ہیں۔ اسی حوالے سے یوسف سرمست کچھ یوں لکھتے ہیں: ''کشمیر یہاں جنت نشاں ہی نہیں جہنم زار بھی ہے''[۴۳]

عزیز احمد نے آگ میں کشمیری زندگی سے اس طرح پردہ اٹھایا ہے کہ تمام چیزوں کو واضح کر دیا ہے۔ کہ کشمیری اس جنت نظیر کشمیر میں زندگی کے کن کن مسائل سے دوچار ہیں۔ اس ناول میں کشمیر کے غریب عوام کے مسائل، بھوک، افلاس، گندگی، بیماریوں کا تذکرہ ہے۔ اسی کے ساتھ دولت مند سرمایہ داروں کی زندگی کی رونق، ان کی شایان شان زندگی اور دولت کے بل بوتے پر غریب بھولے بھالے عوام پر ان کی ظلم و زیادتی، ان کی اخلاق سوز حرکتیں ان سب کا ذکر ہے۔ اسی کے ساتھ اس عہد کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات اور جدوجہد آزادی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ عزیز احمد کشمیر کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ لداخ کی وادی ایک ایسی وادی ہے جہاں بارشیں بہت کم ہوتی ہیں لیکن برف بہت زیادہ، یہاں ہزاروں فٹ بلند پہاڑی چوٹیاں ہیں جو برف سے ہر وقت ڈھکی رہتی ہیں۔ یہاں پر

اتنی شدید سردی ہوتی ہے جس کے بارے میں ولی محمد اسیر کشتواڑی شیرازہ میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ''کہ لداخ کی سردی تو سبوں پر عیاں ہے۔ کبھی کبھی سخت سردی کی وجہ سے ڈربے میں مُرغ مرغیاں اور گاؤخانے میں گائیں مری ہوئی ملی ہیں۔[۴۴]

لداخ کی بلندو بالا چوٹیوں میں سے ایک چوٹی زوجی لاء کے نام سے مشہور ہے۔ عزیز احمد اپنے ناول میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کی بلندی گیارہ ہزار پانچ سو اٹھہتر فٹ ہے۔ جب وہ اس تک پہنچے تو رات کے اندھیرے میں ہوا مٹھیوں میں برف بھر بھر کے پھینک رہی تھی۔ ٹٹوؤں کی ٹاپوں کے نیچے برف پگھل چکی تھی اور ٹٹو والے گھاس کے جوتے پہنے، پوستین سینے سے لگائے پکار اٹھتے۔ ہوشا، ہوشا، خبردار، خبردار۔

عزیز احمد لداخ کی سردی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سروے آف انڈیا والے بنگالی بابو کی روح جس کو لداخ کی سرد ہوا کی انگلیاں منجمد کر چکی تھیں اور زیادہ مفلوج ہوگئیں۔ اس نے مایوسی کی حالت میں گہری ہوتی ہوئی دھند اور برستی ہوئی برف کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتھ سے پوچھا:
>
> کیا یہ برف باری سونا مرگ تک رہے گی۔[۴۵]

ہمالہ کا درہ جہاں سے ہزاروں سال پہلے بدھ مت کے متوالے ہندوستان کا سفر کرنے کے بعد گزرے تھے اور اپنے وطن کا رخ کیا تھا دراصل یہ وہی درہ تھا جو کشمیر کی حسین وادی کو لدرخ کے سرد بلند میدانوں اور پہاڑوں سے جدا کرتا ہے۔ اس کی ایک طرف ستواں ناک رکھنے والے سفیدی مائل گندمی رنگ کے لوگ تھے اور دوسری طرف چپٹی ناک والے منگولی وضع کے تبتی۔ یہ پہاڑ دراصل دو جغرافیائی اکائیوں، دو نسلوں اور دو طرح کی انسانی غلاظتوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ لیکن یہ وہ درہ ہے جس سے ہزاروں سال پہلے بھی انسان آتے جاتے تھے۔ یہی وہ راستہ ہے جس راستے سے انسان آئے، مہاجنی نظام آیا، سامراج آیا، قالین آئے، نمدے آئے، مذاہب آئے، تعصّبات آئے یہاں تک کہ وہ سب کچھ آیا جو انسان کے ساتھ آ سکتا ہے۔ مختلف جنگوں کے قافلے بھی گزرے اور تجارتی قافلے بھی۔ لیکن یہاں جو عجیب رسم دیکھنے کو ملی جسے آج کا انسان پڑھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

> لداخی جن کے یہاں ہر بڑے بھائی کی بیوی، اس سے دو چھوٹے بھائیوں کی یعنی اپنے دو چھوٹے دیوروں کی بھی بیوی ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ''افزائش نکاح'' اس کی اپنی خوشی یا ناخوشی پر منحصر ہے۔ یہ لداخی تبت مارکہ کے بدھ مت کے قائل ہیں ''گن پا'' جوان کی خانقاہیں ہیں۔ ان میں لاکھوں کا

سونا ہے۔ ہر خاندان کسی نہ کسی ''گن پا'' کو اپنا ایک لڑکا اور ایک لڑکی سپرد کرتا ہے۔ لڑکے بڑے ہو کے لاما اور لڑکیاں مو کہلاتی ہیں اور سب لاسا کے لامائے اعظم کی منعقد ہوتی ہیں۔ یہ لوگ نہاتے نہیں، کیونکہ لداخ میں پانی کمیاب ہے۔[۴۶]

پنجاب میں جب سکھوں کی اجارا داری تھی اس وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو جموں کا راجہ بنایا۔ گلاب سنگھ نے کشمیر پہلے پٹھانوں سے فتح کیا۔ پھر انگریزوں سے خریدا۔ اسی حوالے سے عزیز احمد لکھتے ہیں کہ: ''وہ انسان کیا جو بھیڑوں کی طرح چراگاہوں کے ساتھ نہ خریدے جاسکیں۔۔۔''[۴۷]

زوجی لاء نے بجلی کی کڑک سنتے ہی اپنا عصا ندی میں پھینکا جب برف کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ یہ برف کی چٹانیں تھوڑی سی آواز کے بعد خاموش ہوگئیں اور بلتستان اور کشمیر والے ٹٹوؤں کا نعرہ ''اللھم احفظنا، اللھم احفظنا'' ایک دم مدھم پڑ گیا۔

انہی دنوں سکھوں نے لڑائی کے بعد لداخیوں کو شکست دی اور ان کی آزادی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ آبادی کے زیادہ نہ بڑھنے کے حوالے سے عزیز احمد اپنے ناول میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:۔

> بھاؤ جیں اپنے چھوٹے دیوروں سے شادی کر لیتی ہیں اور اس طرح آبادی میں اضافہ نہیں ہونے دیتیں، تاکہ لیسہہ کے بازاروں میں جہاں وسط ایشیاء کے ہر حصے سے کسی نہ کسی طرح کی جنس آتی ہے۔ اور شیوک اور نوبراندیوں کے کئی میل لمبے پاٹوں کو طے کرنے والے راستوں پر غلاموں کی افراط نہ ہو۔[۴۸]

بلتستان میں بسنے والے لوگ سُرخ اور بہت ہی خوبصورت ہیں اور خوبصورت نفیس وردی نما لمبے لبادے پہنے ان میں سے بعض کمر بند بھی پہنتے تھے۔ ان کے لباس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ترکمانوں کی اولاد ہیں۔ یہاں پر ایک خوبصورت ندی اور خوبصورت جھیل بھی ہے۔ قراقرم کے اس پار ان کے رشتہ دار رہتے ہیں۔ ان کی خواتین کو سکردو کے بلتی لوگ اپنے دیوروں کو شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ایک ایک مرد ایک وقت میں کئی کئی عورتوں سے نکاح اور متعہ کرتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ان کا شیعہ یا نوربخشی مسلمان ہونا ہے اور چونکہ ان کے سب بھائی بند، درد، تاجک، ترکمان، قارق، یارقندی، اور مچھ والے سب غلام ہی ہیں۔ اور یہ غلاموں کی آبادی میں اضافے کو بُرا نہیں سمجھتے۔ ان کے معاشرے میں جو باہر سے افسر آتے تھے وہ بھی کسی نہ کسی عورت سے متعہ کرنے میں عار نہیں سمجھتے تھے۔ لداخی عورتوں کے بارے میں ولی محمد کشتواڑ کچھ اس طرح رائے قائم کرتے ہیں:

انیسویں صدی میں لداخی عورتیں نیلے، سُرخ، دھاری دار پشواز پہنتی تھیں اور زیورات میں لدی پھندی رہتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر انگریز مہم جو مورکرافٹ نے لکھا تھا۔۔۔'' لداخی عورت اپنے پورے لباس میں یورپ کی کسی راجدھانی کی تمام فیشن پرست خواتین تہلکہ مچا سکتی ہے۔۴۹

کشمیر ایک ایسا خطہ تھا جس میں دور دور سے تاجر اپنا مال بیچنے اور خریدنے آتے تھے۔لداخ میں اس قدر سردی ہوتی تھی کہ کئی کئی فٹ برف جم جاتی تھی۔ جب آسمان پر بجلی کی زبردست کڑک اٹھی تو چوٹی سے برف پگھل کر نیچے آنے ہی والی تھی کہ عبدالرب نے چلا کر آواز لگائی کہ ممدو''ہوشا'' کیونکہ برف بہت تیزی کے ساتھ گر رہی تھی۔اسی بجلی کی کڑک کی آواز میں زوجی لاء کا برفانی عصا اولانش پھر گرا، سینکڑوں من کی چٹانوں کے لڑھکنے کے شور سے میلوں تک درہ اور وادی دونوں لرز گئے۔ایسے برف گری کہ فضا میں منتشر ہو گئے۔لیکن کچھ ایسے ٹکڑے تھے۔ جو درمیان میں آ کے رک گئے اور ندی کے پانی کو روک دیا جس سے سڑک کا کافی حصہ بہہ کر غائب ہو گیا۔ایک بلتی، دو لداخی، تین کشمیری اپنے ٹٹوؤں کے ساتھ غائب ہو گئے۔ ساتھ ہی نمدوں اور قالینوں سے لدے ہوئے دو تین ٹٹو بھی اولانش کے ساتھ غائب ہو گئے تھے اور ہزاروں ٹن کی چٹانوں کے نیچے دفن ہو گئے۔لیکن یہ قافلہ علی الٰہی اعلی مشکل کُشا، خداوند کریم، رب العالمین سے قدم قدم پر دعائیں مانگتا ہوا رینگتا رہا۔ ڈھلوان زیادہ بڑھتی گئی اور برف کم ہوتی گئی یہاں تک کہ سامنے جھونپڑیاں اور مسافر بنگلہ نظر آنے لگا اور ندی کی دوسری جانب چیلوں، دیواروں اور صنوبروں کا لہلہاتا ہوا جنگل۔ اس کو دیکھتے ہی عبدالرب نے اپنے آپ کو لوئی میں لپٹتے ہوئے مونچھوں کو پونچھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

بلتیوں اور کشمیریوں نے بھی مل کر شکر الحمد اللہ کیا اور ہیبت اور خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا اور سب اپنی اپنی زبان میں ہیبت ناک اولانش کا ذکر اور نقصان کا تخمینہ لگانے لگے۔ جو بلتی مر گیا تھا اس کے بھائی نے سینہ کوٹتے ہوئے آہ وزاری شروع کر دی دوسروں نے اُسے صبر کی تلقین کی۔عبدالرب نے بھی کشمیری میں ان کو سمجھانا چاہا لیکن دو لفظ ان کی سمجھ میں آئے۔''مشیت الٰہی'' ترکستان سے مرا کوتک ان دو لفظوں کو کون نہیں جانتا۔قافلہ آگے بڑھا اور سونا مرگ کے گاؤں سے دنبے خریدے، ندی کو پار کیا اور ڈاک بنگلے والے ٹیلے کے نیچے اپنے خیمے لگائے۔ ان کے ساتھ کشمیری بھی کافی تعداد میں تھے۔ جنہوں نے سفید رنگ کے خیمے لگائے۔عبدالرب نے اپنے خیمے میں چھوٹی سے چلم کا فٹ بھر کشمیری حقہ گڑگڑاتا شروع کر دیا۔

صبح ہوئی تو سونا مرگ کے چھوٹے چھوٹے زرد پھول پوری وادی میں جگمگا رہے۔ برف کی دن بھر آنکھ مچولی کے بعد اب آسمان بہت زبردست انداز سے چمک رہا تھا۔کشمیر کی ان خوبصورت وادیوں میں گلشیر پگھل رہے تھے اور خوبصورت چشموں کی آوازیں فضا کو خوشگوار بنا رہی تھیں۔عبدالرب جو کہ چھوٹی سی چلم والا فٹ برابر حقہ گڑگڑاتے

ہوئے بنگالی بابو سے کہنے لگا ''دیکھئے جناب، خدا کا بڑا شکر ہے آج آفتاب نکلا ہوا ہے کل جناب خدا کا قہر تھا، اور ساتھ ہی بنگالی بابو نے عبدالرب سے کہا:

> جناب میں گورنمنٹ کا ملازم ہوں سروے آف انڈیا کی رپورٹ دینے آیا ہوں جلدی واپسی ہے۔ آپ اتنا جلدی زوجی لاسے واپس کیوں آ گئے۔ عبدالرب نے جواب دیا جناب مئی کا مہینہ ہے۔ سیاحت کے شوقین یہاں پر آئے ہوئے ہیں۔ مال فروخت کرنے کا یہ بہترین وقت ہے۔ کاروبار، کاروبار ہوتا ہے۔ چاہیے اس کے لئے نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔۵۰

اسی قدیم تجارت کے بارے میں ولی محمد کشتواڑ شیرازہ میں لداخ کی تاریخی حیثیت کچھ یوں بتاتے ہیں:۔

> سلک روٹ یا ابریشم شاہراہ قدیم دنیا کی سب سے مشہور بھی اور پراسرار شاہراہ تھی جو روئے زمین پر انتہائی دشوار گزار خطوں سے گزرتی تھی۔ یہ چین سے ہوتی ہوئی یورپ میں قدیم سلطنت روما تک جاتی تھی۔ چین کے شہر گوانگ زہو سے بحیر روم کی بندرگاہ تک اس کی لمبائی تقریبا پندرہ ہزار کلومیٹر تھی۔ اس شاہراہ اور اس سے منسلک دوسری شاخوں کی شاہراہوں میں مختلف اقسام کے مال اسباب سے لدے ہوئے گلے میں ٹنناتی ہوئی گھنٹیاں باندھے اونٹوں، گھوڑوں اور دوسرے بار بردار جانوروں کی لمبی قطاریں گذرتی تھیں۔ یہ روٹ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت سے کم از کم دوسو سال پرانی تھی اور یہ چین اور رومن حکومتوں کے مابین تجارت کے لئے بنائی گئی تھی۔۵۱

یہ تجارتی قافلہ ۱۲ مئی ۱۹۰۸ء کی شام سامان سے لدے ہوئے ٹٹوؤں کے ساتھ جب انچر جھیل کو پار کر کے سری نگر پہنچا لیکن عبدالرب اپنے نوکروں کے ساتھ کسی دوسری طرف مڑ گیا یہ راستہ انتہائی تنگ اور کیچڑ ہی کیچڑ تھا۔ کشمیر کی عورتوں کی صورت حال یہ ہوتی تھی کہ وہ ہر آنے جانے والے کو اپنے مکان کی چھت یا کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی تھیں یہی وجہ ہے کہ اُس وقت ایک عورت نے بھی عبدالرب سے آنکھ ملائی اور پھر اچانک اندر غائب ہو گئی۔ اس نے انتہائی خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے اور زیورات سے لدی ہوئی تھی اپنے ساتھ موجود لوگوں میں سے عبدالرب ایک ایسے شخص سے مخاطب ہوا جو اُسے سب سے زیادہ ذہین معلوم ہوا کہ یقین کریں۔'' تاجیک، ترکمان یا بلتی کوئی عورت حسن میں ہماری کشمیری عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ باخدا یہ رنگ، یہ مناسب نقشہ، یہ نزاکت کسی میں نہیں''۔

عزیز احمد نے کشمیر میں اپنے قیام کے دوران وہاں کے رہنے والے لوگوں کی زندگیوں کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے کہ وہ کیسے رہتے ہیں اور کن مسائل کا انہیں سامنا ہے اور لوگ انہیں کیسے مجبور کرتے ہیں۔ کشمیر کے قدرتی حسن

اور دلفریب نظاروں کے ساتھ وہاں کے نچلے طبقے کی زندگی کی بے بسی کو بھی محسوس کیا کیونکہ کشمیر کے لوگ انتہائی غریب ہیں بہت کم لوگوں کے پاس اپنے مکان اور مال و دولت ہے۔غریب لوگ ہاؤس بوٹوں کے کنارے زندگی گزارتے ہیں۔کشمیر کی مختلف جھیلوں میں زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس گندگی کو بھی قریب سے دیکھا جس کے لیے غریب کشمیری عورت کو استعمال کیا جاتا ہے۔عزیز احمد دریائے جہلم کا مشاہدہ کچھ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

> اور پھر اس (جہلم کی روانی، اس کے شفاف، پاکیزہ پانی کو جو صرف پگھلی برف تھا بزدلی کی عفویت بھر دی، جہلم کو اپنے معاشرتی نظام کی طرح متعفن کر دیا، اور جہلم بھی بھول گئی کہ وہ ہمالیہ کی بیٹی ہے، اور آزاد ہے، اور جس طرح عورت طوائف بن جاتی ہے اُسی طرح ان جھوٹے نگوں سے، ان ہاؤس بوٹوں شکاروں، کچن بوٹوں، ڈونگوں کی جھوٹی چمک سے وہ کشمیر کی حسینہ تھی کشمیر کی قحبہ بن گئی۔۵۲

کچھ کشمیری گھرانے ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو ایک دوسرے سے بڑا اور کھاتا پیتا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔اسی کی ایک مثال غضفر جو کا غریب عزیز ہے جس کے بارے میں عزیز احمد کچھ اس طرح لکھتے ہیں:۔

> وہ پہلے غضفر جو کا غریب عزیز تھا اور صرف شادی اور غمی کے موقعوں پر ان کے یہاں نظر آتا تھا مگر اب وہ قریب قریب ان کی ہمسری کر رہا تھا۔ان کا مکان تین منزل کا تھا تو اس کا بھی تین منزل کا تھا، انہوں نے اگر مہاراجہ بردران کے محل کے لیے قالین بھیجنے کا ٹھیکہ لیا تھا تو اس نے مہاراجہ پونچھ محل کے لیے پورا فرنیچر تیار کر کے بھیجا تھا۔۵۳

عزیز احمد اپنے ناول میں کشمیری عورت کا اپنے مرد کے ساتھ وفاداری کا کیا انداز ہوتا ہے یا وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتی ہے۔سکندر جو کی بیوی بتول کا واقعہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

> کمرے کے اندر فانوس میں مٹی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا اور اس کی ایک دن کی بیاہی دلہن بتول رات بھر اس کا انتظار کر کے پلنگ پر اسی طرح کپڑے پہنے صرف ایک دوشالہ اوڑھے سو گئی تھی۔اس کا منہ اب بھی ٹراؤٹ مچھلی کے منہ جیسا معلوم ہو رہا تھا اور اس کے بشرے سے کسی قسم کی تکلیف کا، شکایت کا، غصے کا اس نیند کی حالت میں اظہار نہیں ہو رہا تھا۔کمرے کی پوری فضا سے اور بتول کے چہرے سے صرف ایک کیفیت نمایاں تھی۔انتظار کی کیفیت۔خواب میں بھی وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔۵۴

عزیز احمد کے بقول کہ میں ایک کشمیری ہوں اور مجھے یہ بات کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ کشمیری لوگ

کبھی کبھی دھوکا بھی دیتے ہیں۔جس کی وجہ سے ساری قوم بدنام ہوتی ہے ایک ایسے ہی دھوکے کا ذکر وہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

> اب سے چھ سات سال پہلے مجھے یاد ہے۔موسیو، میڈم ژی برٹ یہاں آئے تھے۔انہوں نے کسی فرانسیسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ادھر لداخ میں زمردوں کی کان شان ہے اور وہ ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے تھے۔وہ ان ہانجیوں کی بدمعاشی سے واقف نہیں تھے۔اور انہوں نے اپنے ہانجی سے ذکر کیا کہ انہوں نے کسی کتاب میں یہ پڑھا کہ ادھر سونا مرگ کے آگے کوئی گاؤں ہے جس کے قریب زمرد مٹی کے کنکروں کی طرح زمین پر پڑے رہتے تھے اور وہاں کے باشندے ایک روپے کے عوض مٹھی بھر زمرد کشمیر میں آ کے بیچ جاتے تھے۔اس ہانجی نے کیا کیا کہ اپنے ایک عزیز کو زوجی ۔۔ یہ ایک درہ ہے جو کشمیر اور لداخ کے درمیان واقع ہے۔۔۔تو اس نے اپنے ایک عزیز کو زوجی لا کے ذرا آگے مٹاین بھیج دیا اور اس کے ساتھ جرمنی کے بنے ہوئے نقلی زمرد بھیج دیئے۔اس کے بعد اس نے موسیو، میڈم ژی برٹ سے کہا کہ اس گاؤں سے میرے ایک عزیز کا خط آیا ہے۔اگر آپ چلتے ہیں تو میں آپ کو وہاں لیے چلتا ہوں۔۵۵

کشمیر کے اکثر مرد اور عورتیں ندی نالوں، دریاؤں اور جھیلوں کے کناروں پر نہاتے کپڑے دھوتے اور برتن صاف کرتے ہیں۔اور انہی کے کناروں پر عورتوں کی عزت لٹتی دیکھی گئی ہے۔ایک ادھیڑ عمر عورت جہلم کے پانی سے اپنے شیر خوار بچے کو نہلا رہی تھی اور جب وہ خود کھنکار کر تھوکنے لگی تو اتنی دور سے نواب مہتاب جنگ نے اس کے تھوک میں خون کی سرخی دیکھی تو فوراً اُسے خیال آیا کہ یہ شعبانا کم بخت کہیں برتن جہلم ہی کے پانی میں تو نہیں دھوتا کیونکہ یہ منظر دیکھ کے اُسے بڑی کراہت محسوس ہو رہی تھی۔کشمیری عوام اپنی زندگی کیسے گزارتے ہیں اور ان کا رہن سہن کیسا ہے اس حوالے سے عزیز احمد ناول میں لکھتے ہیں:

> غلیظ پہاڑی، دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں، دیواروں کا رنگ مٹی جیسا، اور دیواروں میں چوکور کھڑکیاں چھتوں پر گھاس یہ چھتہ بل ہوگا۔میجر صاحب سروے آف انڈیا کے نقشے کو دیکھ کے کہتے ہیں۔ دیکھئے صاحب آپ کا سری نگر آ ہی گیا ہے اور اس آبادی میں آدمی بھی ہیں۔سروں پر غلیظ کشمیری ٹوپیاں اور گنج۔کبھی ٹوپیاں زیادہ نمایاں اور کبھی گنج زیادہ نمایاں۔گورے گورے رنگ، کبھی سانولے رنگ، عورتوں کے وہی گھیردار پھیرن، کوئی عورت ذرا مختلف وضع کا پھیرن، عموماً صاحب معلومات میں اضافہ کرنے کے اطراف کو رسی پہنے گزرتی، ماتھے پر بندی، اور میجر صاحب معلومات کا اضافہ

کرنے کے لیئے کہتے، یہ ''پنڈتانی'' ہے اور پنڈت بھی تھے، کوئی لمبے چغے پہنے ہوئے، کوئی لمبے بند گلے کے کوٹ اور اونی چوڑی دار برجیس نما پاجامے پہنے اور سروں پر پگڑی۔ ۵۶

خواجہ صاحب بہت بڑے تاجر تھے اور خوبصورت مقامات پر گھر بھی تعمیر کر رکھے تھے خواجہ صاحب اپنے بیٹے انور جو سے بہت تنگ تھے کیونکہ وہ یہ کہتا ہے کہ جہاں میں رہتا ہوں اُس مکان میں ہوا کا مناسب انتظام نہیں ہے میرے بچے کو ہوا شوا کی ضرورت ہے۔ اس لیئے وہ کہتا ہے رام منشی باغ میں رہنا چاہیے دوسری طرف خواجہ صاحب یہ کہتے ہیں کہ اس مکان کا کرایہ ساڑھے چار ہزار ہر سیزن کا ہے۔ اور ساتھ ہی موٹر لے کے دینے کی فرمائش کی ہے۔ میں کیسے لے کے دے سکتا ہوں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اپنی بیوی کو آزاد کر دے گا۔ اسی حوالے سے عزیز احمد اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے میجر صاحب کو کیا جواب دیا: ''جناب ہم نے بہت دنیا کی سیر کی ہے۔ ہم کو اپنی عورتوں کی آزادی پسند نہیں۔ جناب تو جانتا ہے ہم کیسا عیاش ہے، مگر ہم اپنا گھر صاف رکھنا چاہتا ہے''۔ ۵۷

جو کچھ خواجہ صاحب نے میجر صاحب کو بتایا اس کے جواب میں میجر صاحب نے بہت ہی خوبصورت انداز سے جواب دیا جس میں ایک سمجھدار آدمی کے لیے بڑا سبق ہے۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر حمیرا اشفاق کچھ یوں لکھتی ہیں:

> ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے۔ آپ اپنے گھر کو اس طرح صاف رکھتے ہیں کہ آپ باہر سے شرابیں پی کے گھر آ کے جب قے کرتے ہیں۔ تو آپ کی بیوی تولیے سے خود صاف کرتی ہیں۔ خواجہ صاحب، خواجہ صاحب اگر مجھے آپ اپنا دوست سمجھتے ہیں تو خدا کے لیے برا نہ منایئے۔ مگر اس کا تو خیال کیجئے کہ آپ کا لڑکا اور لڑکی دونوں ماشااللہ جوان اور صاحب اولاد ہیں۔ اب آپ کو احتیاط کرنی چاہیے۔ ۵۸

خواجہ سکندر جو اور اس کے بیٹے انور جو کے درمیان اختلاف کی خلیج گہری ہوتی گئی جس کی وجہ سے انور جو نے باپ کو خط لکھا لیکن اس کے خط کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ اور خواجہ سکندر جو اپنی عیاشیوں میں مگن رہا۔ جب ظہری صاحب نے خواجہ صاحب کو خط لکھا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں اور لڑکے کی خواہش ٹھیک ہے آپ اس کا احترام کریں تو خواجہ صاحب نے اجازت دے دی اور ساتھ یہ بھی لکھا جو تمھارا جی چاہیے کرو میں کسی کے معاملات میں دخل نہیں دونگا۔ اور انور جو خان یار والے بنگلے میں شفٹ ہو گئے۔ باپ کی رنگ رلیوں سے بیٹا اتنا تنگ آ چکا تھا کہ ایک دن اس نے میجر صاحب کو اپنا دکھڑا کچھ اس طرح سنایا:۔

> بڑے خواجہ صاحب رات کے بارہ ایک بجے سے پہلے گھر نہیں آتے تھے۔ رات کے گیارہ گیارہ بجے

تک ہم لوگ ان کا انتظار کرتے رہتے تھے اور جب بچے بھوک سے بے قرار ہو جاتے تو انہیں کھانا کھلا دیا جاتا۔ گیارہ بجے ہم لوگ کھانا کھا لیتے مگر والدہ اکیلی ان کے انتظار میں بارہ بجے تک بیٹھی رہتیں۔ کبھی خواجہ صاحب کہہ دیتے میں باہر سے کھانا کھا کے آیا ہوں اور والدہ اکیلی ہی بیٹھے بیٹھے کبھی کچھ کھا لیتیں، کبھی آنسوؤں کو پی کے بغیر کچھ کھائے سو رہتیں۔ ۵۹

ایک اور جگہ عزیز احمد ایک جملے سے اس تمام بات کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں: ''جناب میجر صاحب آپ نے صرف میرا سوٹ دیکھا ہے نا۔ کتنا صاف استری کیا ہوا ہے، لیکن میری بنیان تو نہیں دیکھی کتنی گندی ہے'' ۶۰

عزیز احمد چونکہ کشمیر میں کافی عرصہ رہے ہیں انہوں نے کشمیریوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس کی ایک واضح مثال انور جو اور اس کی بیوی کی ہے کہ وہ کیسے زندگی گزارتے ہیں اور ایک دوسرے سے کیسے تعلقات رکھتے ہیں:

بچاری کی بیماری کی اصل وجہ یہ ہے کہ کھلی ہوا اسے نصیب نہیں۔ ذرا سی آزادی کے بغیر عورت کی زندگی مشکل ہے زیادہ آزادی چاہیے کوئی دے چاہے نہ دے۔ چھوٹا سا قد ہے۔ عمر ابھی کم ہے۔ مگر بالکل زرد چہرہ۔ سکنڈری اینیمیا سلگشن لور۔ ہاضمہ خراب، یوں تو اس کو میجر صاحب انور جو اچھی طرح رکھتا ہے اور خود اس کی تعریف کرتی ہے۔ کہتی ہے انور ہنستا ہے۔ کھیلتا ہے۔ ناچتا ہے میجر صاحب یہ میری سمجھ میں نہیں آیا، انور جو اتنے چھوٹے صحن میں ناچتا کیسے ہوگا۔ بہر حال وہ تو یہی کہتی ہے جی۔ کہتی ہے انور جو کہتا ہے۔ باہر نکلو۔ میں نے اسے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی مگر وہ بولی اپنے بچے کی قسم میں نہیں آؤں گی۔ اپنے بچے کی قسم میں نہیں آؤں گی۔ معلوم نہیں بار بار بچے کی قسم کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے انور جو بیلی رام کی دکان پر ملا۔ دوپٹے کے لیے ریشم ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی بیوی کے پاس دوپٹے بہت ہیں مگر انہیں چھپا کے صندوق میں رکھ دیتی ہے۔ اور میلے دوپٹے دکھا کے انور جو کو کہتی ہے میرے پاس دوپٹے نہیں ہیں۔ میرے خیال میں صاف ہوا کے بعد اس کی بھی ضرورت ہے کہ اُسے کسی اچھے سائیکیاٹرسٹ کو دکھایا جائے۔ وہ بمبئی کا سائکوانالسٹ ہے۔ ناکیکی مسانی۔ میں نے انور جو سے کہا تھا۔ کہ وہ سری نگر آیا ہے، اُسے دکھا دے مگر خواجہ سکندر جو نے کہا نہیں جی، میری بہو تو میرے جیتے جی کسی غیر مرد کے سامنے نہیں آئے گی۔ خواہ وہ افلاطون ہو یا کوئی اور ڈاکٹر ہو۔ اب میں کیا کروں میجر صاحب، میں نے کوئی سائیکیاٹری کی ڈگری کب لی ہوئی ہے جو میں انور جو کو بتاؤں کہ تیری بیوی کو کیا کامپلیکس ہے۔ ۶۱

غضنفر جو جو کہ بہت بڑا تاجر تھا اسی لیے اس کو بہت بڑے بڑے لوگوں کی دعوتوں میں جانا پڑتا تھا جن میں سے سرکاری زیادہ ہوتی تھیں۔ ان کے رہن سہن کا انداز اپنا تھا ان کے گھر والوں کو کبھی کسی نے ننگے سر نہیں دیکھا۔ انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے جس کی ایک واضح مثال عزیز احمد نے اپنے ناول میں بھی پیش کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> جاڑوں میں پشمینے کا لبادہ اور اس کے اوپر کبھی ایک موٹا سا کمبل، کبھی تو سر اوڑھتے رہتے۔ سفید سوتی کپڑے کا چغہ اور شلوار پہنتے۔ مدت العمر کبھی انہوں نے شیروانی نہ پہنی اور باوجود اس کے کہ ان کے بڑے بڑے گاہک عموماً انگریز تھے جن کو یہ نشاط، شالامار، نسیم اور کبھی کبھی ہارون میں کشمیری کھانے کی دعوتیں دیتے، کبھی غضنفر جو نے انگریزی لباس نہ پہنا۔ دوسرے انگریزی تکلفات سے انہیں پرہیز نہ تھا۔ وکٹوریائی نوعیت کے صوفے سیٹ دکان میں اپنے گاہکوں کے بیٹھنے کے لیئے انہوں نے بنوائے مگر گھر میں کبھی اپنی قالین نشینی کی وضع نہ بدلی۔[۶۲]

یہاں رہنے والے ہر مرد اور عورت کا اپنا اور نمایاں لباس ہے جسے یہ اپنی ثقافت کا نام دیتے ہیں۔ ان کا لباس ٹھنڈے اور گرم موسم کے لحاظ سے بہترین شمار ہوتا ہے۔ ہاں البتہ یہ بات درست ہے کہ عورتوں کے کپڑوں پر بہت زیادہ کام ہوا ہوتا ہے جبکہ مردوں کا بہت کم۔ ان کی عورتیں پنجابی لباس بھی پہنتی ہیں لیکن بہت کم۔ لیکن چترال، گلگت اور لداخ کے رہنے والے اپنے مطابق لباس کو ترتیب دیتے ہیں، کشمیری کڑھائی کے کاموں والے لباس پہننے کے لیئے بہت زیادہ محنت اور اسے پسند کرتے ہیں۔ کچھ علاقوں کے لوگ ایسے بھی تھے جن کے مرد اور عورتیں چھ چھ مہینے نہیں نہاتے تھے جس کی وجہ سے جس رنگ کے ان کے کپڑے ہوتے تھے اسی رنگ کی جوئیں ان کے کپڑوں میں گھر بنا لیتیں۔ کشمیر کی کئی ہزار سالہ تاریخ کے متعلق صحیح حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا تا کہ اس زمانے میں کشمیری لوگ کس طرح کا لباس پہنتے تھے اس حوالے سے کوئی بھی بات ثوق سے نہیں کہی جا سکتی البتہ تاریخ بڈ شاہی میں کشمیر کے قدیمی لباس کا کچھ نہ کچھ ذکر ضرور ملتا ہے۔ تاریخ بڈ شاہی کا مصنف اس کے بارے میں کیا لکھتا ہے اسی کو تحسین جعفری کاشمیری اپنی کتاب میں کچھ یوں لکھتے ہیں:۔

> ''اہل کشمیر کا اصل لباس تنگ پاجامہ اور اگرکھا ہوتا ہے۔ ان کے بال لمبے لمبے ہوتے تھے۔ داڑھی منڈنے کا رواج نہ ہندوؤں میں تھا، نہ مسلمانوں میں، جب سلطان قطب الدین کے زمانے میں حضرت سید علی ہمدانیؒ تشریف لائے تو انہوں نے مسلمانوں کے لئے عربی قسم کا جبہ وعمامہ پسند کیا اور اس کا عام رواج ہو گیا''۔[۶۳]

کشمیریوں کا اس وقت بھی لباس ڈھیلا ڈھالا کرتہ اور ٹوپی یا سفید پگڑی ہے۔ کشمیر میں چونکہ سردیوں کے دنوں میں سردی بہت پڑتی ہے۔ اس لیئے سردی سے بچنے کے لیے عورتیں اور بچے ''کانگڑی'' بھی ساتھ رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اس میں آگ کے انگارے ہوتے ہیں۔ اور یہ پھرن کے نیچے رکھی جاتی ہے۔ تا کہ جسم کو گرمی پہنچتی رہے، اس لیئے ''کانگڑی'' اور ''پھرن'' ایک دوسرے کے لیئے لازم وملزوم ہیں۔ جہاں تک پڑھے لکھے لوگوں کا تعلق ہے وہ اب عام طور پر کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ قدیم کشمیری لباس میں اب کمی آتی جا رہی ہے۔ البتہ دیہاتوں اور شہروں میں رہنے والے کسان اور عام دیہاتی اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے ابھی تک پرانا لباس پہننے پر مجبور ہیں وہ اپنے قدیم لباس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کر سکے۔

پرانے کشمیریوں کے لباس کی فہرست تحسین جعفری کشمیری کچھ یوں لکھتے ہیں:۔

مردانہ لباس

''کرتہ، پاجامہ، دستار، (پگڑی)، کلہ پوش (ٹوپی)، کپرز اور (چادر، شال، دوشالہ) وغیرہ''

زنانہ لباس

پھرن، پیزار (شلوار یا پاجامہ) قصابہ، کرتیئں (قمیض)، کلہ پوش (ٹوپی) سینہ بند، پوز (دوپٹہ، چادر) برقعہ، وردن (دلہن کا خاص لباس)

کشمیریوں کی خوراک انتہائی سادہ اور موسم کے لحاظ سے بہترین ہوتی ہے۔ نان خطائیاں اور باقر خانیاں یہ شوق سے کھاتے ہیں نان خطائیوں کو دم نہیں دیا جاتا یہ صبح کے وقت یہ لوگ گھی والی چیزیں کھاتے ہیں دن اور رات کے کھانے میں زیادہ تر چاول پسند کیئے جاتے ہیں۔ یہ اپنے مہمانوں کی بہت عزت کرتے ہیں اور ان کی قسم قسم کے کھانوں تواضع کرتے ہیں جیسا کہ:

مہمانوں کے آگے بڑے بڑے سرخ دسترخوان بچھائے گئے۔ جن پر آداب طعام اور فارسی اشعار چھپے ہوئے تھے اور نوکروں نے مہمانوں کے ہاتھ دھلائے، جو چاروں دیواروں کا سہارا لگائے چاروں طرف بیٹھے تھے۔ پھر دسترخوانوں پر چاولوں کے بڑے بڑے طبق رکھے گئے۔ کچھ مہمان دسترخوان کی دوسری طرف بیٹھ گئے۔ ایک ایک طبق چار آدمیوں کے لیئے تھا۔ چار جگہ کباب، شوربہ اور بوٹیاں تھیں۔ اکثروں نے مضبوط انگلیوں سے تلے ہوئے گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور اس کی چربی ریڑ کی طرح کھینچ کے پھٹ گئی اور پھر چاولوں کے لقموں کے ساتھ گوشت کا پہلا نوالہ بسم اللہ کر

کے منہ میں رکھا۔ نوکر چھوٹے چھوٹے پیالوں میں دوسرے سالن دینے لگے، مٹر کا شوربہ، آلو کا قورمہ، گوشتابہ، کوفتے، مرچوں کا سرخ قورمہ، ترکاری کا ساگ اور آب گوشت۔[۶۴]

سردیوں میں کشمیری لوگ کھانے پر بہت زیادہ خرچ کرتے ہیں طرح طرح کے گوشت، کباب، گوشتابہ چاول بھنا ہوا مرغ اور ترکاری بڑی شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ ساتھ نمکین کشمیری چائے بھی بہت زیادہ پی جاتی ہے۔ کشمیر کی شالیں اور قالین دنیا بھر میں بہت مشہور ہیں یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے قالین بافی اور شالیں بنانے کا پیشہ اختیار کیا ہوا ہے اور بہت سے لوگ تجارت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ جو لوگ غریب ہیں انہوں نے اپنی استطاعت کے مطابق پیشے اختیار کر رکھے ہیں۔ کچھ لوگ زراعت کے پیشہ سے وابستہ ہیں تو کچھ لوگ بھیڑ، بکریاں، گائیں اور مرغیاں پال کر زندگی گزار رہے ہیں۔ قالین بافی کی صنعت کشمیر کی بہت پرانی صنعت ہے جیسا کہ:۔

جناب عیسوی صدی میں ادھر ایک بادشاہ تھا نا! بڑا خدا ترس، اس کا نام زین العابدین تھا۔ وہ سکندر بت شکن کا بیٹا تھا۔ تو جناب زین العابدین سمرقند میں تیمورلنگ کے دربار میں قالین بافی کے کمالات ہنر دیکھتا تھا تو وہ جناب ۔۔۔ اس نے جناب قالین بافوں کو سمرقند سے طلب کیا اور اس طرح کشمیر میں قالین بننا شروع ہو گئے۔[۶۵]

ایک اور جگہ سلطان زین العابدین کے متعلق کچھ یوں لکھتے ہیں: ''اب ہمارے مہاراج نے قالین فانی کے کام کو پھر سے زندہ کر دیا ہے ہمارا مہاراج دوسرا سلطان زین العابدین ہے''[۶۶]

کشمیر میں طرح طرح کے قالین بنائے جاتے تھے جیسا کہ: ''کاشانی قالین، شیرازی قالین، بخاری قالین، اندجانی قالین، مشہدی قالین، کشمیری قالین''[۶۷]

تبت اور لداخ کے لوگ ہاتھ کی چیزیں بنانے، پتھر پر کندہ کرنے اور مختلف زیورات بنانے میں ماہر تصور کیے جاتے تھے۔ بدھ کے ہاتھی دانت اور جیڈ کے چھوٹ چھوٹے مجسمے بہت زیادہ مشہور تھے۔ تبتی یاقوت ارزق اور لاجورد سے جڑی ہوئی انگوٹھیاں، بڑے بڑے فیروزے اور چاندی کے پتروں میں جڑے ہوئے ہار بہت مشہور تھے۔ یہاں کے لوگوں کا پیشہ بھی یہی تھا اور بہت سے لوگ تاجر بھی تھے کیوں کہ یہ بہت مہنگی چیزیں تھیں اس لیے امیر لوگ ہی یہ کام کرتے تھے۔

کشمیر کی صنعت و حرفت اور سلطان زین العابدین کے بارے میں تحسین جعفری کاشمیری کی رائے کچھ اس طرح سے ہے:

سب سے پہلے جس مسلمان بادشاہ نے کشمیر میں صنعت وحرفت کی داغ بیل ڈالی اور مختلف قسم کی دستکاریوں کو رواج دیا، وہ سلطان زین العابدین ہے، جسے کشمیری آج بھی ''بڈشاہ'' یعنی بڑا بادشاہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔۶۸

کشمیر کی دستکاریوں میں نمایاں حیثیت شالبافی اور قالین سازی کو حاصل ہے ان دو کے علاوہ جن صنعتوں نے شہرت حاصل کی ان میں گتہ سازی، ریشم کی صنعت، کاغذ سازی، سوزن کاری، چکن روزی، جالک دوزی اور کار جولی خاص طور پر مشہور ہیں۔ چند مشہور اور عام دستکاریوں کا حال تحسین جعفری کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

شالبافی کی ابتداء چودھویں صدی کے آخر میں ہوئی، جب کشمیر کے تخت سلطنت پر سلطان قطب الدین رونق افروز تھے۔ اس صنعت کو کشمیر جنت نظیر میں روشناس کرانے والے مشہور روحانی پیشوا حضرت پیر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو شاہ ہمدان کے نام سے مشہور ہیں۔ سلطان قطب الدین کی شایانہ سرپرستی سے اس صنعت نے فروغ حاصل کیا اور رفتہ رفتہ تقریباً ساری دنیا میں اس کی شہرت ہوگئی چنانچہ کشمیر کی شہر آفاق دستکاری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اے کمارا سوامی لکھتے ہیں۔ ''برصغیر ہند کا کوئی پارچہ رنگوں کے حسین امتزاج، بناوٹ اور ڈیزائن کی نفاست وخوبی میں کشمیری شال کی ہمسری نہیں کرسکتا۔۶۹

غریب کشمیری کا پیشہ کیا ہے اور وہ کیسے گزارا کرتا ہے اس بارے میں عزیز احمد اپنے ناول میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ادھر گوجر لوگ بھی رہتا ہے۔ ڈھور ڈنگر گائے بکری چراتا ہے جناب، گھاس چھیلتا، نکالتا ہے جناب، دودھ وغیرہ بھی بیچتا ہے جناب اور جاڑے میں جناب ہم گھر میں بیٹھتا ہے اور بھیڑ کا اون ہوتا ہے نہیں؟ جناب اس کا کپڑا بناتا ہے۔ یہ کمبل، یہ کپڑا سب ہم نے خود بنایا ہے۔۷۰

کشمیر میں بسنے والے زیادہ تر لوگ مسلمان ہیں اور وہ اسلام سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں مسجدیں موجود ہیں جہاں وہ اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کہ پیروں کی پیروی کرتے ہیں کچھ غیر مسلم بھی رہتے ہیں۔ جو اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ اسی حوالے سے عزیز احمد نے اپنے ناول ''آگ'' میں بہت ہی خوبصورت گیت لکھا ہے جسے کشمیری گیت کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا گیت ہے جس میں تصوف، تمدن، شریعت، کلام اور ساتھ ہی رندی اور بادہ پرستی، اور شالامار کے لالوں اور نسیم باغ کے سبزہ زار، اور

اچھا بل کے حسن اور حضرت بل کی زیارت گاہ کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب کچھ یوں ہے!

> جناب ماسوک نے پیالہ شراب کا ہم کو رات کو دیا اس سے ہم مست ہو گیا، اور جناب اچھا بل باگ ہے جو جناب نے دیکھا ہو گا، وہاں جہانگیر بادشاہ نے مجلس سجایا تھا اور جناب یہ بدڈل، یہ بڑا دل ہے جس میں سے ہم اب ڈونگا لے جا رہا ہے اور جناب مست بھئی گوسہ راتی کہ پیالئی ہنسو۔ اور شالیمار لالہ زار جدھر اب ہمارا ڈولگا جائے گا ادھر سب لالہ گلال کا بہار ہے۔ وہ پھولنے لگا ہے اور وہ ادھر پیچھے نسیم باغ جہانگیر بادشاہ کا ہے۔ ادھر پہلے ہزار چنار ہوتا تھا۔ اب ہم آٹھ سو چنار گنا ہے اور جناب کھجیارا بل میں تاؤ تیار ہے اور حضرت بل میں جناب نماز پڑھنے گیا ہو گا۔ ادھر بڑا زیارت ہے ادھر موئے مبارک ہے اور پیالہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ جناب ہاں۔ ہاں۔ ہاں مست بھئی گوسہ راتی کی پیائی ہنسو۔ اے

کشمیر میں نو روز بڑے زبردست طریقے سے منایا جاتا ہے اس دن ہر طرف خوشی ہی خوشی ہوتی ہے لوگ مختلف قسم کے کھانے بناتے اور کھاتے ہیں اور دوسروں کو کھلاتے ہیں۔ جن میں بھنے ہوئے چنے، تال مخانے، لڈو تل کی چیزیں، کچوریاں، پکوڑیاں وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک قسم کا نئے سال کا جشن ہوتا ہے۔ یہ لوگ مزارات کو بناتے بھی ہیں اور اپنے مسائل کو حل کروانے جاتے بھی یہ کوئی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ یہاں کوئی دفن ہے بھی یا نہیں یا یہ کیسا آدمی تھا جیسا کہ:

> اس صدی کے ایک عجیب وغریب جری اور اولوالعزم شخص کے مدفن پر ایک عرصے تک ایک لکڑی کے ستون پر ایک سفید جھنڈا لہراتا رہا جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ایک مسلمان بزرگ شہید دفن ہے۔۲ے

مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود کشمیریوں کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا اُس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یاں پر بسنے والے لوگ بہت زیادہ امیر نہیں تھے۔ بہت مشکل سے محنت مزدوری کر کے گزارا کرتے تھے۔ امیر لوگ ان سے گدھوں کی طرح کام لیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یہ سفر کرتے کرتے مر جاتے۔ لیکن پھر آہستہ حالات تبدیل ہوئے اور مسلمانوں کو کچھ آزادی نصیب ہوئی۔ رعایا کے ساتھ ساتھ کیا کیا ظلم ہوتے اور کیوں ہوتے مذہب کا اس میں کیا کردار تھا۔ عزیز احمد کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> پہلے جناب کشمیر میں رعایا کا حال پوچھتا تھا نا تو ہم ڈرتا تھا۔ ہم سمجھا تھا شاید جناب مسلمان ہو گا شاید

نہیں ہوگا؟ ادھر، تھوڑے سال پہلے ادھر بہت خونریزی قتل ہوا تھا۔ اس سے پہلے ادھر شہر میں مسجد بند تھا۔ ہم مسجد کھلوایا، اب ادھر نماز ہوتا ہے اور کوئی پنڈت جا کے پولیس کو کہہ دیتا تھا کہ یہ گائے کو مارا ہے اور جناب ادھر اس کی سخت سزا ہے۔ پولیس بہت ظالم ہے۔ پھر جناب ادھر ہم کو سزا ہو جاتا ہے۔ بہت بے گناہ آدمی ایسا سزا پایا۔ پھر جناب ادھر کانفرنس نے بغاوت کیا تھا نا۔ پھر سے پنڈت لوگ کا زور ذرا کم ہو گیا۔[۳]

مسلمان اگر مزارات پر جاتے منت مانتے، سجدہ کرتے اور شفا حاصل کرنے کی امید لگاتے تو ہندو مورتیاں بناتے ان کو پوجتے، مندروں کی زیارت کرتے اور سکون تلاش کرتے۔ ان میں اکثریت عام کشمیری، ان پڑھ لوگوں اور عورتوں کی ہے، یہ مختلف توہمات میں مبتلا رہتے ہیں بلکہ عورتیں اس مرض کا زیادہ شکار رہتی ہیں۔ کوئی تکلیف ہو، بیماری یا پریشانی ہو، اسے کسی نہ کسی ان دیکھی بلا کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ کسی نے جادو کر دیا۔ کسی کی نظر لگ گئی۔ بھوت پریت کا سایہ بڑھ گیا۔ یہ وہ توہمات ہیں جو ان کی زندگی کا بڑا روگ بن جاتی ہیں۔ اسی حوالے سے تحسین جعفری کی رائے کچھ یوں ہے:

ان سب خلاف عقل باتوں کا کوئی جواز اسلام میں نہیں، بلکہ کشمیری عوام کی ناخواندہ اکثریت نے یہ باتیں ہندوؤں کے اثر سے قبول کی ہیں، جن کے ہاں اس قسم کی دیومالائی باتیں عام ہیں، چیچک کی بیماری کو ڈائن کے سائے کا اثر سمجھنا اور جب بچہ اس بیماری سے نجات حاصل کرے، تو گھاس پھوس جلا کر اور بچے کو اس آلاؤ کے گرد پھرا کر بھوت پریت یا کسی چڑیل کے سائے کو جلانا ظاہر کرنا بھی اسی قسم کے توہمات میں سے ہے خدا کا شکر ہے کہ اب کشمیریوں میں یہ باتیں ختم یا کسی حد تک کم ہوتی جا رہی ہیں، ورنہ ساٹھ ستر سال پہلے تک تو کشمیری عوام بُری طرح ان توہمات کا شکار رہے[۴]

کشمیریوں کے رسم و رواج عموماً اسلامی روایات پر مبنی ہیں ان کی سماجی، اقتصادی اور مذہبی زندگی رسم و رواج کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے موقع پر قرآن خوانی کرنا خیر و برکت کا ایک بہت بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان روایتی مذہبی تہوار عقیدت و احترام اور ثقافتی تہوار جوش و جذبے سے مناتے ہیں۔ ہندو اور سکھ بھی اپنے تہوار بڑے جوش و جذبے کے ساتھ مناتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں کے مقبول ترین تہواروں میں عیدالاضحیٰ، عیدالفطر، عیدمیلاد النبیؐ، لوہری، ہولی، تراواتری وغیرہ۔ ان تہواروں کے دوران بہت بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے لباس زیب تن کرتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ کشمیریوں کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش عام طور پر گھر پر ہی ہوتی ہے۔ امراء کے علاوہ کوئی زچہ کو ہسپتال

میں لے کر نہیں جاتا ہے۔ گھر پر ہی دایہ کو بلا کر وضع حمل کی تمام ضروری کاروائی کی جاتی ہے۔ بچے کی ولادت کے بعد مبارک دینے والوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ رشتہ داروں کے علاوہ پڑوسی اور دوست بھی مبارک باد کے لیے آتے ہیں۔ کچھ لوگ نومولود کے لیے کپڑے لے آتے ہیں تو کچھ لوگ پیسے دے جاتے ہیں۔ تحسین جعفری بچے کے پیدا ہونے کے بعد کی رسموں کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> موتراشی کے چند دن بعد بچے کا عقیقہ کیا جاتا ہے۔ اس میں مینڈھا یا بکرا یا دُنبہ ذبح کیا جاتا ہے قربانی کے جانور کی طرح عقیقے کا جانور بھی بے نقص ہونا چاہیے۔ والدین عقیقے کا گوشت نہیں کھاتے، بلکہ عزیز واقارب اور دوست احباب ہی کی دعوت کی جاتی ہے یا ان کے گھر عقیقے کا گوشت بھیجا جاتا ہے ۷۵

مزید لکھتے ہیں: ''مسلمانوں میں بچے کی پیدائش کے سلسلے میں سب سے بڑی رسم ''ختنہ'' ہوتی ہے'' ۷۶

جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس وقت ایک رسم ادا کی جاتی ہے۔ جسے ''بسم اللہ'' کہتے ہیں اس کے بارے میں تحسین جعفری کے خیالات کچھ یوں ہیں:۔

> بچہ جب تقریباً پانچ سال کا ہو جاتا ہے تو کسی مولوی صاحب یا خاندان کے کسی بزرگ کو بلا کر بچے کو بسم اللہ پڑھواتے ہیں۔ یہ تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی بچے کو گھر پر قاعدہ وغیرہ شروع کرایا جاتا ہے۔ یا سکول میں داخل کیا جاتا ہے۔ جس دن بچے کو بسم اللہ پڑھائی جاتی ہے، بسا اوقات کچھ دعوت کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ خیرات بھی دی جاتی ہے اور بچے کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ ۷۷

کشمیر میں شادی بیاہ کی بہت سی رسمیں ہیں، مثلاً منگنی، نکاح، مصالحہ کوٹنا، شادی کی اطلاع اور ایام بندی، جسے ''دوہ گنڈن'' کہا جاتا ہے۔ حنا مہندی، برات، رخصتی، ولیمہ، دولہا کی واپسی، دلہن کا پہلا قدم وغیرہ وغیرہ لیکن ان سب چیزوں سے پہلے موزوں رشتے کی تلاش اور پھر شادی کی تیاری ہوتی ہے۔

شادی بیاہ اور نکاح کی رسم کے حوالے سے تحسین جعفری کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> منگنی کے بعد نکاح کا مرحلہ آتا ہے بعض دفعہ رخصتی سے پہلے نکاح ہو جاتا ہے لیکن زیادہ نکاح اسی دن ہوتا ہے جب دلہا برات لے کر آتا ہے۔ نکاح کی تقریب لڑکی کے میکے میں ہی انجام دی جاتی ہے۔ اور لڑکی کے لیے زیورات اور کپڑے لائے جاتے ہیں ۷۸

اس کے بعد ''حنا بندی'' کی تقریب ہوتی ہے۔ جسے ''مانز لاگن'' کہتے ہیں۔جس رات دلہن کو ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی لگائی جاتی ہے، کشمیری میں اسے ''مائنز راتھ'' کہتے ہیں۷۹

نکاح خوانی کے بعد دولہا کو اندر زنان خانے میں لے جایا جاتا ہے۔ وہاں اسے دلہن کے پہلو میں بٹھایا جاتا ہے۔جسے کشمیری میں ''کوٹھہ دیون'' کہتے ہیں۔یعنی دولہا دلہن کا پہلو بہ پہلو بیٹھنا۔ پھر'' آرسی مصحف'' کی رسم ادا ہوتی ہے۔قرآن پاک ان کے سروں پر پھرایا جاتا ہے اور آئینے میں ایک دوسرے کا مُنہ دکھایا جاتا ہے۔اس کے بعد دلہا دلہن کو شربت پلایا جاتا ہے۔ چاہے ایک ایک گھونٹ ہی پئیں۔اس دوران ہولے ہولے گیتوں کا سلسلہ بھی شروع رہتا ہے اور الڑھ دوشیزاؤں کے گیت فضا میں رس گھولتے رہتے ہیں۸۰

محمد حسن حسرت اپنی کتاب بلتستان تہذیب و ثقافت میں دلہن کی آمد کے حوالے سے وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

دلہن جونہی دولہا کے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو صلوٰۃ و درود کی آواز سے پوری فضا گونجنے لگتی ہے۔ دروازے پر دلہن کے دائیں پاؤں کا انگوٹھا دھویا جاتا ہے۔ بنات گل آفریدی اپنی کتاب بلتستان ان ہسٹری میں لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ایک بکرا یا مرغی ذبح کی جاتی ہے لیکن آج کل صرف مرغی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔جب دلہن اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہے تو دولہا کی بہن دروازہ کو اندر سے بند کر دیتی ہے اور اس وقت تک نہیں کھولتی جب تک دولہا اس کے مطالبات پورا کرنے پر آمادہ نہ ہو۔۸۱

شادی والے دن یا پھر دوسرے دن دولہے کی طرف سے ولیمہ کی تقریب سجائی جاتی ہے۔ یہ دعوت سنت مؤکدہ سمجھ کر اکثر و بیشتر ہر مسلمان دیتا ہے۔اس میں اس کے دوست اور رشتہ دار بہت بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں اور اسے مبارک باد دیتے ہیں۔

س اُردو ناول میں کشمیر

کسی بھی قوم کا تجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قوم کے تہذیبی، فکری اور نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لیا جائے۔ اور یہ تجزیہ ناول سے ہی ممکن ہے۔ کیونکہ ناول کی صنف ایک ایسی صنف ہے جس کا کینوس اتنا وسیع ہے جو کسی قوم کے ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے موضوع پر متعدد ناول لکھے گئے ہیں اور ان

ناولوں میں موضوعات کا تنوع اور بہترین اسلوب نظر آتا ہے۔

ان ناولوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کشمیر کے مکینوں کی عام زندگی ان کا حسن اور زمین کی خوبصورتی سے شروع ہونے والی تصویر پھیلتی ہوئی کشمیر کی تہذیب وتمدن اور تاریخ وثقافت سے گزر کر بین الاقوامی تحریکوں اور موضوعات سے ہم آہنگ ہو کر وسیع ہوتی چلی گئی۔ اس کے علاوہ کشمیر پر لکھے گئے ناولوں کا ادبی مقام متعین کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور فنی معیارات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ جو کہ درج ذیل ہیں۔

طوفان کی کلیاں:

کرشن چندر کا یہ ناول ''طوفان کی کلیاں'' دہلی سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع بہت زیادہ پھیلاؤ رکھتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے ناول کے وہ حصے بہت زیادہ اہم ہیں جہاں ڈوگرہ شاہی حکومت اور اس کے اہل کاروں کے کشمیری کسانوں کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتے ہوئے تاریخی اور سماجی حقائق کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ''شکست'' کی طرح ''طوفان کی کلیاں'' کا پس منظر بھی کشمیر ہے۔ لیکن اس کا موضوع ہے طبقاتی نظام میں محنت کا استحصال اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں ہندو مسلم منافرت کو ہوا دیتا ہے۔ بعض مواقع پر جاگیردارانہ استحصال کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

زرد پتا:

یہ ایک ایسا ناول ہے جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا اور ناول کے پہلے صفحے پر ناصر کاظمی کا یہ شعر درج ہے۔

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانہ گل

اس ناول میں کشمیر کے نسوانی حسن اور وہاں کے لوگوں کی معصومیت اور بھولپن کو موضوع بنایا گیا ہے۔

میری یادوں کے چنار:

''میری یادوں کے چنار'' کرشن چندر کا سوانحی ناول ہے۔ یہ ادارہ فروغ اردو لاہور سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس ناول کا زیادہ تر حصہ کرشن چندر کے لڑکپن کی یادوں اور اس کے والدین کی خانگی زندگی سے متعلق ہے۔ اس ناول میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ افسانے کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ لیکن ان واقعات کے بیان میں کشمیر کی خوبصورتی اور معاشرتی رہن سہن کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ اس تکنیک کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مرکزی کردار خود مصنف کی ذات ہے۔ اور ایسی ہی تکنیک کو سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' اور عزیز احمد نے ''گریز'' اور

''آگ'' میں استعمال کیا ہے۔

مٹی کے صنم:

یہ ناول بھی کرشن چندر کا ہے جو کہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول بھی ان کے دوسرے ناول ''میری یادوں کے چنار'' کی طرح بچپن اور جوانی کے زمانے کی یادوں پر مبنی ہے۔ اس ناول کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس میں کشمیر کی سیاسی، سماجی، اور تہذیبی زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔

مجاہد کشمیر:

یہ ناول انتہائی مختصر ہے جو کہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ اور اس کے مصنف ''جلال انصاری'' ہیں۔ یہ سترہ ابواب پر مشتمل ہے اور بہت ہی محدود کینوس ہے۔ یہ اصل میں ۱۹۴۷ء میں ڈوگرہ فوجیوں کے ہاتھوں کشمیری مسلمانوں کے قتل عام کی داستان ہے۔ جسے ناول کے کردار ''کثیر خان'' کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ جو کہ انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد کا خیال تھا کہ پڑھ لکھ کر نوکری کرے لیکن وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تحریک آزادی کشمیر میں شامل ہو جاتا ہے۔

باگھ:

''باگھ'' عبداللہ حسین کا ناول ہے۔ یہ ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول مزاحمتی ادب اور خاص طور پر کشمیر کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک علامتی ناول ہے جس کا تمام پس منظر آزاد کشمیر ہے۔ زمانی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ ''اداس نسلیں'' کی توسیع ہے کیونکہ اداس نسلیں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے عرصے پر محیط ہے۔ اس کے برعکس باگھ میں تمام واقعات آزادی کے بعد کے ہیں۔

رنگ لائے گا لہو:

اکرام الدین کا ناول ''رنگ لائے گا لہو'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں اخلاق، راحلہ، ماہ رخ اور راشدہ کے درمیان محبت کے رومانوی قصے کو تحریک آزادی کشمیر کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ ناول جہاں انسانی جبلت کے موضوع ''محبت'' کی مختلف حصوں کو اجاگر کرتا ہے۔ اور وہاں خطہ کشمیر سے ان لوگوں کی وابستگی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ کشمیر پر لکھے گئے ناولوں میں سے یہ ناول اس لیے بھی منفرد ہے کیونکہ ناول کا ہیرو کوئی مافوق الفطرت کردار نہیں بلکہ بشری صفات کا حامل ہے۔

کشمیر لہو رنگ:

''کشمیر لہو رنگ'' ظہور الدین بٹ کا ناول ہے جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ مصنف نے اس ناول میں حقیقی واقعات کو افسانوی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ ایک پانچویں جماعت کے طالب علم حسن کی کہانی ہے۔ حسن کو اس جماعت میں کشمیر کے بارے میں ہر طرح کی معلومات ہیں اور وہ پختہ عمر کے لوگوں کی طرح کشمیر کی تاریخ اور تحریک آزادی کے پس منظر کو بہترین انداز سے بیان کرتا ہے۔

دختر کشمیر:

مقصود احمد راہی کے کشمیر پر لکھے گئے ناولوں میں سے یہ پہلا ناول ہے۔ جو ۱۹۹۴ء میں فائیو سٹارز پبلی کیشنز راول پنڈی سے شائع ہوا۔ اس میں ناول کی کہانی کشمیر اور مجاہدین کی مظلومیت کی داستان ہے۔ ناول کا پلاٹ انتہائی سادہ ہے۔ جس میں کشمیری مجاہدین کی مختلف مہمات کو سیدھے سادے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

خاک اور خون:

نسیم حجازی کے ناول ''خاک اور خون'' کو قومی کتب خانہ لاہور سے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا گیا۔ یہ ناول چار ابواب پر مشتمل مختصر ناول ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک مشہور اور تاریخی ناول ہے۔ جیسے کشمیر اور تقسیم برصغیر پر لکھا گیا ناول میں جہاں کشمیر کا تذکرہ ہے وہیں کشمیر کی سیاست پر زور دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے نسیم حجازی کا اسلوب بھی ناول نگار سے زیادہ تاریخ نویس کا ہو جاتا ہے۔ ناول کا زیادہ تر حصہ چونکہ کشمیر کے حوالے سے نہیں ہے۔ اس لیے پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر کشی اور زبان و بیان کے حوالے سے تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا۔

چناروں کے آنسو:

''طارق اسماعیل ساگر'' کا ناول ''چناروں کے آنسو'' ۱۹۹۶ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول کو اٹھارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس ناول کی تکنیک کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ منصف نے ناول میں کشمیر کے دو پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ایک طرف کشمیر کی تحریک آزادی کے حوالے سے پیدا ہونے والی وہ سیاسی صورت حال ہے جس کو محبان کشمیر، کشمیر اور باہر کی دنیا میں متعارف کرا رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک ایسی جنگ ہے جو گوریلا انداز میں کشمیر کی وادیوں میں لڑی جا رہی ہے۔

سلگتے چنار:

''سلگتے چنار'' ناصر بیگ چغتائی کا ناول ہے۔ جسے اخبار جہاں پبلی کیشنز نے ۲۰۰۰ء میں کراچی سے شائع

کیا۔ ناصر بیگ چغتائی بنیادی طور پر تو ایک صحافی ہیں۔لیکن کالم نگار اور مضمون نگار کے حوالے سے بھی شناخت رکھتے ہیں۔ اس ناول میں بعض واقعات ایسے بیان ہوئے ہیں جس کی وجہ سے یہ ناول بھی تاریخ بن گیا ہے۔ اس ناول کی کہانی باقی روایتی ناولوں سے مختلف ہے۔ یہ ناول جدوجہد آزادی سے شروع ہو کر اسی جدوجہد پر ختم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیر کو ابھی تک بھاری شکنجے سے آزادی نصیب نہیں ہوئی اس لیے ناول میں تحریک آزادی کشمیر کے اس تسلسل کو برقرار رکھا گیا ہے۔

کریک ڈاؤن:

طارق اسماعیل ساگر کا یہ ناول ''کریک ڈاؤن'' ساگر پبلشرز سے شائع ہوا ہے اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے اس میں کشمیری مجاہدین کی جرات و بہادری کی داستان کو بیان گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار کمانڈر جہانگیر ہے۔ جو برف سے ڈھکی دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا مقبوضہ کشمیر پہنچتا ہے ہر کردار انتہائی جرات مند اور ذہن ہے اور اسی ذہانت کی وجہ سے بھارتی فوجیوں کے منصوبے خاک میں ملاتے ہوئے مجاہدین کو بچاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، آندھرا پردیش، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۳۵۸

۲۔ جگدش چندر ودھاون، کرشن چندر، شخصیت اور فن، نگار شات، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۶۱۱

۳۔ کرشن چندر، شکست، الحمراء پبلشنگ، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰

۴۔ ایضاً، ص ۸۶

۵۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۹۳

۷۔ ایضاً، ص ۵۲

۸۔ ایضاً، ص ۸۲ تا ۸۳

۹۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۹۔ ایضاً،ص۷۶

۲۰۔ ایضاً،ص۳۴

۲۱۔ ایضاً،ص۶۴

۲۲۔ ایضاً،ص۶۴ تا۶۵

۲۳۔ تحسین جعفری،کشمیری، کشمیر لوک روایات کے آئینے میں ،الفیصل پرنٹرز،لوک ورثہ، ۲۰۱۳ء،ص۱۹۹

۲۴۔ کرشن چندر، شکست، الحمراء پبلشنگ، اسلام آباد،۲۰۰۲ء،ص۶۷

۲۵۔ ایضاً،ص۴۵

۲۶۔ ایضاً،ص۲۷۸

۲۷۔ ایضاً،ص۴۷

۲۸۔ ایضاً،ص۱۶۷

۲۹۔ ایضاً،ص۱۶۷

۳۰۔ محمد اویس قرنی، کرشن چندر کی ذہنی تشکیل، ملاقات پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء،ص۲۷۸

۳۱۔ ایضاً،ص۲۹

۳۲۔ ایضاً،ص۵۵

۳۳۔ ایضاً،ص۵۵

۳۴۔ تحسین جعفری،کاشمیری، کشمیری لوک روایات کے آئینے میں ،الفیصل پرنٹرز،لوک ورثہ، ۲۰۱۳ء،ص۱۸۴

۳۵۔ کرشن چندر، شکست، الحمراء پبلشنگ، اسلام آباد،۲۰۰۲ء،ص۱۰۳

۳۶۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر،عزیز احمد،ادب ، تاریخ اور تہذیب ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء،ص

۲۴۲-۲۴۳

۳۷۔ سلیمان اطہر جاوید، عزیز احمد کی ناول نگاری، نئی دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۶ء، ص ۳۵

۳۸۔ انور سدید، نیرنگ خیال، جلد ۵۹، شمارہ ۶۵۹-۶۵۸، راولپنڈی ۱۹۸۲ء، ص ۲۷۲

۳۹۔ عقیلہ بشیر، ڈاکٹر، عزیز احمد کے ناولوں میں عورت کا جنسی اور رومانوی پہلو اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاؤالدین زکریا۔ یونیورسٹی ملتان، ص ۳۶۰

۴۰۔ عزیز احمد، عزیز احمد کے چار ناول، گریز، ہوس، ایسی بلندی ایسی پستی، آگ، الحمد پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۶ء، ص، ۴۹۶

۴۱۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، آندھرا پردیش، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۳۵۶

۴۲۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، سپر پرنٹرز ساؤتھ انارکلی دہلی، جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء، ص ۳۷۳

۴۳۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، آندھرا پردیش، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۲۴۶

۴۴۔ محمد اشرف ٹاک، ولی محمد اسیر کشتواڑی، ماہنامہ شیرازہ، سرینگر، کشمیر، جلد نمبر ۴۵، شمارہ نمبر ۸ تا ۱۱، سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ص ۴۶۱

۴۵۔ عزیز احمد، ڈاکٹر، عزیز احمد کے چار ناول، آگ، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص، ۳۹۵

۴۶۔ عزیز احمد، ڈاکٹر، عزیز احمد کے چار ناول، آگ، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص، ۳۹۷

۴۷۔ عزیز احمد، ڈاکٹر، عزیز احمد کے چار ناول، آگ، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص، ۳۹۷

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۹۸

۴۹۔ محمد اشرف ٹاک، ولی محمد، اسیر کشتوارڑی، ماہنامہ شیرازہ، سرینگر، کشمیر، جلد نمبر ۴۵، شمارہ نمبر ۸ تا 11، سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ص ۴۶۹-۴۶۸

۵۰۔ محمد اشرف ٹاک، ولی محمد، اسیر کشتوارڑی، ماہنامہ شیرازہ ،سرینگر، کشمیر، جلد نمبر ۴۵, شمارہ نمبر ۸ تا 11, سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ص ۴۶۵-۴۶۶

۵۱۔ ایضاً، ص، ۵۲۳

۵۲۔ ایضاً، ص، ۴۳۸

۵۳۔ ایضاً، ص، ۴۶۵

۵۴۔ ایضاً، ص، ۴۷۴

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۹۸-۴۹۹

۵۶۔ عزیز احمد، ڈاکٹر، عزیز احمد کے چار ناول، آگ، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص، ۵۷۳

۵۷۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، عزیز احمد، ادب تاریخ اور تہذیب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۵۷۳

۵۸۔ ایضاً، ص ۵۷۷

۵۹۔ ایضاً، ص ۵۷۷

۶۰۔ ایضاً، ص ۵۷۸-۵۷۹

۶۱۔ عزیز احمد، ڈاکٹر، عزیز احمد کے چار ناول، آگ، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص، ۴۰۴

۶۲۔ تحسین جعفری، کاشمیری، کشمیر لوک روایات کے آئینے میں، الفیصل پرنٹرز، لوک ورثہ، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۷

۶۳۔ عزیز احمد، ڈاکٹر، عزیز احمد کے چار ناول، آگ، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص، ۴۶۱

۶۴۔ ایضاً، ص، ۴۶۱

۶۵۔ ایضاً، ص، ۴۰۷

۶۶۔ ایضاً، ص، ۴۰۶

۶۷۔ تحسین جعفری، کاشمیری، کشمیر لوک روایات کے آئینے میں، الفیصل پرنٹرز، لوک ورثہ،

۲۰۱۳ء،ص۱۴۳

۶۸۔ ایضاً،ص،۱۴۴

۶۹۔ ایضاً،ص،۵۲۵

۷۰۔ ایضاً،ص،۴۳۳

۷۱۔ ایضاً،ص،۴۶۸

۷۲۔ ایضاً،ص،۵۲۶-۵۲۵

۷۳۔ تحسین جعفری، کاشمیری، کشمیر لوک روایات کے آئینے میں ،الفیصل پرنٹرز،لوک ورثہ، ۲۰۱۳ء،ص۱۹۰

۷۴۔ عزیز احمد، ڈاکٹر،عزیز احمد کے چار ناول، آگ، لاہور،۲۰۱۶ء،ص،۱۸۲

۷۵۔ ایضاً،ص،۱۸۲

۷۶۔ ایضاً،ص،۱۸۳

۷۷۔ تحسین جعفری، کاشمیری، کشمیر لوک روایات کے آئینے میں،الفیصل پرنٹرز،لوک ورثہ، ۲۰۱۳ء،ص۱۸۴

۷۸۔ ایضاً،ص۱۸۵

۷۹۔ ایضاً،ص۱۸۶

۸۰۔ ایضاً،ص۲۰۲

۸۱۔ محمد حسن،حسرت، بلستان تہذیب و ثقافت، ٹی ایس پرنٹرز، راولپنڈی، ۱۹۹۵ء،ص۲۰۲

باب سوم

''آگ اور شکست میں معاشی و معاشرتی تضادات کی عکاسی''

ا قدیم ہندوستان اور قدیم کشمیر کی معاشی صورت حال

i۔ قدیم ہندوستان کی معیشت

ii۔ کشمیر کی معاشی صورت حال

ب آگ میں پیش کردہ معاشی منظر نامہ

ج آگ میں پیش کردہ معاشرتی منظر نامہ

د شکست میں پیش کردہ معاشی منظر نامہ

ہ شکست میں پیش کردہ معاشرتی منظر نامہ

ی آگ اور شکست میں معاشی و معاشرتی اختلافات اور اشتراکات

i۔ معاشی اختلافات و اشتراکات

ii۔ معاشرتی اختلافات و اشتراکات

ا کشمیر کی معاشی صورت حال: تاریخ کے آئینے میں

i۔ قدیم ہندوستان کی معیشت

قدیم ہندوستان ایک براعظم تھا اس کا ہر خطہ زراعت کی نعمت سے مالا مال تھا۔ طرح طرح کی پیداوار ہوتی تھی۔ ہر خطہ کسی نہ کسی چیز کو پیدا کرنے میں دوسرے سے نمایاں تھا۔ ہندوستان کی زمین بہت زرخیز تھی۔ کہیں گیہوں ہیں تو کہیں چاول، کہیں کپاس ہے تو کہیں کچھ اور، جگہ جگہ کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک زرعی ملک تھا۔ صنعت وحرفت سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ معیشت کا تمام دارومدار زرعی اشیاء پر تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ضروریات زندگی کی ساری چیزیں تیار ہوتی تھیں۔ کیونکہ اس زمانے میں تجارت اتنی وسیع نہیں تھی۔ ہندوستان کے ہر گاؤں میں مٹی کے برتن بنائے جاتے تھے۔ لوہار اور سنار بھی اپنا اپنا کام کرتے تھے۔

خواجہ عبدالمجید اپنی کتاب ہندوستان کی اقتصادی تاریخ میں اس حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں:

> یہاں کی بنائی گئی چیزیں ایک زمانہ میں یورپ اپنی آنکھوں پر رکھتا تھا۔ ہندو عہد میں رومی یہاں کا مال لے جاتے تھے۔ اور اپنی سلطنت میں فروخت کرتے تھے۔ ہندوستان جواہرات کی کان تھا۔ جن تجار کے تذکرے ملتے ہیں۔ اگرچہ وہ ہندو عہد کے نہیں ہیں۔ یہ سب جواہرات کے تاجر ہیں!

ہندوستان کی زیادہ تر تجارت خشکی کے راستے ہوتی تھی بہت کم تجارت بحری راستوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ اس وقت ہندوستان سے جو اہم چیزیں دوسروں ملکوں کو جاتی تھیں ان میں سونا، چاندی، جواہرات، روئی اور صنعتیں چیزیں بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی چیز جو ہندوستان سے باہر جاتی تھی وہ تھا نمک جو کہ چین کی طرف سے جاتا تھا۔ وسط ایشیا سے یہاں اعلیٰ قسم کا اونی کپڑا، مشک، عنبر، موتی، ضروری ادویہ اور خشک میوے منگوائے جاتے تھے۔ ہندوستان میں بسنے والے لوگ ہتھیار بھی بناتے تھے جو کہ وسطی ایشائی راستوں کے علاوہ دنیا بھر میں مشہور تھے۔ لیکن ان میں کچھ پر یہاں کے کاریگروں کو بہت زیادہ مہارت تھی ان ہتھیاروں کی بھی تجارت ہوتی تھی کچھ یہاں سے وسطی ایشیا کو بھیجے جاتے تھے اور کچھ منگوائے جاتے تھے۔ ملکی معیشت میں اس شعبے کا بھی اہم کردار تھا۔ ہندوستان سے گرم مصالہ بھی دوسرے ممالک کو بھیجا جاتا اور زرمبادلہ کمایا جاتا تھا کیونکہ یہ صرف برصغیر میں ہوتا تھا۔ لوگ جانور اور

مرغیاں پالتے اوران سے اپنے گزراوقات کرتے۔ ہندوستان رنگ پیدا کرنے والا بڑا ملک تھا یہاں سے رنگ روم اور دوسرے ممالک کو بھیجا جاتا۔ پھل، گھریلو صنعتیں، کاشت کاری اور مقامی طور پر غلے کا کاروبار اہم تھا۔ الك گھوش اپنی کتاب ہندوستانی معیشت میں لکھتا ہے کہ:

> ہندوستان کی جدید صنعتوں کی ترقی چائے، کافی، اور جوٹ جیسی برطانوی باغاتی صنعتوں سے شروع ہوئی۔ ان صنعتوں میں بڑا نفع تھا جس کا ایک حصہ برطانیہ بھیج دیا جاتا تھا اور باقی انھیں صنعتوں پر دوبارہ لگا دیا جاتا تھا[۲]

اسی حوالے سے ڈی ڈی کوسمبی اپنی کتاب قدیم ہندوستان تہذیب و ثقافت میں کچھ یوں لکھتے ہیں:

> مرد بھیڑوں کی دیکھ بھال کرتے اور انہیں چراتے ہیں۔ کہ عورتیں براہ راست اپنے چند برتنوں، خیموں اور بچوں کو بار بردار ٹٹوؤں پر لاد کر اگلی قیام گاہ پر پہنچ جاتی ہیں۔ ڈھنگ اب تو کھیتی باڑی کے لواحق میں شامل ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب ان کی غذا کا بڑا ذریعہ بھیڑ کا گوشت یا جنگلی پیداوار جمع کرنا نہیں بلکہ اناج (یا رقم) ہے جو کسان ان کو دیتا ہے۔ جس کی زمین پر معاہدے کے مطابق دو یا تین رات تک وہ اپنی بھیڑوں کو باڑے میں بند رکھتے ہیں۔ بھیڑوں کے فضلے سے زمین زرخیز ہوتی ہے۔ اور پیداوار بڑھتی ہے[۳]

لیکن اس وقت ہندوستان نے اگر مار کھائی اور دوسروں ملکوں سے پیچھے رہا تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے تاجر دوسرے ملکوں میں بہت کم جاتے تھے اور دوسروں ممالک کے تاجر بہت بڑی تعداد میں آتے تھے۔ ہم ملک سے باہر جانا ناپسند کرتے تھے۔ یہ ہماری خصلت میں کچھ ایسی راسخ ہوئی۔ کہ مذہب میں بھی داخل ہو گئی۔ اور سمندر پار جانا بہت ہی غیر ضروری تصور ہونے لگا۔ اس سے ہماری تجارت کو بہت بڑا دھچکا لگا کیونکہ دوسرے ہمارے ملک کی بنائی ہوئی چیزیں جس قیمت پر مرضی بیچیں ہمارے سے وہ کوڑیوں کے بھاؤں لیں۔ وجہ یہ کہ ہم نے کبھی دوسرے ملکوں میں جانا گوارا نہیں کیا تھا۔ ہمیں وہاں کی منڈیوں اور حالات کا اندازہ ہی نہیں تھا۔

ii۔ کشمیر کی معاشی حالت:

کشمیر بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ جنگلات کے طویل قطعات، چراگاہیں، سیل آوردہ زمین اور پانی کی فراوانی زرعی معاشیات کو برقرار رکھے ہوئے تھی۔ پیداوار کا بڑا ذریعہ زمین تھی زراعت کے اوزار بہت سیدھے سادے اور بہت کم تھے۔ ان اوزاروں میں لکڑی کا ہل، لوہے کی پھالی، لکڑی کی موگری اور بیلوں کی ایک جوڑی شامل تھی۔ مٹی کے ڈھیلے توڑنے کے کیلئے بیلچہ، زمین نرم کرنے کیلئے ہلکی سی کدال اور شالی کو ٹنے کیلئے موسل اور اکھلی بھی اوزار زراعت میں سے تھے۔

زرعی زمین عام طور پر چشموں اور نہروں کے ذریعے سیراب کی جاتی تھی۔ جو کہ پہاڑی ندی نالوں، اور چشموں سے نکلتے تھے۔ کشمیر کی جغرافیائی پوزیشن اور طبعی ساخت نے آب پاشی کو آسان بنا دیا تھا۔ مجموعی طور پر زندگی آسان اور سادہ تھی۔ معمول کے حالات میں اور بہتر انتظام کی صورت میں کشمیری کسان قانع ترین آدمی رہا ہے۔ وہ خود کفیل اور سخت زندگی گزارنے والے تھے۔

وہ اس ضرب المثل پر ایمان رکھتے تھے۔ کہ ''جو بوئے گا وہی کاٹے گا'' ان میں کوئی شک نہیں کہ جھنجھوڑ دینے والی سیاسی تبدیلیاں اسے قسمت کا قائل بناتی رہی ہیں۔ وہ زندگی کے دکھوں اور مصیبتوں کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرتا رہا ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ زندگی کے مصائب اور ملک کی طبعی ساخت نے اسے اداس، تنہائی پسند، شکی تو ہم پرستی، خود نما اور بزدل بھی بنایا۔ عام حالات میں وہ زندہ دل خوش طبع اور حاضر جواب رہا ہے۔ اس کی مسکراہٹیں اہل دہلی و اہل کابل کی مسکراہٹوں سے بڑھ کر تھیں۔ وہ اپنی ذات سے اور ماحول سے سمجھوتہ کر لینے کی استعداد کا مالک تھا۔

پہاڑوں کے قدرتی مناظر کے درمیان میں گھنے پیڑوں، ہرے بھرے کھیتوں اور پاس ہی سے بہنے والی نہر کے کنارے واقع ہونے کے سبب کشمیری گاؤں اقتصادی امور میں خود کفیل رہا ہے۔ کام کرنے والوں کے مخصوص گروپوں میں وہی ہم آہنگ تعاون رہا ہے۔ جو ہمیں برصغیر کے دیہات میں نظر آتا ہے۔ مرد، عورت، بڑھئی، جولاہا، لوہار، کمہار، موچی، دھوبی، چرواہا اور بقال نے جو دیہی اقتصادیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ب آگ میں پیش کردہ معاشی منظر نامہ:

آگ دراصل ایک کشمیری خاندان کی تین نسلوں کی کہانی ہے۔ ناول نگار اس میں کشمیری زندگی کو اپنا موضوع بناتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ اس وقت کشمیر میں کیا حالات چل رہے تھے۔ معیشت اور معاشرت کیسی تھی اور کن مراحل

سے گزر رہی تھی۔لوگ کیسے زندگی گزار رہے تھے۔ان کے حالات کیسے تھے۔اوران کی مصروفیات کیا تھیں۔

کشمیر کی وادی ایک حسین وادی ہے اس میں ہر طرح کے لوگ آباد ہیں۔اور سینکڑوں سال سے آباد ہیں۔کئی سیاحوں اور تاجروں نے یہاں سے گزر کر تجارت کی ہے۔جب ابھی کشمیر کو الگ شناخت نہیں ملی تھی۔ ہمالہ کی فصیل کے پاس ایک درہ ہے جو کہ بہت پرانا ہے۔اس درے سے ہزاروں سال پہلے بھی انسان آتا جاتا تھا۔یہ شاہراہ یا شہہ رگ ایسی تھی جو کشن خاندان کی شہنشات کو جو ہمالیہ کے گھوڑے پر سوار تھی، رگ جان کی طرح مربوط رکھتی تھی۔یہ وہ راستہ تھا جہاں سے انسان آئے، مہاجنی نظام آیا، سامراج آئے، جراثیم آئے، قالین آئے، نمدے آئے، مذاہب آئے۔تعصبات آئے۔یہاں تک کہ وہ سب کچھ آیا جو کہ انسان کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔

عزیز احمد اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ:

> قافلے میں سب ہی طرح کے کیڑے تھے۔یارقندری، نمدوں کے سوداگر، تنگ و تاریک مکانوں میں رہنے والے، جن میں چھت میں ایک چھوٹے سے سوراخ کے سوا دھوئیں کے باہر جانے یا ہوا کے اندر آنے کا کوئی راستہ نہ تھا، تاجیک، جن کے بانکے، لباس آتشک کے لباس کو چھپا نہ سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے یہاں عورتوں کو بہت آزادی تھی[۴]

کیونکہ بہت زیادہ لوگ تجارت کرتے تھے اور ویسے بھی کشمیر ایک خوبصورت جگہ ہے۔اور یہاں کا مال جو کہ ہاتھ سے تیار ہوتا تھا بہت ہی مشہور تھا پوری دنیا سے لوگ آتے تھے۔جیسا کہ انگریز، درد، تاجیک، ترکمان، قارق، یار قندی اور ارمجھ وغیرہ وغیرہ۔انگریز عام طور پر جب سردی میں اضافہ ہوتا تو واپس چلے جاتے۔بہت سے کشمیری بھی تجارت کے پیشے سے وابستہ تھے۔جیسا کہ عزیز احمد اپنے ناول میں اس کا ذکر کچھ اس انداز میں کرتے ہے۔

> قافلے میں کشمیری بھی تھے، زیادہ تر خواجہ بازارگاں، سرخیل سوداگراں، ملک التجار خواجہ غضنفر جو کے ملازمین، جو کشمیری تبت سے قیمتی پتھروں کی جڑاؤ انگوٹھیاں اور پہنچیاں، لداخ سے دوشالوں کا اون، ختن سے نافے، سمرقند اور بخارا اور اندجان سے قیمتی قالین، یارقند اور کاشغر سے نمدے، چین سے تبت کے راستے آئے ہوئے کاغذی نقش و نگار کے ظروف اور اسی طرح سی چیزیں لا رہے تھے[۵]

زوجی لا اور کشمیر کے دوسرے علاقے سردیوں میں برف سے ڈھک جاتے تھے جس کی وجہ سے بعض اوقات ان دنوں میں تجارت رک جاتی تھی۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ برف کے تودے تاجروں کے قافلوں پر گر پڑتے جس سے بعض اوقات انسانی جانوں کے ضیاع کی صورت میں نقصان اٹھانا پڑتا۔لیکن کاروباری لوگ اس پر زیادہ توجہ نہیں دیتے

تھے۔عزیز احمد ایک جگہ اپنے ناول میں اسی حوالے سے کچھ الفاظ اس صورت میں لکھتے ہیں:''کاروبار زیادہ اہم ہے۔خواہ کاروبار کے لیے سامان لانے میں ایک بلتی دولداخی اور تین کشمیری اولانش میں دب کے مر ہی کیوں نہ جائیں''[۲]

کشمیر کی معیشت میں سب سے زیادہ اہم کردار کشمیریوں کے ہاتھ سے بنائی ہوئی اشیا ہیں جن میں سرفہرست یہاں کے قالین اور شالیں ہیں۔لیکن خواجہ غضنفر جو بہت سے دوسرے ممالک سے مال منگواتا تھا اور اس سے بہت زیادہ منافع کماتا تھا۔خواجہ غضنفر کا شمار کشمیر کے بڑے تاجروں میں ہوتا ہے۔ان کے پاس بہت سی قسموں کے قالین جیسا کہ، کاشانی، شیرازی، بخاری، اندجانی، مشہدی اور کشمیری قالین ایسے ایسے ریشمی قالین جنہیں دنیا دیکھ کر دنگ رہ جائے۔ قالینوں کے علم کا جہاں تک تعلق ہے اس میں خواجہ غضنفر جو بہت ماہر تھا اور پھر اُسے اس پر بھی بہت کمال دسترس تھی کہ گاہک کو اپنی طرف متوجہ کیسے کرنا ہے۔اور اُسے چیز بیچنے کیسے ہے۔وہ ہندوستان کے طول وعرض سے تعلق رکھنے والے گاہکوں کے مزاج اور ضروریات کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ جب انگریز نے اپنی دو کمپنیاں میسرز مچل اینڈ کمپنی اور میسرز ہیڈ و اینڈ کمپنی کشمیر میں کھولیں اور وہ بڑے پیمانے پر قالین بنانے لگیں لیکن ان کی وجہ سے غضنفر جو کے کاروبار کو ذرا برابر بھی نقصان نہ ہوا۔

شروع شروع میں خواجہ صاحب بہترین قالین ان کمپنیوں سے خرید لیتے اور پھر آگے اپنے گاہکوں کو بیچتے۔لیکن پھر غضنفر جو نے ایک انگریز دوست کے مشورے سے قالین بافی میں قدم رکھا وہ اس طرح کہ جو کاریگر ان کمپنیوں میں کام کرتے وہ فرصت کے اوقات میں غضنفر جو کو سستے داموں بنا کے دیتے اور پھر ڈیزائن بھی لا دیتے جس کی وجہ سے غضنفر جو کا کاروبار بہت کامیابی سے چلنے لگا۔

عزیز احمد ناول میں لکھتے ہیں کہ:

> قالین کے علاوہ خواجہ صاحب کے پاس یارقندی نمندوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔عموماً وہ ساری زمین کے سفید یا ہلکے نارنجی رنگ کے نمدے یارقند سے منگواتے اور اپنے انگریز گاہکوں سے مشورہ لے کر ان سے نئے نئے ''ڈیزائن'' بنوا کے، یہی نمدے بڑی کثرت سے بیچتے۔اسی زمانے میں ہاؤس بوٹوں کا تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اور ان کی مقبولیت بڑھنے لگی تھی۔خواجہ صاحب نے بہت سستے داموں تین چار پانچ روپیہ فی نمدہ، ہاؤس بوٹوں اور ڈونگوں کے لیے نمدے بیچنے شروع کیے اور اس طرح وہ نچلا متوسط طبقہ اور ادنیٰ طبقہ جو قالین خریدنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا، اس کے لیے نمدے کا رواج بڑھ گیا[۳]

کشمیر ایک ایسی جگہ کا نام ہے جہاں کے پتھر بھی بہت قیمتی ہیں۔ اور ان پہاڑوں کے اندر سے قیمتی اشیاء نکلتی ہیں۔ جیسا کہ نیلم، لاجورد، سینڈا سٹون اور تمام نیم قیمتی پتھر جو تبت لداخ اور ماوراء النہر میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ تبتی یا قوت ارزق اور لاجورد سے جڑی ہوئی انگوٹھیاں، بڑے بڑے فیروزے کشمیر کے سیاح ضرور خریدتے۔ ماوراء النہر کے چاندی کے پتھروں میں جڑے ہوئے زمرد کے ہار اور ایسے ہی دوسرے زیورات جنہیں بڑے بڑے لکھ پتی تاجروں کی بیویاں خرید کر آثار قدیمہ کے طور پر پہنتی ہیں۔ کشمیر کی معیشت میں سیر وسیاحت کا بہت اہم کردار ہے۔ پوری دنیا سے لوگ کشمیر آتے ان کے آنے سے نہ صرف سیر وسیاحت میں اضافہ ہوتا بلکہ تاجروں کی تجارت میں بھی اضافہ ہوتا۔ جب لوگ بہت زیادہ آنے لگے تو مقامی لوگوں نے ان کی رہائش پر توجہ دی کہ یہ ایک بہترین کاروبار ہے۔ لوگوں نے نئے مکانات اور کوٹھیاں بنانا شروع کیں۔ تو ان کی تعداد میں اور اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اسی حوالے عزیز احمد آگ میں لکھتے ہیں کہ:

> ہندوستان سے نئے گاہک آتے جاتے رہے اور خواجہ غضنفر جو اور زیادہ امیر ہوتے گئے۔ منشی باغ میں، راج باغ میں ہارون کے قریب انہوں نے نئی نئی کوٹھیاں بنوائیں۔ ان کوٹھیوں کے لیئے باقر جو سے ''نئے نئے ڈیزائن'' کا فرنیچر بنوایا اور ہر اپریل سے اکتوبر تک زیادہ تر انگریز، مگر ہر سال بڑھتی ہوئی تعداد میں پنجابیوں کے آنے کا تانتا بدھنے لگا۔ مری کشمیر روڈ پر نئی کمپنیوں کی لاریاں چلنے لگیں سری نگر میں جہلم کے بند کی صورت بدل گئی شکاروں میں اسپرنگ دار گدے اور صاف ستھری چین اسٹچنگ باگسبوں کا کام کے غلاف چڑھ گئے۔ ہاؤس بوٹ بہتے ہوئے بنگلے بن گئے ۸

عزیز احمد کارل مارکس کے معاشی نظریے کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کشمیر میں انسانوں اور جانوروں کی قربانی سے جو مال تیار ہوتا ہے اس کے عوض مزدور کو بہت کم آمدن ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس بڑا تاجر یہ مال برآمد کر کے ہزاروں اور لاکھوں کا منافع کماتا ہے۔ اسی حوالے سے ایک حوالہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے اپنی کتاب عزیز احمد ادب، تاریخ اور تہذیب میں کچھ اس طرح سے دیا ہے۔

> ابھی تک میک نائرے نے کارل مارکس کو پڑھا نہیں تھا۔ ہمیشہ کا شان مرد اور بدخشاں کے کاریگر ملک التجاروں کے لیے قالین اور ریشم بنتے رہیں گے۔ اور جو چیز وہ اپنی محنت سے بنا کے ایک سکہ میں بیچیں گے، وہ سری نگر میں دس سکوں، کلکتہ میں بیس سکوں میں اور لندن میں سو سکوں بکتی رہے گی ۹

معیشت کو نقصان پہنچانے میں بھی کشمیری کسی سے کم نہیں ہیں۔ عزیز اپنے ناول آگ میں ایک جگہ کشمیریوں

کے دھوکے کو کچھ اس طرح آشکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کشمیری لوگ کبھی کبھی بہت دھوکا دیتے ہیں۔ میں خود کشمیری ہوں اور مجھے شرم آتی ہے لیکن کبھی کبھی بعض لوگ بہت دھوکا دیتے ہیں۔ اور ساری قوم بدنام ہوتی ہے۔ جیسا کہ:

> اب سے چھ سات سال پہلے مجھے یاد ہے موسیو، میڈم ژی برٹ یہاں آئے تھے انہوں نے کسی فرانسیسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ادھر لداخ میں زمردوں کی کان شان ہے اور وہ ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے تھے۔ وہ ان ہانجیوں کی بدمعاشی سے واقف نہیں تھے۔ اس ہانجی نے کیا کیا اپنے ایک عزیز کو زوجی لا کے ذرا آگے مٹاین بھیج دیا اور اس کے ساتھ جرمنی کے بنے ہوئے نقلی زمرد بھی بھیج دیئے۔ جب دونوں فرانسیسی مٹاین پہنچے وہاں اس ہانجی کے عزیز نے کہا کہ صاحب یہ تو کتاب میں جھوٹ لکھا ہے۔ کہ یہاں قریب ہی کنکروں کی طرح زمرد ملتے ہیں۔ آپ خود اسے ڈھونڈ بیٹھے ہم گرمیوں میں پہاڑوں پر جا کے کھود کے زمرد نکالتے ہیں۔ اب تو پہاڑوں پر برف گرنے لگی ہے میرے پاس تھوڑے زمرد ہیں آپ خریدتے ہیں تو خرید لیجئے۔ موسیو پرودوں آپ تو جانتے ہیں ہمارا آپ کا دونوں کا جواہرات کا بیوپار ہے۔ کہ جرمنی سنتھیٹک جواہرات میں اور اصلی جواہرات میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا جب تک کوئی جوہری ان کو اچھی طرح نہ پرکھے۔ اور اس لیے ان جواہرات کو بہت سستا سمجھ کر موسیو ژی برٹ نے کوئی دس ہزار روپے کے مصنوعی زمرد اس سے خرید لیے[۱۰]

یہی وہ وجہ ہے جو معیشت کیلئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ جب تاجروں کا اعتماد مقامی لوگوں سے اٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ جب انہیں یہ یقین ہی نہیں ہوگا کہ جو چیز وہ خرید رہا ہے۔ اصلی ہے یا نقلی۔ سکندر جو کشمیر کا بہت بڑا تاجر تھا ایک دن اس نے اپنے دوستوں سے کشمیری اجنبی اور اس کے ساتھی کا تعارف کرایا۔ کہا جاتا ہے یہ کشمیری ہیولی، بوستین کا بہت بڑا تاجر صمدا تھا جو کہ میرا کدال کا ایک شہزادہ مشہور تھا۔ یہ میموں کو اعلیٰ بوستین کے کوٹ خود پہن کے اور چال چل کے عورتوں کو دکھلاتا۔ خواتین اسے دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ یہ بہت ہی ہوشیار تاجر تھا۔ یہ اپنے عجیب و غریب لباس، اپنی ہیئت سے لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کے دوسرے پوستین فروشوں سے بیس پچیس فی صد زیادہ وصول کر لیتا اور واویلا یہ کرتا کہ میں ان میموں سے رعایت کر کے لٹ گیا میری قیمت خرید بھی مجھے نہیں ملی۔ عزیز احمد اپنے ناول آگ میں کاروبار کو کوئی نقصان یا گزند نہیں پہنچے گی چاہے حالات جیسے بھی ہو جائیں جیسا کہ:

> شاباش۔ پنڈت، شاباش، دیکھئے خواجہ صاحب آپ اپنے دفتر کے کمیونسٹ کو تو بھول ہی گئے تھے۔ آپ نے اچھا انتظام کر لیا ہے۔ خواجہ صاحب روس کا حملہ ہو یا ہندوستان میں انقلاب ہو۔ آپ کے کاروبار کو گزند نہیں پہنچے گا۔ یہ ہمارا پنڈت جو شفارش کے لیے موجود ہے[۱۱]

زراعت کسی بھی ملک کیلئے بہت اہمیت کا حامل شعبہ ہوتا ہے۔ وادی کشمیر کا زیادہ رقبہ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ان پہاڑوں کے دامن میں زمین کو اکثر توی اور اُجھ نہروں سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اور وادی کشمیر میں بھی نہری آب و پاشی سے مدد لی جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر زمین بارانی ہے۔ جہاں کھیت بنائے گئے ہیں وہاں کوشش کی گئی ہے کہ ایسے کھیت بنائے جائیں تا کہ پانی زیادہ دیر تک کھیتوں میں ٹھہرا رہے۔ وادی کشمیر میں پھل جنگلی طور پر بکثرت اُگتے ہیں۔ جبکہ لداخ میں کہیں کہیں عام اناج اور معدودے چند پھل کاشت کیے جاتے ہیں۔ کاشت کاری یہاں کتنی بلندی پر اور کیسے مشکل سے کی جاتی ہے۔ اسی حوالے سے کشمیر و لداخ میں یاسر جواد کچھ یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> اناج کی کاشت بیشتر صورتوں میں بلند ترین مستقل آباد دیہات کے ساتھ ہم وقوع ہے۔ لیکن کاشت اناج کی حد مستقل آبادی کی حد سے نیچے رہتی ہے۔ ہمالیہ میں اناج کی کاشت ۱۱۸۰۰ فٹ سے زیادہ بلندی پر نہیں ہوتی، تبت میں ۱۴۷۰۰ اور کُن لُن میں ۱۳۷۰۰ فٹ کی بلندی پر۔ گھاس کی بلائی اوسط حد ہمالیہ میں ۱۵۴۰۰ فٹ، ورائے ہمالیہ علاقوں میں ۱۶۵۰۰ فٹ، کُن لُن میں ۱۴۸۰۰ فٹ سے نیچے ہے۔ ہمالیہ میں بوٹیاں ۱۵۲۰۰ فٹ، ورائے ہمالیہ علاقوں میں ۱۷۰۰۰ فٹ کی بلندی تک بھی اُگتی ہے۔ قراقرم سے شمال کی طرف سطح مرتفع میں ۱۶۹۰۵ فٹ کی بلندی تک بوٹیاں پائی گئی ہیں۔ اور اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے وہاں ان کی پیداوار عموماً گھاس سے عاری جگہوں پر بڑی مقدار میں ہوتی ہے[۱۲]

ڈاکٹر صابر آفاقی جھیلوں، پیداوار، پانی اور کشمیریوں کی ایجادات کا حیرت انگیز انکشاف کچھ یوں کرتے ہیں:

> ڈل جھیل، انچر جھیل اور ولر جھیل میں مشہور تیرنے والے جزیرے ہیں جو ذہین کشمیریوں کی حیرت انگیز ایجادات کا ایک نمونہ ہے۔ یہ جزیرے مقامی سرکنڈھے اور جھیلوں کی گھاس سے بنائے جاتے ہیں۔ ایسے جزیرے جنوبی امریکہ میں پیرو کی ٹیٹیکا جھیل کے علاوہ دنیا میں اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ کشمیری لوگ بہت بڑی مقدار میں کھیرا، خربوزہ اور سبزیاں ان جزیروں میں پیدا کرتے ہیں۔ یہاں کی ایک اور اہم آبی پیداوار مچھلی ہے۔ جو کثرت سے پائی جاتی ہے۔ یہ قدیم ترین ایام سے ہی اہم غذائی جنس شمار ہوتی ہے۔ وادی کی جھیلوں اور دریاؤں میں مچھلی کی گیارہ سے زیادہ اقسام ملتی ہیں[۱۳]

ریاست کشمیر کے جنگلات کا معیشت میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ ان لکڑیوں کی مرکزی اقتصادی قدر کا انحصار عمارات، ریلویز اور دیگر مقاصد کے لیے ان کی پیداوار کی مقدار پر ہوتا ہے۔ صرف عمارات اور فرنیچر سازی کیلئے لکڑی

کی سپلائی کو مدنظر نہیں رکھا جاتا بلکہ ایندھن کی سپلائی کیلئے صنعتوں اور گھریلوں استعمال کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ان کو کاٹ کر دس سے بیس فٹ کے شہتیر بنائے جاتے ہیں اور دریا میں بہا دیئے جاتے ہیں۔ یہ دریا میں بہتے ہوئے میدانی علاقے میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر ان کو ایک جگہ اکٹھا کر کے بیچ دیا جاتا ہے۔ لکڑی کے کام کے حوالے سے بھی کشمیری لوگ بہت ماہر ہیں اور بہت زیادہ زرمبادلہ کماتے ہیں۔

ڈاکٹر صابر آفاقی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

> کشمیر کے ترکھان عمدہ ونفیس کام کی وجہ سے مشہور ہیں۔ لکڑی کے کام کے بہترین نمونے شاہ ہمدان، بہاء الدین صاحب اور مدن صاحب کی مساجد میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ آرٹ مرزا حیدر دغلت (۱۵۴۳ء) اور ڈاکٹر برنیئر (۱۶۶۳ء) کی حیرت کا موجب بنا تھا۔ کشمیر کے ترکھانوں نے کشتی، شکارا، پرندہ، تخت روان اور خانم بندی بنانے نیز منبت کاری، الماری سازی کی صنعت میں بے حد شہرت حاصل کی ہے[۱۴]

کشمیر کی شال بافی کی صنعت میں پشمینہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جب ایک مرتبہ انگریزوں کے ساتھ تجارتی معاہدہ ہو رہا تھا تو اس وقت کشمیری تاجروں نے اس کی مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس معاہدے سے پشمینہ کے کاروبار کو بہت زیادہ نقصان پہنچے گا۔

کشمیر کی بنی ہوئی مصنوعات میں سے ہاتھ کی بنائی گئی شال کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ یہاں پر دو قسم کی شالیں تیار کی جاتی ہیں۔ کھڈی پر اور ہاتھ سے۔ شال باف کی آمدنی عموماً تین یا پانچ روپے دس آنے کے برابر بتائی جاتی ہے۔ شالوں کی تیاری میں استعمال ہونے والی اون دو قسم کی ہے۔ پالے گئے جانوروں کی اور جنگلی طور پر رہنے والے جانوروں کی پشم۔ مؤکر الذکر قسم ''اصلی تُس'' کہلاتی ہے۔ جو اون بکریوں سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ جنگ تھانگ، ترفان وغیرہ کے بلند خطوں میں چرتی ہیں۔

ڈاکٹر صابر آفاقی اس کے متعلق اپنی معلومات کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> زمانہ قبل تاریخ سے شال کی اون تبت اور لداخ سے درآمد کی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے دوران کشمیر نے ایک لاکھ اٹھائیس ہزار پونڈ سالانہ درآمد کی۔ عمدہ منقش شال کی وجہ سے کشمیر کو دنیا میں شہرت حاصل ہوئی[۱۵]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> شال کی اون کشمیر کے لیے ایک اہم اقتصادی وتجارتی جنس رہی ہے۔ اس وقت سے لے کر جب اون لداخ یا تبت میں خریدی جاتی اس وقت تک جب یہ جولاہے اور کشیدہ کار کے ہاتھوں عمدہ شال بن کر باہر آتی۔ تقریباً پندرہ مختلف خاندان جو اس کی بنائی کے مختلف کاموں سے متعلق ہوتے، اس سے روزی کماتے تھے[۱۶]

کشمیر کی شال بافی کی صنعت پر جتنا بھی چاہو لکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کشمیر کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کچھ لوگوں نے تو اسے ''سفید سونا'' کہا ہے۔ کیونکہ اس صنعت نے کشمیر کو چار دانگ عالم میں متعارف کرانے اور شہرت دلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نفع بخش صنعت نے پڑوس کے بڑے ممالک کو کشمیر کو کشمیر کی تسخر پر اکسایا ہے۔ اسی صنعت کے حوالے سے جی ایم میرا پنی کتاب جموں وکشمیر کی جغرافیائی حقیقتوں میں کچھ یوں لکھتے ہیں:

> شال بافی کی صنعت بہت پرانی ہے ماضی میں کشمیر کی شالیں بیرونی ممالک کو برآمد کی جاتی رہی ہیں۔ یورپ میں پہلی کشمیری شال نپولین کے زمانے میں پہنچی۔ بتایا جاتا ہے کہ نپولین مصر کی مہم کے دوران قاہرہ سے ایک کشمیری شال اپنی ملکہ جوزمین کے لیے تحفہ لے کر آیا تھا سر والٹر لارنس کے مطابق اس کے بعد کشمیری شال کو یورپ میں فیشن کا درجہ مل گیا[۱۷]

کشمیری شال کے علاوہ دستکاریوں، اناج، پھلوں، صنعتوں اور جنگلات کا معیشت کو بہتر کرنے میں بہت اہم کردار ہے۔ جیسا کہ پیپر ماشی کی صنعت، نمدہ سازی، گہہ سازی، بوٹیاں اور پٹو، کشیدہ کاری، ابریشم، کاغذ، دھات پر کنندہ کاری۔ لکڑی کا کام، پتھر اور اینٹ کا کام، کمہار اور لوہار کا کام، چین، تبت اور مرکزی ایشیا سے یہ لوگ چائے نافہ اور چینی کے برتن منگواتے۔ پوستین، قالین، نمدہ اور گھوڑے، یارقند اور کاشغر سے خریدتے، کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ (۱۶۲۲ء) میں نواب اعتقاد خان نے اپنی گورنری کے زمانے میں پان اور عمدہ قسم کا چاول برہان پور سے درآمد کیا تھا۔ کشمیر مغل حکومت سے پہلے جن چیزوں میں خود کفیل تھا اور جن چیزوں نے اس کی معیشت میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں شالیں، پشمی ملبوسات، کاغذ، پیپر ماشی کا سامان، زیرہ، دودھ کی پیداوار، تازہ اور خشک میوے، ٹوکرے، شہد اور جنگلی جڑی بوٹیاں وغیرہ۔

ج۔ آگ میں پیش کردہ معاشرتی منظر نامہ:

کشمیر کی قدرتی حیثیت انتہائی اہمیت کی حامل ہے، اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا کشمیر جسے سال کے اکثر

مہینے برف سے ڈھک کے رکھتے ہیں۔ دنیا بھر کی حسین وادیوں میں سے ایک ہے۔ صدیوں تک یہ قدرتی رکاوٹیں اسے بیرونی جارحیت سے محفوظ رکھتی رہی ہیں۔ مگر بعض اوقات یہی رکاوٹیں سنگین نتائج کی ذمہ دار بھی رہی ہیں۔ جیسا کہ یہ مواصلات اور ٹرانسپورٹ کی پرسکون و باقاعدہ روانی میں رکاوٹ بنتی رہی ہیں لیکن عوام الگ تھلگ رہے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ پہاڑوں کے اس پار کچھ بھی نہیں ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظر محدود اور ان کی زندگی بے جان اور افسردہ رہی۔ ان کے خیالات، روایات اور عقائد ان عمل و آرزو پر غالب رہے۔ وہ قدامت پسند اور تبدیلی کے دشمن رہے۔ وہ شفیق اور ہمدرد بادشاہوں کے جان نثار رہے۔ اور ظالم و جابر حکمرانوں سے متنفر اور بیزار رہے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی تاریخ اسلام میں ان کی معاشرت کے حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں:

> شدید سردی کے مہینوں کے دوران افرادی قوت کا ایک حصہ گھریلوں صنعتوں میں مصروف رہتا۔ جنوبی علاقوں میں امن کے زمانے میں جسمانی لحاظ سے مضبوط لوگوں کی اکثریت پنجاب اور اس کے آگے کی طرف مہاجرت کر جاتی تا کہ وہ سردی کی شدت سے محفوظ رہیں اور ضروریات زندگی بھی مُہیا ہوسکیں۔ ان لوگوں میں مزدور، ارہ کش، لسباطی، تاجر، زائر، صوفی اور عالم ہوتے، کبھی کبھی ہلاکت خیز کال، وبائی امراض اور جابر حکمران بھی مجبور کر دیتے کہ لوگ مہاجرت کر جائیں[۱۸]

کہا جاتا ہے یہ وہ عہد تھا جس میں سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں انسان بہت مشکل زندگی گزارنے پر مجبور تھا اس لیے وہ ہر وقت محنت مزدوری کرنے میں لگا رہتا تھا کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ اُسے اپنی جانیں بھی ضائع کرنا پڑیں کیونکہ بعض اوقات موسمی سختیاں بڑھ جاتیں اور بعض اوقات اُسے ذرائع آمدورفت مُیسر نہ ہوتے۔ لیکن وہ بدستور اپنے کام کو جاری رکھتا۔ کسی بھی معاشرے میں شادی بیاہ یا اس کی رسومات بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اور ان کا معاشرت سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ عزیز احمد کے ناول آگ میں بھی اسی طرح ایک شادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو کہ غضنفر جو کے بیٹے سکندر جو کی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب باپ کے حکم سے انکار ممکن نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 22 شعبان کو سکندر جو کا باقر جو کی بھتیجی سے نکاح ہوا اس نکاح کی تقریب میں بڑے بڑے سرخ کشمیری اور سمرقندی قالین بچھائے گئے تھے۔ دیواروں کو خوبصورت رنگ روغن سے سجایا گیا تھا۔ درمیان میں دولہا کشمیری ریشمی چغہ پہن کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور چاروں دیواروں کے ساتھ باقی باراتی اور مہمان بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے خوبصورت، کشمیری لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور شالیں اوڑھے ہوئے تھے۔

عزیز احمد اپنے ناول میں مزید لکھتے ہیں کہ ظہری صاحب کشمیری عقد کی محفلوں میں ایک عجیب متین وقار محسوس کرتے تھے انہی شرفاء کی وجہ سے جو کہ صدیوں سے دیواروں کے چاروں طرف گدوں کے سہارے بیٹھتے اور شالیں

اوڑھتے چلے آ رہے تھے۔

غضنفر کے گھرانے میں نہ تو کوئی اتنا فیشن ایبل تھا اور نہ باقر کے لیکن سکندر کی فیشن کے حوالے سے بات اپنی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ میرا کدل کے اس بار اس سے زیادہ فیشن ایبل اور کوئی نوجوان نہیں تھا۔ ہاں رام منشی باگ (باغ) میں کچھ پنجابی، ہندو، کچھ پنڈت اور کچھ باہر کے آئے ہوئے مسلمان فیشن اور لباس میں اس کے برابر لگتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد ''پرنس'' کہلانے لگا۔

لیکن دوسری طرف ایک عام کشمیری کی حالت یہ ہے کہ اُسے سردی اور گرمی کا احساس تک نہیں۔ دھوپ میں اس کا سردی گرمی کا ستایا ہوا چہرہ پسینے اور جلدی بیماریوں کے عرق سے چمک اٹھتا اور کہیں جائے پناہ نہ ملتی تو بارش میں اس کے کپڑے شرابور ہو جاتے۔ بہار اور جاڑوں میں اس کے کپڑوں سے دس سے پندرہ گز کے فاصلے تک تعفن کی بو آتی۔ اس کی میلی کشمیری ٹوپی اس کے سر پر منڈھی ہوئی جسم کی طرح میل سے داغ دار نظر آتی لیکن وہ یہ سوچتا کہ پیٹ بھرنے کے اس دنیا میں اس سے آسان ذریعے بھی تو ہوں گے۔ لیکن وہ ہے کہ کئی نسلوں سے اس کا یہی کام ہے۔ اب وہ ان تمام چیزوں اور جہلم کے گدلے پانی، اس کے شور اور اس کی الجھتی بے کل لہروں سے اتنا مانوس ہو گیا ہے۔ کہ اب یہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ لیکن وہ یہ سوچتا ہے۔ کہ جو اسے ملا ہے۔ وہ اس کے مقدر میں لکھا تھا اس لیے اب وہ اپنی قسمت پر راضی ہے۔ اب وہ پہاڑوں میں رہنے، گرتی مٹی اور پتھروں سے نہیں ڈرتا۔

کشمیر کے قدرتی حسن میں وہاں کے لوگوں کی طرف سے پھیلائی گئی گندگی کو تلاش کرنا اور اسے پیش کرنا عزیز احمد ہی کا کام تھا۔ اس طرح ہمیں کشمیر کے قدرتی حسن کے تحفظ کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ ناول آگ میں عزیز احمد نے جہاں کشمیر کی زندگی میں پھیلی ان گندگیوں کو پیش کیا ہے۔ وہیں زندگی کے بیان کے ساتھ انہوں نے وہاں کی تہذیبی و معاشرتی پہلوؤں کو بھی خوب اجاگر کیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کا رہن سہن لباس، بات چیت، طرز معاشرت شادی بیاہ کی تقاریب مہمان داری وغیرہ کی تفصیلات اس انداز سے ملتی ہیں کہ ہمیں ناول کے ذریعے سے کشمیری تہذیب اور معاشرت سے واقفیت حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اگر شادی بیاہ کی تقاریب کو دیکھا جائے تو سکندر جو کی شادی کے موقع پر کشمیری دعوت کی تفصیل کچھ یوں ملتی ہے:

> مہمانوں کے آگے بڑے بڑے سرخ دسترخوان بچھائے گئے۔ جن پر آداب و طعام اور فارسی اشعار چھپے ہوئے تھے اور نوکروں نے مہمانوں کے ہاتھ دھلائے جو چاروں دیواروں کا سہارا لگائے چاروں طرف بیٹھے تھے پھر دسترخوان پر چاولوں کے بڑے بڑے طبق رکھے گئے۔ کچھ مہمان دسترخوان کے

دوسرے طرف بیٹھ گئے، ایک ایک طبق چار چار آدمیوں کے لیئے تھا، چار جگہ کیا۔۔۔، شوربا اور بوٹیاں تھیں۔۔۔ مٹر کا شوربا'' آلو کا کورما، گوشتابا، کوفتے، مرچوں کا سرخ خورما، ترکاری کی ساگ اور آب گوشت، ہر طبق میں چار چار ہاتھوں کی انگلیاں بے تکلفی سے چاولوں اور گوشت اور خورے کو ایک کرتی جاتیں[۱۹]

میجر صاحب کو ایک اور شخص ذرا دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میجر صاحب نے اس کی طرف دیکھا وہ ذرا سانولے سے رنگ کا ایک گنوار کشمیری تھا۔ ماسیدہ اُون کا ایک لمبا سا کوٹ پہنے ہوئے تھا جس کا گلا کھلا ہوا تھا اور اس کے اوپر اس نے اپنے جسم کو ایک اس سے زیادہ میلے اور بدبودار موٹے کھردرے کمبل میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایک میلی چکٹ کشمیری ٹوپی تھی اور پیروں میں اسی کی جیسی کسی چیز کے جوتے۔ اس کا چہرہ لمبوترہ سا تھا۔ داڑھی خشخشی، ناک چوڑی اور پھیلی ہوئی۔ اور اس کا دہانہ کھلا ہوا تھا، جس میں بڑے لمبے لمبے زرد دانت ایک مسلسل مسکراہٹ کے عالم میں برابر جھانک رہے تھے۔ میجر صاحب کو اپنی طرف مخاطب دیکھ کے اس نے کہا کہ:'' جناب یہ یہاں کے پریم منسٹر کی کوٹھی ہے''[۲۰]

میجر صاحب نے ایک کشمیری سے پوچھا جناب تمہارا نام کیا ہے۔ اس نے کہا جناب میرا نام جمال دار ہے ہم گوجر لوگ ہیں ہمارے گاؤں کا نام شیوپورہ ہے۔ ہم ڈھور ڈنگر گائے بکریاں چراتے ہیں۔ گھاس چھیلتے اور نکالتے ہیں۔ اور دودھ بھی بیچتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں یہ جو بھیڑوں کی اون ہوتی ہے۔ اس سے کمبل اور کپڑے ہم خود بناتے ہیں۔ اس طرح کے غریب طبقے کے ساتھ کشمیر میں کیا سلوک ہوتا ہے۔ اور اس نچلے طبقے کے ساتھ امیر لوگ کس طرح پیش آتے ہیں۔ جمال دار میجر صاحب کے ساتھ کیسے پیش آیا۔ عزیز احمد لکھتے ہیں کہ:

رخصت ہوتے وقت جب میجر صاحب نے مصافحہ کے لیے ہاتھ پھیلایا تو جمال دار سمجھ نہ سکا۔ کیونکہ کشمیر کے متوسط طبقے کے مسلمانوں کو نچلے طبقے سے معاشرتی تعصب تو زیادہ نہیں لیکن وہ انہیں بالکل اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ جمال دار نے جھک کے میجر صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور السلام علیکم کہہ کے بڑھتی ہوئی تاریکی میں غائب ہو گیا[۲۱]

شعبانا کی داڑھی پر اب حنائی رنگ ہی غالب تھا۔ کالے کالے بال خال خال تھے۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں پر کسی جلدی مرض کے بعد پیپ اور ناخن کے کھرچنے کے نشانات تھے۔ لمبا کوٹ اور شلوار پہنے، ہاتھ میں چاندی کی گھڑی سجائے اس نے خواجہ صاحب سے پوچھا اور پھر میجر صاحب کی طرف دیکھا، مسکرایا۔ اور پھر کہنے لگا الحمدُ اللہ

الحمدُ اللہ میجر صاحب بھی مسلمان ہیں۔ حالانکہ ادھر مسلمان لوگ بہت کم آتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ماشا اللہ ماشا اللہ ہم مسلمان امیر لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ عزیز احمد اپنے ناول میں اسی حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں:۔

> خواجہ صاحب کی عنایت سے ہمارے پاس انگریز لوگ ادھر زیادہ آتا ہے۔ بس صاحب، میم صاحب، بیئر بھوت کمفرٹ، گڈ فڈ، ڈرائینگ روم، ڈائینگ روم، ٹو بیڈ روم، گڈ چھوٹا حاضری بڑا حاضری، گڈ ٹفن ڈنر، چیرٹیسکٹ، انگریز لوگ ادھر آیا۔ اس سے پہلے ہم جناور کے موافک تھا۔ ہم کو انگریز لوگ یہ شلوار صافہ، پنجابی ڈریس پہننا سکھایا۔ مگر ہمارا میجر صاحب ہمارا موافق مسلمان ہے۔ شکر الحمد اللہ، لا الہٰ الا اللہ محمد الرسول اللہ سب مسلمان بھائی بھائی ہے، چین وعرب ہمارا ہندوستان ہمارا اور ہندو ہے ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا[۲۲]

کشمیر میں اسلام چودھویں صدی کے آخر میں پہنچا تو اس نے آتے ہی معاشرے میں ایک بڑا فکری وعملی انقلاب برپا پیدا کیا۔ حالانکہ ہندوؤں کے زمانے میں یہاں کا معاشرہ چار ذاتوں میں تقسیم تھا۔ اسلام کے فروغ پاتے ہی یہاں مساوات کا نظام رائج ہوا۔ اس میں سب سے اہم کردار صوفیاء کا ہے۔ جنہوں نے طبقات کو مٹا کر اتحاد پیدا کیا۔ لیکن اس کے باوجود طبقاتی کشمکش، جاگیردار اور مراعات یافتہ طبقہ پھر بھی قائم رہا۔ عزیز احمد کے ناول آگ میں بھی اس حوالے سے کچھ یوں ذکر کیا گیا ہے: ''یہ ذات پات کی تفریق کا اثر ہے اور ان دور دراز وادیوں میں ابھی تک باقی ہے ہمارا آپ کا کھانا ان کے لیے ناپاک ہے۔ مذہب کی تبدیلی کے بعد بھی وہی اثر ان میں ابھی تک باقی ہے''[۲۳]

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ فیوڈل سردار بڑی بڑی زمینوں کے مالک ہوتے اور حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہتے۔ یہ امراء علم وادب کے بہت شیدائی تھے یہ مذہبی عمارتیں بنواتے اور ہر وقت ریشہ دوانیوں میں سرگرم رہتے۔ اقتدار کے حصول کی رسہ کشی ہمیشہ چلتی رہتی جس میں تین طبقات بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ علماء، مساوات اور صوفیا۔

جی ایم میرا پنی کتاب کشور کشمیر میں اسلام کی ابتداء اس کی سیاسی، ذہنی اور روحانی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> کشمیر میں اسلام کا ظہور ایک رحمت بن کر آیا اور سیاسی، ذہنی اور روحانی طور پر ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ جس نے بستی میں گرے ہوئے کشمیری عوام کے ذہنوں کو بدل کر رکھ دیا۔ زندگی کے ساتھ ان کا رویہ ہی بدل کر رہ گیا اور وہ خود کو دوبارہ انسانوں میں شمار کرنے لگے۔ اگر چودھویں صدی میں

کشمیریوں نے اسلام قبول نہ کیا ہوتا تو نہ معلوم ان کا حشر کیا ہوتا۔ شاید وہ بالکل نیست و نابود ہو گئے ہوتے۔ اس انقلاب کے ساتھ دراصل کشمیریوں نے نیا جنم لیا اور ان کی وہ صلاحتیں دوبارہ بیدار ہو گئیں جو نااہل اور ظالم راجاؤں کے ظلم اور جبر کی وجہ سے زائل ہو چکی تھیں۔ کشمیری قوم نے نئے دور کا استقبال نہایت ذوق و شوق سے کیا اور ایک نئی تہذیب سے ان کا رابطہ اس طرح بڑھا کہ علوم و فنون، صنعت، دستکاری غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں انہوں نے جوہر دکھانا شروع کر دیئے۔ اسلام نے کشمیر کی مردہ روح کو نئی زندگی بخشی ہے۲۴

اگر سیاست کی طرف دیکھا جائے تو عبدالکریم خواجہ نے کہا پنڈت شیونرائن جی۔ آپ کو نہیں معلوم سی۔ پی میں کانگریس وزارت کے زمانے میں مسلمانوں پر کتنے ظلم ڈھائے گئے۔ کہا جاتا ہے گاؤں کے گاؤں اُجاڑ دیئے گئے۔ اور برباد کر دیئے گئے۔ اس کے جواب میں پنڈت شیونرائن نے کہا بھائی صاحب ظلم تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو بنگال، پنجاب، آسام اور سندھ میں ہندوؤں پر بہت ظلم ہوا۔ عزیز احمد اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ: ''میجر صاحب نے پوچھا یہ خواجہ عبدالکریم کون ہیں۔ یہ یہاں اسمبلی کے ممبر ہیں۔ مسلم لیگ کے خیالات رکھتے ہیں'' ۲۵

اس وقت کشمیر میں کیا حالات تھے اور مسلمانوں کو کن مشکلات کا سامنا تھا اور لوگ کس حد تک پولیس اور فوج سے ڈرتے تھے۔ ناول آگ میں ایک مسلمان میجر کے آنے کے بعد اسے کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے:۔

پہلے جناب کشمیر میں رعایا کا حال پوچھتا تھا نا تو ہم ڈرتا تھا۔ ہم سمجھا تھا شاید جناب مسلمان ہو گا۔ شاید نہیں ہو گا؟ ادھر تھوڑے سال پہلے بہت خونریزی قتل ہوا تھا۔ اس سے پہلے ادھر شہر میں مسجد بند تھا۔ ہم مسجد کھلوایا، اب نماز ہوتا ہے اور کوئی پنڈت جا کے پولیس کو کہہ دیتا تھا کہ یہ گائے کو مارا ہے۔ اور جناب ادھر اس کی سخت سزا ہے۔ پولیس بہت ظالم ہے۔ پھر جناب ادھر ہم کو سزا ہو جاتا تھا۔ بہت بے گناہ آدمی ایسا سزا پایا۔ پھر جناب ادھر کانفرنس نے بغاوت کیا تھا نا۔ پھر سے پنڈت لوگوں کا زور ذرا کم ہو گیا۔ جناب ادھر پہلے ہمارا عورت لوگ کو یہ پولیس اور دوسرا افسر لوگ بلاتا تھا۔ خراب کرتا تھا۔ جناب ہم دیوس کے موافق تھا۔ ہم بزدل تھا۔ اب جناب ان لوگوں کا اتنا ہمت نہیں ہے۲۶

کشمیر میں حکمران کب اور کیسے آئے اور کب سے اس کا آغاز ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں مسلمانوں نے جب سندھ کو فتح کیا تو اس لشکر میں عرب و عجم کے مسلمان شامل تھے۔ یہی سے اس کی ابتدا

ہوئی۔ جب فارسی زبان متعارف ہونے لگی۔ یہ غالباً ۱۳۲۵ء کا عہد تھا جب کشمیر کا بودھو راجہ رنچن مسلمان ہوا اور اس نے صدرالدین کا لقب اختیار کیا۔ اس تاریخی واقع کے چند سال بعد ۱۳۳۰ء میں شاہ میری خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔

ڈاکٹر صابر آفاقی اپنی کتاب آئینہ کشمیر میں رقم طراز ہیں:

> شاہ میری دور حکومت میں ایران و ترکستان سے آنے والے سینکڑوں علماء وصوفیا کی بدولت کشمیر میں ایک فکری انقلاب برپا ہوا۔ مسلمان نیا تمدن، نیا نظام معاشرت اور نئی صنعتیں ہمراہ لائے۔ ہجری تقویم کا رواج ہوا۔ کشمیر اور اس کے اطراف پر ۱۳۲۵ء سے لے کر ۱۸۱۹ء تک چار مسلمان خاندان۔ شاہ میری، چک، مغل اور افغانی حکومت کرتے رہے۔ اس پانچ صد سالہ عہد حکومت میں یہاں اسلامی تہذیب وتمدن علم وادب، فکر وفلسفہ اور فن وہنر کو فروغ ملا۔[۲]

اس وقت کشمیر جن حالات سے گزر رہا تھا یا اُسے جن مشکلات کا سامنا تھا وہ تھی جہالت کیونکہ تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ جاگیرداری نظام رائج تھا۔ سلطان ہی مطلق العنان ہوتا اور اسے ہی قانون سازی کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ خود سپاہ سالار ہوتا اور اپیل کی سب سے بڑی عدالت بھی وہی ہوتا۔

لیکن آہستہ آہستہ یہ حالات اس نہج تک پہنچتے دکھائی دیئے کہ اسے انقلاب فرانس سے تشبیہ دی جانے لگی۔ مطلب لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ صورت حال اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ براہ راست لوٹ مار کا الزام مسلمان اور پنڈت ایک دوسرے کو دینے لگے جس سے کچھ لوگوں نے یہاں تک سوچنا شروع کر دیا کہ رام رام کیا بھائی کا بھائی دشمن ہے۔ کیونکہ یہ شروعات تھی تو اسے کچھ لوگوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کچھ لوگوں نے اسے انتشار کا نام دیا۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ صرف چند لوگ ہیں جو سیاست کر رہے ہیں اور لیڈر بننے کا شوق رکھتے ہیں۔ اور ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ ہماری رعایا سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کر رہی ہے۔ اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ لیکن معاملہ اتنا سادہ ہرگز نہیں تھا جیسا کہ ظاہر ہے۔ موسیو پرودوں نے جیب سے ایک کاغذ نکالا یہ اصل میں سول اینڈ ملٹری گزٹ تھا جس میں سر محمد اقبال کا ایک بیان چھپا ہوا تھا۔ اس نے کہا جو میں نے سنا ہے یہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ سب جھوٹ ہو یہ کہہ کر اس نے اقبال کا ۷ جون ۱۹۳۳ء کا بیان سنانا شروع کر دیا:۔

حکومت کشمیر کے تازہ ترین کمیونکے کا بیان ہے کہ سری نگر میں امن ہے لیکن باوثوق ذرائع سے مجھ تک جو خبر پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ حالت اتنی اچھی نہیں جتنی سرکار بتا رہی ہے مجھے اندیشہ ہے کہ حکومت کشمیر ہی کے اندر ایسے اثرات کام

کر رہے ہیں جن کا رجحان کرنل کال ون کی پالیسیوں کو شکست دینے کا ہے۔

کشمیر کو اگر تاریخی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اس کا باقاعدہ آغاز ۱۸۴۶ء کے معاہدہ امرتسر سے کیا جاتا ہے۔ جب کشمیر سکھوں سے ڈوگروں کو منتقل ہوا۔ اس سے پہلے مسلمان اور سکھ مختلف ادوار میں حکمران رہے جن میں سکھوں کی حکمرانی کا زمانہ بہت خطرناک اور ظالمانہ تھا۔ سکھوں نے تقریباً ۲۷ سال تک کشمیر پر حکومت کی اور ظلم کے پہاڑ توڑے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی لکھتے ہیں کہ:

> ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے سکھ حکومت کا خاتمہ کر کے جموں و کشمیر کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا پھر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ امرتسر کے تحت یہ ملک ۷۵ لاکھ نانک شاہی سکون کے بدلے گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا اس طرح یہ خطہ سکھوں کے قبضہ سے نکل کر ڈوگروں کے ہاتھوں میں چلا گیا[۲۸]

یہی سے اصل سیاست کا آغاز ہوتا ہے۔ جب انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے ریاستوں کے متعلق اجتماعی اور انفرادی معاہدے کیے۔ اس وقت یہ معاہدے ہر ریاست کی طاقت اور حیثیت کے مطابق ہوتے تھے۔

راجگان ڈوگرہ کے متعلق اگر مختصر بیان کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ کہا جاتا ہے یہ جموں کے قدیم باشندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تاریخ قبل مسیح سے تاریخوں میں محفوظ ہے۔ اس خاندان کا شجرہ نسب ۱۶۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا بانی گلاب سنگھ ڈوگرہ ۱۷۹۲ء جموں میں پیدا ہو۔ بڑے ہو کر اس نے اپنی بہادری کی وجہ سے شہرت پائی۔ جب اس کی شہرت رجیت سنگھ کے دربار تک پہنچی تو اس نے اسے اپنا ملازم رکھ لیا اس نے کئی فتوحات حاصل کیں۔ لیکن پھر ایسا وقت بھی آیا جب ۱۸۳۹ء میں رجیت سنگھ فوت ہو گیا۔ تو اس کے ساتھ ہی حکومت خالصہ بدنظمی کا شکار ہو گئی۔ اور پھر کئی سکھ کشمیر پر حکمران رہے۔ لیکن جب خالصہ فوج اور انگریزوں میں لڑائی شروع ہوئی تو اس کو ختم کروانے کے لیے گلاب سنگھ درمیان میں آئے اور دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرائی اور جموں کشمیر بطور انعام لینے کی شرط رکھی۔ اس وقت جو معاہدہ ہوا اس کو ایم اے خان کشمیر تاریخ کے آئینے میں کے اندر کچھ یوں لکھتے ہیں۔

> انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ ہوا۔ اس کی 15 دفعات تھیں۔ دفعہ 12 میں جموں کشمیر کے متعلق انگریزوں نے سکھوں سے لکھوالیا کہ اسے مہاراجہ گلاب سنگھ کے سپرد کیا

جائے گا۔ چنانچہ اس معاہدے کی روشنی میں ۱۴ مارچ ۱۸۴۶ء کا معاہدہ انگریزوں اور گلاب سنگھ کے درمیان ہوا یوں گلاب سنگھ ریاست جموں کشمیر کا آزاد و خود مختار حکمران بن گیا ۲۹

جموں کشمیر کی ریاست ایک ایسی ریاست ہے۔ جس کی پوری تاریخ آزادی کی تاریخ ہے۔ زمانہ قدیم میں مختلف ریاستوں پر مختلف اتار چڑھاؤ آئے لیکن بحیثیت مجموعی یہ ریاست ہندوستان کے باقی علاقوں کی نسبت آزاد رہی۔ لیکن اس ریاست پر مغلوں، افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں نے حکومت کی لیکن کسی کا دور ایسا نہ تھا جس میں مقامی لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ہو۔ اس دوران مختلف تحریکیں چلتی رہیں اور حکمران تبدیل ہوتے رہے۔ ۱۸۴۸ء میں جب دوسری مرتبہ سکھوں اور انگریزوں میں لڑائی شروع ہوئی تو انگریزوں نے حالات کو دیکھتے ہوئے دوبارہ ۱۸۵۱ء کو ریذیڈنٹ تعنیاتی کا مطالبہ کیا۔ جس کی وجہ سے خارجہ معاملات ۱۸۷۷ء تک ریذیڈنٹ کے ذریعے سرانجام دیئے جانے لگے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا انبیر سنگھ تخت نشین ہوا۔ یہ دور غالباً ۱۸۵۸ء سے ۱۸۸۵ء تک کا ہے۔ رنبیر سنگھ کی موت کے بعد پرتاب سنگھ تخت نشین ہوا یہ بہت زیادہ قابل نہیں تھا۔ اور نہ ہی کوئی متاثر کن شخصیت تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ۱۸۸۵ء میں ریذیڈنٹ تعنیات ہوا۔ یہ دور انتہائی سازشوں کا دور تھا۔ جس سے مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ۱۸۹۱ء میں پرتاب سنگھ کو انگریزوں نے ایک ریجنی کونسل بنائی تھی اس کا صدر بنا دیا۔ پرتاب سنگھ نے ۲۹ جنوری ۱۸۹۵ء اور دسمبر ۱۸۹۵ء کو انگریزوں کو دو خط ریجنی کونسل کے صدر کی حیثیت سے لکھے۔ کہ مجھے بے اختیار کر دیا گیا ہے۔ جس سے ۱۸۹۶ء میں پرتاب سنگھ کو دوبارہ اختیارات واپس مل گئے۔ لیکن اسے کونسل کا پابند ٹھہرایا گیا۔ لیکن جب پرتاب سنگھ ۱۹۲۵ء کو فوت ہو گیا۔ تو اس کا بھتیجا اقتدار پر براجمان ہوا کیونکہ پرتاب سنگھ صاحب اولاد نہ تھا اس لیے اس نے اپنے بھتیجے کو نامزد کیا تھا۔ ہری سنگھ بہت پڑھا لکھا تھا۔ ہری سنگھ نے تخت پر بیٹھتے ہی پہلا حکم جاری کیا کہ آج کے بعد برطانوی پرچم ریاست کشمیر میں نہ لہرایا جائے۔ ابتداء میں ہری سنگھ نے آزادانہ پالیسی جاری رکھی۔ جس سے ساری رعایا میں اس کی عزت بڑھی لیکن وہ زیادہ عرصہ ریاستی انتظامیہ پر مؤثر کنٹرول حاصل نہ رکھ سکا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں۔ مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی اپنے حقوق مانگنے کے لیے سیاسی جدوجہد کی داغ بیل ڈالی۔ ہری سنگھ مسلمانوں کو کسی طور پر مطمئن نہ کر سکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہری سنگھ اور مسلمانوں کے درمیان خلیج وسیع ہونے لگی۔ یہی خلیج ٹکراؤ کی صورت اختیار کر گئی۔ یہی ٹکراؤ سیاسی تحریک کی شکل اختیار کر گیا جو بعد ازاں تقسیم ہند کے وقت مہاراجہ ہری سنگھ کی سبکدوشی پر منتج ہوا۔

۱۳۲۰ء میں جب بودھ راجہ رنجن نے اسلام قبول کیا اور وہ صدر الدین کے نام سے سلطان بنا اور کشمیر کی آزاد مسلم ریاست کی بنیاد رکھی۔ اُس وقت حالات اتنے زیادہ خراب نہیں ہوئے تھے اس کے بیس سال بعد شاہمیر کے

عہد سلطنت کی قوت وعزت بتدریج بڑھنے لگی۔ اور ایک دفعہ پھر کشمیر کے سلاطین نے بہت سی ہمسایہ ریاستوں پر کنٹرول حاصل کرلیا۔ شہاب الدین (۷۰۔۱۳۳۵ء) نے للتادت کے نقش قدم پر چل کر ہمسایہ ریاستوں پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ زین العابدین (۷۰۔۱۴۴۰ء) نے لداخ وبلتستان پر اپنا اقتدار جمایا۔ مگر زین العابدین کے تابناک اقتدار کے بعد سیاسی بدنظمی اور معاشرتی پریشانی کا طویل دور شروع ہوا۔ ان حالات نے کاشغر کی طرف سے مرزا حیدر دغلت کی سرکردگی میں ۱۵۳۳ء میں کشمیر پر حملے کو آسان بنا دیا۔ پھر لودھی، شیر شاہ سوری اور برصغیر کے پہلے دو مغل حکمرانوں نے بھی اس پر قبضہ کرنے کی بڑی کوششیں کیں۔ لیکن وہ کشمیر پر حکومت قائم نہ کر سکے۔ اس کے باوجود یہ حکمران جب بھی کوئی ناراض یا شکست خوردہ کشمیری لیڈر ان سے ملک حاصل کرنے کی سازش کرتا یہ کشمیر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے۔ اسی طریقے سے مرزا حیدر دغلت دوسری مرتبہ ملک پر قبضہ کرنے اور دس سال تک (۵۰۔۱۵۴۰ء) حکومت کرنے کے قابل ہوا تھا۔ تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں ڈاکٹر صابر آفاقی اکبر، احمد شاہ ابدالی اور رنجیت سنگھ کے بارے لکھتے ہیں کہ انہوں نے کیسے کس نے کشمیر پر قبضہ کیا کس سے الحاق کروایا اور کسے شکست ہوئی۔

> اکبر نے پہلے کشمیر کو فتح کیا اور پھر ۱۵۸۶ء میں اس کا اپنی سلطنت سے الحاق کروالیا اور اسی طرح احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۳ء میں افغان حکومت قائم کی جس کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھوں ۱۸۱۹ء میں خاتمہ ہوگیا[۳۰]

ریاست جموں کشمیر میں حالات اس قدر خراب ہو گئے۔ کہ کشمیری ہندوؤں اور مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ ایسے میں ریاست کے اندرونی حالات اور زیادہ خراب ہوتے گئے کیوں کہ اس کی غالب آبادی مسلمان تھی اور وہ زیادہ تر ان پڑھ تھی۔ دیہاتوں میں رہنے والے لوگ افلاس اور اقتصادی بدحالی کی بدترین زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ لیکن ظلم وستم سے حکومت کی جارہی تھی۔

بیسویں ویں صدی کے آغاز برصغیر مختلف سیاسی تحریکوں کی آماجگاہ بن گیا۔ جس کے اثرات کشمیر پر بھی پڑے۔ ان تحریکوں میں ستیہ گرہ، تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت وغیرہ شامل تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جموں کے چند نوجوانوں نے ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ جس کا مقصد لوگوں میں مطالعے کا شوق پیدا کرنا تھا اس کے لیے ایک دارالمطالعہ بھی قائم کیا گیا۔ اس کو بنانے والے نوجوانوں میں مقبول احمد، قاضی شمس الدین اور محمد بشارت کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ ابتدا تھی اس کے بعد جموں کے مسلمانوں نے ایک مذہبی تنظیم بھی بنائی۔ تاکہ مسلمانوں کو قرآن حکیم کی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے۔

۱۳جولائی۱۹۳۱ء ایک ایسا خونی واقعہ سری نگر کی سنٹرل جیل میں پیش کہ جس نے تاریخ کشمیر کا رخ ہی بدل کے رکھ دیا۔ کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں جی ایم میر اس واقعے کو کچھ اس طرح قلم بند کرتے ہیں:

> ۱۳جولائی کو کشمیری عوام پر فائرنگ ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ ہر گولی نے میری چھاتی میں سوراخ کر دیا ہے اس فائرنگ کے بعد ہی میری عملی سیاسی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اس فائرنگ میں بے شمار افراد زخمی ہو گئے۔ میں ایک زخمی کو سنبھال رہا تھا کہ اس نے دم توڑتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔ عبداللہ میں نے فرض پورا کر دیا ہے۔ اب تم آگے بڑھو۔ اور میں آگے بڑھنے لگا[۳]

ان حالات کی وجہ سے وہ لاوا جو کئی سالوں سے پک رہا تھا اچانک پھٹ پڑا۔ اور کشمیری عوام نے اس کو آگے لے کے جانے اور اپنے احتجاج کو وسعت دی۔ یہی تحریک بعد ازاں ''کشمیر کشمیریوں کے لیے'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور کشمیریوں کو سیاست کے ساتھ دوسری ملازمتوں میں بھی حصہ ملنا شروع ہوا۔ لیکن حالات بدستور وہی رہے۔

د۔ شکست میں پیش کردہ معاشی منظر نامہ

ناول شکست میں دراصل دو کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ ایک کا ہیرو شیام ہے جو کہ تحصیل دار کا لڑکا ہے اور اس کی ایک محبوبہ ہے جس کا نام ونتی ہے۔ دوسری طرف ''چندرا'' اور موہن سنگھ'' کی محبت کا پہلو ہے۔ ''موہن سنگھ ایک راجپوت گھرانے کا چشم و چراغ ہے اور ''چندرا'' ایک اچھوت لڑکی۔ شکست ایک ایسا ناول ہے جس سے کرشن چندر کے بنیادی میلانات اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ کس طرح خوبصورت انداز سے کشمیر کی معیشت اور وہاں کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ شکست کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ کچھ کے ہاں بہت اچھی اور کچھ کے ہاں بُری۔ لیکن حقیقت میں شکست میں کئی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جو فن کی حیثیت سے اردو ناول میں پہلے نہ ہونے کے برابر تھیں۔

جب بھی معیشت کا ذکر آتا ہے کرشن چندرا اپنے ناول میں عورت، کسان، مزدور اور محنت کش طبقے کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ ان کے بغیر کشمیر کی معیشت کا پہیہ نہیں چل سکتا۔ جیسا کہ وہ اپنے ناول میں سیداں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہر وقت اس کے ہاتھ میں بھی درانتی ہوتی ہے، تو کبھی کدالی، کبھی مویشیوں کے لیے گھاس کا گٹھا، کبھی مکئی کے پودوں کا گٹھا چری، ساگ کچھ نہ کچھ اس کے ہاتھ میں ضرور ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک مزدور تھی اور غریب طبقے کے لیے اس کے علاوہ تھا ہی کیا کیونکہ روٹی کے بغیر زندگی نہیں جی جا سکتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں پر کوئی باقاعدہ کاروبار نہیں تھا لوگ زراعت سے وابستہ تھے اور جانور پالتے تھے، ماہی گیری کرتے تھے اور فروٹ کا کاروبار کرتے تھے۔ اس وقت باغات لوگوں کے سانجھے ہوتے تھے۔ کوئی کسی کو کچھ نہیں کہتا تھا۔ سب استعمال کرتے تھے۔ انہیں چیزوں کو بیچ کر وہ اپنا گزر بسر کرتے اور مل جل کر کام کرتے تھے۔ کیونکہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا تمام چیزوں پر قبضہ ہوتا تھا وہ لوگوں سے مزدوری تو کرواتے تھے۔ لیکن اُنہیں ان کا حق نہیں دیتے تھے۔

ناول نگار یہاں اقتصادی صورت حال سے اس قدر پریشان دکھائی دیتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک ایسی حکومت قائم ہونی چاہیے جو عوام کے لیے ہو اور عوامی نمائندے ان کے رہبر ہوں۔ جس میں کوئی حاکم نہ ہو اور نہ محکوم، سبھی برابر ہوں۔ اور برابر کے حصہ دار ہوں۔ عوامی نمائیندوں کو چاہیے کہ وہ عوام کے لیے آسانیاں پیدا کریں تا کہ عوام کا معیار زندگی بہتر ہو۔ اقتصادی مساوات کی راہ میں وہ مذہبی روایت پرستی اور قومی ملکی اور نسلی امتیازات کو رکاوٹ پیدا کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اور ایک برادرانہ تصور کے تحت اقتصادی مساوات کے اصولوں پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ تا کہ بھوک، افلاس اور جماعتی تضاد جیسی غیر انسانی لعنتیں ختم ہوسکیں اور انسان ترقی کر سکے۔ صورت حال یہ تھی کہ تمام معیشت پر ہندو قابض تھے کشمیری مسلمان صرف کشمیر میں محض مزدور اور چرواہے ہی رہ گئے تھے۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے مسلمانوں کو محکوم بنا کر رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر نفرت کی آگ پروان چڑھ رہی تھی۔ جو کہ بعد میں ہندو مسلم فساد کی شکل میں سامنے آئی اسی حوالے سے کرشن چندر اپنے ناول شکست میں کچھ اس طرح سے لکھتے ہیں:

> شیام نے کہا، آپ بھی اب دلائل سے زیادہ جذبات سے کام لے رہے ہیں یہ معاملہ مذہبی نہیں۔ سیاسی اور اقتصادی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمان مسلمان کا گلا نہ کاٹتا اور ہندو ہندو کے خلاف نہ ہوتا نوکریوں کے معاملے ہی کو لے لیجئے[۳۲]

زندگی چاہیے وہ ہندو کی ہو یا مسلمان کی، اقتصادات کے پیمانے پر ہی تلتی ہے۔ اور یہ ضروری بھی ہے مشینوں کے زمانے میں اس سے بہتر اور کون سا پیمانہ ہوسکتا ہے۔ اور جب بھی یہ مسئلہ حل ہوا اسی پیمانے کو مدنظر رکھتے ہوئے حل ہوگا محض بھائی بھائی کہہ دینے سے حل نہیں ہوگا۔ کیونکہ بھائیوں کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ ان کی بھی جائیداد اور زر نقد ہوتی ہے۔ جو کہ تقسیم کیے بغیر حل نہیں ہوسکتی اور نہ وہ چین سے رہ سکتے ہیں۔

دراصل کرشن چندر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی تمام تر پیداوار اشیاء کی تخلیق نو اور انھیں استعمال کا لائق بنانے کا عمل

صرف اور صرف محنت کش کے کرشمے ہیں۔ اس لیے انصاف کی رو سے ان کے مالک بھی محنت کش ہوئے۔ ان کے استعمال اور ان سے لطف اندوز ہونے کا حق بھی صرف انہیں کو پہنچتا ہے۔ نا کہ خود ساختہ مالکوں کو جو ایک تنکا بھی نہیں ہلاتے۔ اسی لیے وہ طبقاتی سماج میں محنت و سرمایہ کی کشمکش اور غیر منصفانہ تقسیم پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ وہ انسان کے روز و شب اور جذبہ خیر و شر میں معاشی رشتوں کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ چنانچہ انسانوں کی بدلتی ہوئی فطرت، ہر لمحہ تغیر، اخلاقیات اور اتاتیت کے سلوک و اعمال کی روش کا تجزیہ کرتے وقت مادی و معاشی ماحول ہمیشہ دھیان میں رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ڈکیتی اور چوری کے مسئلے میں بھی اقتصادی حالات کو ذمے دار ٹھہرایا ہے۔ اور ڈاکوؤں سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ پیدا کیوں ہوتے ہیں۔ تاکہ ان اسباب کا قلع قمع کیا جا سکے۔ وہ بنیادی طور پر ہر انسان کی فطرت کو سادہ و بے گناہ ثابت کرتے ہیں۔

معاشی طور پر کشمیر کے لوگ اس قدر کمزور تھے کہ خواتین ریوڑ بھی چراتی تھیں اور دکانیں بھی۔ معاشی طور پر کمزوری کی سب سے بڑی وجہ سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ تھا جس نے سب کچھ اپنے قبضے میں لیا ہوا تھا۔ خواتین کے کاروبار کے حوالے سے کرشن اپنے ناول شکست میں چھایا کے حوالے سے کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں: ''گاؤں کے باہر اپنے بھائی کے ساتھ اس کی اپنی دکان ہے۔ وہاں خود دکان پر بیٹھتی ہے۔ اور سب گاہکوں سے بڑی ہوشیاری سے نبٹتی ہے''۳۳

یہاں کے لوگ زیادہ تر زراعت کے پیشے سے وابستہ تھے اور محنت مزدوری کرتے تھے۔ مکئی، دھان اور چاول کی فصلیں ان کے ہاں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ انھیں سے یہ اپنے گزراوقات چلاتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر حالات اتنے ہی اچھے ہوتے تو خواتین نہ تو ریوڑ چراتیں اور نہ ہی دکانیں۔ لیکن کیا کریں زندہ رہنے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

غریب اور متوسط طبقے کی خواتین کیا کام کرتی تھیں اور کس طرح اپنی زندگی گزارنے کے لیے محنت کرتی تھیں اس کو ڈاکٹر صابر آفاقی اپنی کتاب تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں کچھ اس طرح قلم بند کرتے ہیں:

> چرخے اور ان کے پیچھے پوشیدہ طاقت قدیم کشمیری زندگی کی سادگی کا نمونہ رہی ہے۔ ہاتھ سے کاتنا اور ہاتھ سے بننا، خاص طور سے عورت کے لیے بنیادی، عمومی اور نفع بخش شغل تھا۔ اقتصادی نقطہ نظر سے سب سے زیادہ منافع بخش یہی پیشہ تھا۔ اس پیشے میں اسی (۸۰) فیصد سے زائد عورتیں مصروف رہتیں۔ یہ صنعت اگر غرباء کے لیے ذریعہ معاش تھی تو امراء اور متوسط طبقہ کی عورتیں بھی اپنے گھریلو

استعمال کے لیے پشمینہ کی چیزیں تیار کرتی تھیں اور ایک سودمند کام میں مصروف بھی رہتی تھیں ۳۴

کشمیر میں سالانہ ایک میلہ لگایا جاتا جسے پیر کے نام سے منسوب کیا گیا تھا سارا سال تمام مرد وخواتین اور چھوٹے بڑے تاجر اس کی تیاری کرتے اور باہر سے بھی مختلف چیزیں منگواتے کیونکہ یہ میلہ بہت مقبول تھا اور کافی رقبے پر محیط ہوتا تھا۔ معاشی لحاظ سے لوگ اسے بہت اہمیت دیتے تھے کیونکہ بہت سارا زر مبادلہ حاصل ہوتا تھا جس سے لوگوں کی مشکلات حل ہونے میں مدد ملتی تھی اس میلے کے شروع ہونے سے کچھ دن پہلے لوگ اس کے لیے روانہ ہوتے اور سامان وغیرہ بھی مخصوص جگہ پر پہنچا دیتے۔ اس میں شرکت کرنے کے لیے دور دراز سے مرد وخواتین ، بچے بوڑھے قافلوں کی صورت میں شرکت کرتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے یہاں سے انسانی ضرورت کی تمام چیزیں بآسانی مل جاتی تھیں۔ اور لوگوں کو بہت زیادہ منافع حاصل ہوتا تھا۔

یہ وہ میلہ تھا جہاں لوگ نہ صرف ضرورت کی چیزوں کا کاروبار کرتے تھے بلکہ تفریح بھی حاصل کرتے تھے۔ کرشن چندر میلے کی اندرونی کہانی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> سناروں کی دکانوں پر عورتوں کی بڑی بھیڑ تھی، جو نہایت انہماک اور شوق سے ''زیورات کی نمائش'' ملاحظہ کر رہی تھیں، کھوٹ کی انگوٹھیاں، کڑے اور بالیاں خوب بک رہی تھیں۔ زیورات کی نمائش کرتے کرتے سنار لوگ اپنی جنسی تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتے جاتے تھے، اور کڑے، انگوٹھیوں اور بالیوں کی تعریف کرتے کرتے اپنے گاہکوں کے حسن کی تعریف کر دیتے، یا کوئی ایسی دبی ہوئی چوٹ کر جاتے کہ عورتوں کے جھمگھٹوں میں قہقہے گونج جاتے ۳۵

شیام کہتا ہے اس موقع پر دیکھا گیا ہے کہ گاؤں کی عورتیں بھی جوابی حملہ کرنے سے بعض نہ آتی تھیں۔ اور اسے محض مذاق سمجھا جاتا تھا کوئی بھی اسے بُرے پیرائے میں نہ لیتا۔

منڈی کی صورت حال یہ تھی کہ متوسط لوگ اور زمیندار منڈی پر قبضہ جمائے ہوئے تھے اور وہ قیمتوں کا تعین اپنی مرضی سے کرتے تھے خاص طور پر ان دنوں میں جب قحط پیدا ہو جاتا۔ ۱۹۰۰ء تک کشمیر میں نقد لین دین کا رواج نہیں تھا۔ تنخواہیں، شالی، مکئی اور سنگھاڑا کی صورت میں ادا کی جاتی تھیں جنس کے بدلے جنس کے لین دین کا ذریعہ بڑی حد تک شالی تھا جو ایک خاص خوراک ہے۔ چاندی، تانبے اور کوڑیوں سے کاروباری معاملات میں بہت کم کام لیا جاتا تھا۔ اجناس کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتیں اور ناجائز منافع خوری لوگوں کی اقتصادی زندگی کی خصوصیت بن چکی تھی۔ لیکن جب زین العابدین کی حکومت آئی تو اس نے ان تمام چیزوں پر نہ صرف قابو پایا بلکہ عمدہ کاروباری تعلقات قائم کیے

ڈاکٹر صابر آفاقی اپنی کتاب تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں لکھتے ہیں کہ:

زین العابدین نے قیمت پر کنٹرول کا ایک سسٹم جاری کیا جس کے ذریعے اشیاء کی قیمتیں حکومت کی طرف سے مقرر کی جاتی تھیں۔ حکومت اعلان ناموں کے ذریعے اعلانات جاری کرتی۔ یہ اعلان نامے تانبے کی تختیوں پر کندہ کیے جاتے۔ وقتاً فوقتاً کے ذریعے قیمتوں میں فرق بھی بتایا جاتا تھا۔ یہ تختیاں تمام اہم مراکز اور تمام قصبات میں آویزاں کر دی جاتی تھیں۔ اس طریق سے اس نے اپنی رعایا کو دغاباز تاجروں کی لوٹ کھسوٹ سے بچا لیا۔ سلطان نے اپنے جانشینوں سے درخواست کی وہ اس اصول کو برقرار رکھیں ۳۶؎

ہ شکست میں پیش کردہ معاشی منظر نامہ

کرشن چندر نے معاشرے میں رہنے والے انسانوں کو اپنے کردار کے لیے چنا ہے۔ اور انہیں اپنے ناول میں معاشرتی پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ کرشن چندر یہ کہتا ہے کہ انسانی معاشرہ، ماحول یا معاشرتی دھاروں سے الگ آزاد اور لاتعلق ایک خول کے اندر اپنے آپ کو قید نہیں رکھ سکتا۔ اور نہ ہو وہ معاشرے سے باہر رہ سکتا ہے اس کی زندگی اور موت اس کے اندر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت محبت اور جنگ دونوں سے لڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اور انسانی زندگی کے لیے زیادہ وسعت، کھلی ہوا اور روشنی پیدا کرنے کی محنت کرنے میں لگا رہتا ہے۔

شکست میں معاشرتی منظر کو کچھ اس طرح دکھایا گیا ہے کہ ''شیام'' کی شادی ونتی سے اس لیے نہیں ہو پاتی کہ اس کی ماں برادری سے نکالی گئی ہے۔ شیام کے روپ میں کرشن چندر اپنے دور کے ایک نوجوان کی تصور پیش کرتے ہیں۔ جو صرف باتوں کی حد تک رہتا ہے۔ سماج کو بدل دینے کی دل میں خواہش رکھنے کے باوجود کوئی عملی قدم اٹھانے سے خوف کھاتا ہے۔ اور خود کو بغاوت پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کی کسی دوسرے سے شادی ہونے پر خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس برخلاف ''ونتی'' شیام کی شادی کسی دوسری لڑکی سے ہونے پر غم برداشت نہیں کر سکتی اور خود کو محبت کی آگ میں جلا دیتی ہے دوسری طرف چندرا اور موہن کی داستان محبت کچھ اس طرح پیش کی گئی ہے۔ جس میں چندرا ایک اچھوت لڑکی ہے اور موہن سنگھ راجپوت نوجوان۔ چندرا معاشرے سے بغاوت کرتے ہوئے اور تمام تر پابندیوں کو توڑتے ہوئے اچھوت ہونے کے باوجود راجپوت سے محبت کرتی ہے اور نڈر ہو کر معاشرے کا مقابلہ کرتی ہے۔ لیکن جب موہن سنگھ کسی حادثہ میں مارا جاتا ہے تو اس غم کی تاب نہ لا کر پاگل ہو جاتی ہے۔

ناول نگاران معاشرتی پیچیدگیوں میں گم ہو جاتے ہیں اور ہر چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس نے گاؤں کی

زندگی کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک لڑکی بھینس کے تھنوں سے دودھ دوھ رہی تھی۔ ایک گوجر اس کے پاس کھڑا تھا۔ یہاں ایک مکان تھا اور ساتھ ہی ایک آدمی لال دھوتی باندھے ہوئی ننگی کھاٹ پر گھٹنے اوپر اٹھائے حقہ پی رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک بڑھیا چولہے میں لکڑیاں لگا رہی تھی۔ اور آٹا گوندھ کر پاس رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی کچھ گائیں ڈاکارنے لگیں اور ایک بچھیا پیشاب کرنے لگی۔ آگ، دھواں، گوبر، حقے کی گڑاہٹ، بھٹوں کی سوندھی خوشبو اور جھاڑیوں پر کھلے ہوئے جنگلی گلاب، مختلف قسم کی بیلیں جن میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں یہ سب معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ایک جگہ ایک نوجوان عورت کچھ گائیں بھینس اور بھیڑ بکریاں باڑے سے باہر نکال رہی تھی اس کے پیچھے ایک نوجوان نظر آیا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی اور مونچھیں اوپر کو مڑی ہوئی تھیں۔ اس نے اس نوجوان عورت کو آہستہ سے کچھ کہا اور پھر اوپر کی طرف مڑ گیا۔ مڑتے ہوئے اس کی گردن کے قریب شیام کو ایک گہری چوٹ کا نشان نظر آیا۔ جس سے عورت کا رنگ اڑ گیا اور وہ غصے سے دیکھنے لگی اس کا سر اور پیر ننگے تھے البتہ قمیض اور شلوار پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی بھی تھی۔ اس نے شیام کو غصے سے ایک لمحے کے لیے دیکھا تو وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹک گیا۔ کرشن یہاں پر عورت کے غصے کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں: ''یہ کونسا راستہ ہے۔ یہ راستہ تو ہمارے گھر میں سے گزرتا ہے۔ تم کدھر جانا چاہتے ہو؟''[۳۷]

وہ اپنے ریوڑ کو لے کر ندی گئی تا کہ ان کو پانی پلائے اور پھر اس پار لے جائے تا کہ مویشی اپنا پیٹ گھاس سے بھر سکیں۔ جہاں سے وہ مویشی گزار رہی تھی وہاں سے ندی بہت گہری تھی یہاں پر گاؤں کے لوگوں نے پتھروں سے پانی کو روک دیا تھا تا کہ آگے پانی کم ہو کر گزرے اور مال مویشی آسانی سے ندی پار کر سکیں۔ لیکن جہاں پانی روکا گیا تھا وہ جگہ تیرنے کے لیے بہت زبردست تھی۔ اسے ''سنتال'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ عورت وہاں نہا رہی تھی تو شیام بھی وہاں آ نکلا۔ وہ شیام کو دیکھ کر مسکرانے لگی اور کہا:

> میں یہاں ہر روز صبح نہاتی ہوں۔ اور ان اوپر کی چٹانوں سے چھلانگیں لگاتی ہوں۔ اس وقت یہاں کوئی نہیں ہوتا۔ آج تم آ گئے ہو، تحصیلدار کے بیٹے تو تم ہو، لیکن تمہیں ہم غریب لوگوں کو اس طرح تنگ نہیں کرنا چاہیے[۳۸]

یہاں کے لوگوں کا زیادہ تر پیشہ زراعت اور مال مویشی پالنے کا ہے۔ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ فصلیں بھی کاٹتی ہیں۔ اور محنت مزدوری جو مل جاتی کرنے میں عار محسوس نہیں کرتی ہیں۔ کیونکہ دو وقت کی روٹی کمانا بہت مشکل تھا ہر طرف سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا راج تھا وہ ہر وقت غریبوں کا استحصال کرنے میں لگے رہتے تھے اور غریب عورتوں سے ان کی غربت کا فائدے اٹھاتے تھے۔ کرشن چندر اس حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں۔

کشمیر میں ایک جگہ پر سالانہ میلہ بھی لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ وہاں پر پانڈوں کے پرانے محل ہیں اور یہیں یہ بابا پیر کی قبر بھی ہے۔ اس لیے یہ مقام ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جو میلہ لگتا ہے اسے دیکھنے کے لیے بہت دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ دو سے تین دن یہاں خوب رونق ہوتی ہے۔ شیام بولا عجیب بات ہے ایک ہی مقام اور وہ بھی مذہبی تو دونوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے کیسے قابل احترام ہوسکتا ہے۔ علی جو نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور بولا۔ شیام صاحب بات دراصل یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات زیادہ خراب گذشتہ بیس سالوں میں ہوئے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے یہ دونوں ہنسی خوشی اکٹھے رہتے تھے۔ رہی یہ بات کہ ایک ہی مقام مذہبی اعتبار سے ہندوؤں مسلمانوں کے لیے کیسے متبرک ہوسکتا ہے۔ تو اس کی سینکڑوں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں سے ایک کرشن چندر اپنے ناول شکست میں کچھ یوں لکھتے ہیں:

> یہاں پیر کی قبر اور پانڈوں کے محل ساتھ ساتھ ہیں۔ اننت ناگ میں مسلمانوں کی عبادت گاہ اور ہندوؤں کا مقدس تالاب ایک جگہ پر ہیں۔ دونوں اپنے اپنے طریق پر خدا کی عبادت کرتے ہوئے بھی ایک خاص اخوت اور یگانگت محسوس کرتے تھے۔ اکثر دیہاتوں میں مندر، دھرم شالائیں اور مسجدیں ساتھ ساتھ ہوتی تھیں۔ ان دنوں آرتی اور باجے کا جھگڑا نہ تھا۔ کیونکہ دونوں کے دلوں میں مفائرت نہ تھی[۳۹]

یہ ایک رات کا واقعہ ہے۔ جب اچانک گاؤں میں شور کی آواز بلند ہوئی۔ بہت سے لوگ مختلف آوازیں نکال کر تیز قدموں کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ ہر ایک وادی میں دوسرے کو بلا رہا تھا۔ ایسے میں شیام کی آنکھ بھی کھل گئی باقی گھر والے پہلے ہی جاگ چکے تھے۔ یہاں تک کہ باغ میں موجود چرند پرند بھی جاگ چکے تھے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ غلام حسین جو عام طور پر آنگن میں سویا کرتا تھا پتہ لگانے کے بعد واپس لوٹا تو معلوم ہوا نائب تحصیلدار صاحب شکار سے واپس آ رہے تھے۔ تو راستے میں موہن سنگھ کو سوائی کے جنگل میں کسی سورنی نے شدید زخمی کر دیا ہے۔ لوگ اسے اٹھا کر لا رہے ہیں۔ شیام نے بھی کپڑے تبدیل کیے اور والد کے ہمراہ باہر چلا گیا۔ باہر وادی میں ایک عجیب وغریب قسم کا منظر تھا۔ ہر کوئی اپنے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر آ رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہو رہی تھی کہ شکاریوں کا جلوس شکاری جو آج خود شکار ہو گیا ہے۔ کرشن چندر اپنے ناول شکست میں اسے کچھ یوں لکھتے ہیں: ''یہ سب علی جو نائب تحصیلدار کی کارستانی ہے۔ بچارے غریب راجپوت کو سورنی سے پھڑوا دیا ہے۔ سنا ہے کہ علی جو بہت مدت سے در پردہ موہن سنگھ کے خلاف سازشیں کر رہا تھا''[۴۰]

موہن سنگھ کی خبر جیسے ہی چندرا تک پہنچی وہ بہت زیادہ پریشانی ہوئی اور آنسو بہانے لگی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ

میں ہسپتال ضرور جاؤں گی بلکہ وہ جہاں جائے گا وہیں جاؤں گی۔ کرشن چندر اپنے ناول میں معاشرے کے منظر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ غلام حسین نے کہا دنیا کیا کہے گی۔ چندرا کہنے لگی وہ دنیا کا نہیں ہے میرا ہے۔ اسی دوران شیام بولا۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ وہ ہسپتال پہنچ کر ڈاکٹر سے ملے۔ شیام نے ڈاکٹر سے پوچھا یہ بچ تو جائے گا۔ ڈاکٹر نے رک کر جواب دیا امید کافی ہے۔ بہتر ہو جائے گا۔ شیام جلدی سے باہر نکلا کیونکہ وہ دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ اس کے آنے پر اس سے پوچھا شیام، موہن اچھا تو ہو جائے گا ناں۔ شیام نے اُسے تسلی دی کہ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں اچھا ہو جائے گا۔ اب چندرا کے اندر یہ خواہش ابھری کہ مجھے ہسپتال میں اس کے ساتھ رہنے دیا جائے اس کے گھر میں تو کوئی مجھے گھسنے نہیں دے گا۔

شیام نے اُسے تسلی دی کہ موہن اچھا ہو جائے گا لیکن اس نے کہا موہن اچھا نہیں ہوگا کیونکہ اس کے گھر والے اس کی تیمارداری اچھی نہیں کریں گے کیونکہ وہ یہ چاہیں گے کہ یہ مر جائے اور اس کی جائیداد، زمین اور پن چکی انہیں مل جائے کیونکہ اس کا بھائی بہن میں سے کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ موہن سے محبت کرتی تھی اور شادی کرنا چاہتی تھی۔ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ کرشن چندر اس حقیقت کو کچھ یوں لکھتے ہیں:

> موہن کبھی اچھا نہیں ہوگا، اگر اس کی تیمارداری اس کے یہ رشتے دار کرینگے۔ میں ان باتوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ میں ان رشتہ داروں کو خوب سمجھتی ہوں۔ کبھی ہمارے بھی رشتہ دار تھے۔ آج گاؤں والوں نے ہمیں دیس نکالا دے دیا ہے، وہ کیا ہماری محبت ہیں۔ ہم سے تو وہ آنکھیں بھی نہیں ملاتے چور ڈاکو کمینے [۱۴]

کرشن چندر طبقاتی سماج کی ان تمام قدروں کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو محبت جیسے لطیف و بلیغ جذبے کی آزادی میں کانٹا بوتے ہیں۔ اور ہر اس تمدن کو رجعت پرست اور روایت کو فرسودہ اور ماحول کو ظالم قرار دیتے ہیں۔ جو مرد کو مرد اور عورت کو عورت نہیں رہنے دیتا۔ اور ماں باپ، بھائی بہن اور دوسرے خاندانی رشتوں اور عزیز داریوں کی آڑ میں عشق کی زندگی اور شباب کی تازگی کا قائل ہے۔

کشمیر کے وسیع رقبے پر لیتری کی فصل کاشت کی جاتی ہے۔ جب یہ تیار ہونے کے قریب آتی ہے۔ تو تمام گاؤں والے ایک دوسرے کی مل کے کاٹتے ہیں۔ اس کے لیے باقاعدہ دن مختص کیے جاتے ہیں۔ تیاری کی جاتی ہے۔ مرد و خواتین اس میں شامل ہوتے ہیں۔ ڈھول بجائے جاتے ہیں۔ نعرے لگائے جاتے ہیں۔ اس میں تعصب کی کوئی بات کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کو کاٹنے کے لیے ہندو، مسلمان، سکھ اور اچھوت سب اکٹھے کام کرتے ہیں۔ ہر کسی کے ہاتھ

میں درانتی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے کام میں مشغول ہوتے ہیں کیونکہ سب لوگ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ کھانے پینے کا انتظام خواتین کے ذمہ ہوتا ہے۔ کسی کا کسی سے پردہ نہیں ہوتا تھا۔ اور ہر ایک دوسرے سے مذاق کر سکتا ہے چاہیے مرد ہو یا عورت۔ کرشن چندر لکھتے ہیں کہ:

> سیداں اور چندراں اور نوراں ایک ہی قطار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تیزی سے درانتیاں چلا رہی تھیں، باتیں کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے ہنسنے کی آواز ساری قطار پر چھا جاتی اور ان کے قریب کام کرتے ہوئے کسان ان سے مذاق کرنے لگتے، لیکن اس وقت کوئی بُرا نہ مانتا تھا۔ اور یوں بھی تو اس مذاق میں کوئی برائی نہ ہوتی تھی۔ صاف کھلا شریفانہ مذاق[۴۲]

اور کچھ لوگ یہ گا رہے ہوتے ہیں:

''روئے۔۔روئے۔۔۔رے رے

باغاں دے وچ روئے بُلبل بولے

کسیاں بولن پانی ای ای ای

جنہاں روئے ساڈے بجن وچھوڑے

صبر اُنہاں دی جانی ای ای

کشمیر کی نوجوان عورتیں عام طور پر سُرخ لباس زیب تن کرتی ہیں۔ بوڑھی عورتیں عموماً نیلا یا کالا رنگ پسند کرتی تھیں۔ زیورات بہت زیادہ پہنتی ہیں جن میں سونے کے بہت کم اور چاندی، تانبے، پیتل اور لوہے کی دھاتیں استعمال میں لائی جاتی تھیں اور ان کے اوپر سونے کا پانی چڑھوا دیتے تھے۔ یہاں کے لوگ اپنی خواتین کے گلے کے لیے جو ہار بنواتے ہیں اسی طرح کا اپنی گھوڑیوں اور بھینسوں کے لیے بھی بنواتے ہیں۔ یہاں کے بہت سے کسانوں سے جو عام بات شیام نے سنی تھی اُسے کرشن چندر اپنے الفاظ میں کچھ یوں لکھتے ہیں: ''واہ کیا عمدہ گھوڑی ہے کیا بانکی چال ہے۔ سو بیسی سے کم کی تو کیا ہوگی''[۴۳]

شیام کو کچھ اس سے بھی پتہ چلا تھا کہ ہندوستانی سماج میں جس کے بیشتر افراد کسان ہیں۔ عورتوں کی سوشل حیثیت کیا ہے اس یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

> کسان لوگ اپنی عورتوں کے لیے بھی وہی زیور بنواتے تھے جو اپنی گھوڑیوں اور بھینسوں کے گلے میں

ڈالتے تھے اور شادی کے لیے بھی اُنہیں اسی طرح بیچتے تھے جس طرح گھوڑیاں اور بھینسیں بیچی جاتی ہیں اور پھر شیام کو خیال آیا کہ خود اس کے طبقے میں اور اس سے اوپر کے طبقے میں بھی یہی خرید و فروخت ہوتی تھی اور گو سبھی ہندوستانی طبقوں میں عورت کی زبو حالت تھی لیکن شاید کسانوں اور مزدوروں کے طبقوں کی باقی طبقوں سے حالت بہتر تھی۔ کیونکہ یہ عورتیں کھتی باڑی کے کام مردوں کے دوش بدوش کرتی تھیں، آزادانہ طور پر عورتیں ہل چلاتی تھیں، نلائی کرتی تھیں، دھان کے کھیتوں میں پانی دیتی تھیں، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتی تھیں، فصل کاٹتی تھیں، ریوڑ چراتی تھیں، ان کے علاوہ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ بچے جنتی تھیں، بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو شاید کسان عورتیں کسان مردوں سے زیادہ کام کرتی تھیں[۴۴]

یہ وہ خواتین تھیں جنہیں اپنی اہمیت کا احساس تھا اور وہ یہ سمجھ سکتی تھیں کہ وہ معاشرے کے لیے کتنی اہم ہیں اسی لیے شیام نے ان عورتوں میں ایک خاص نوع کی آزادی اور خود اعتمادی دیکھی تھی۔ جس کی جھلک اُس نے شاید کسی اور طبقے کی عورتوں میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ کشمیر کے ایک رسالہ ماہنامہ شیرازہ کے موضوع ''در کشمیر ہمہ چیز خوب ''اندبجز۔۔۔'' کے اندر پروفیسر فدا محمد حسنین کا مضمون فاروق انوار مرزا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> کشمیری اپنی ہنرمندی کا جادو کہیں بھی دکھا سکتے ہیں وہ ایک بہترین کسان ہے جب وہ اپنے لیے کام کرتا ہو۔ وہ ایک اچھا باغبان ہے اور باغبانی کی بابت کمال معلومات رکھتا ہے۔ وہ بہترین اونی کپڑے بن سکتا ہے اور بہترین ٹوکریاں بنا سکتا ہے۔ وہ خود اپنے لیے بہترین مکان بنا سکتا ہے۔ اپنے لیے چپلیں بنا سکتا ہے اور مضبوط رسیاں بٹ سکتا ہے[۴۵]

شیام کی شادی کی جب تیاریاں شروع ہوئیں تو شیام کی والدہ نے اپنے پتی سے مشورہ کیا اور کہا کیونکہ ہمارے گھر میں یہ پہلا شگن ہے اس لیے میری یہ خواہش ہے کہ منگنی کے موقع پر چند رشتہ داروں کو بھی بلانا چاہیے۔ میں اپنی بہن اور اس کے لڑکے کو خط لکھ دیتی ہوں اور آپ شیام کے چچا اور شیام کی پھوپھی کو خط لکھ کر بلائیں۔ شیام کے والد جو کہ پیشے کے لحاظ سے تحصیلدار تھے کچھ وقت پس و پیش کرنے کے بعد مان گئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ میں چھایا اور اس کی لڑکی کا یہاں آنا جانا زیادہ پسند نہیں کرتی۔ یہ سنتے ہی تحصیلدار بہت حیران ہوئے۔ اور کہا عورتوں کا مزاج بھی بڑا عجیب ہوتا ہے ابھی دونوں قریبی سہیلیاں تھیں اور اب دونوں میں ناراضگی ہوگئی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ تم جانو اور تمہارا کام۔

پانچ چھ روز کے بعد شیام کی والدہ نے جب شیام کو اس کی شادی کی تیاریوں اور اس کے رشتہ داروں کو دی جانی والی دعوت کے متعلق بتایا تو وہ بہت حیران ہوا اور اس نے کہا میں یہ منگنی نہیں کروں گا مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ شیام کی ماں یہ الفاظ سن کر بہت پریشان ہوئی اور دل ہی دل میں سوچا مجھے کیا اندازہ تھا چھایا اور اس کی لڑکی کا ہمارے گھر میں آنا یہ گل کھیلائے گا۔ اور ساتھ ہی یہ کہنے لگی میں تو اپنے بیٹے کو بہت شریف سمجھتی تھی۔ اور میں یہ سمجھتی تھی کہ میرے لال میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے بیٹے سے کہتی ہے۔ چپ رہو عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ پتہ نہیں دونوں ماں، بیٹی نے تم پر کیا جادو کر دیا ہے۔ اور کہنی لگی لوگ کیا کہیں گے تحصیلدار نے کس جگہ بیٹے کا رشتہ کیا ہے۔ کوئی اچھی جگہ نہیں ملتی تھی۔ لیکن وہ غصے سے گرج کر بولا ''ماں'' اس سے اس کی ماں کا سارا جسم کانپنے لگا اور وہ بستر پر گر گئی۔ وہ ماں کے آنسوؤں اور سسکیوں کو برداشت نہ کر سکا اور اس کے جسم سے لپٹ کر رونے لگا اور کہنے لگا مجھے معاف کر دو ماں، معاف کر دو۔ ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور خوش ہوگئی۔ لیکن جب شیام کی منگنی پر مبارک باد دی جاتی ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ منگنی بہت اچھی آئی ہے جب رشتے کی پوری تفصیل بتائی جاتی ہے تو شیام ان باتوں سے کراہت محسوس کرتا ہے۔ اس وقت شیام جو باتیں کرتا ہے اس سے پڑھی لکھی لڑکیوں کی ذہنی و جذباتی کائنات پر سے پردہ اٹھتا ہے اور گاؤں کی عورتوں کی الھڑ، سادگی و دلربائی بڑی واضح نظر آتی ہے۔ جس کی منظر کشی کرشن چندر اپنے ناول شکست میں کچھ یوں کرتے ہیں:۔

> فیشن سے آپ کی کیا مراد ہے؟ غالباً اونچی ایڑھی کے جوتے پہنتی ہوگی، بالوں میں لمبے لمبے کلپ لگاتی ہوگی۔ ٹیڑھی مانگ نکال کر بالوں کو کانوں کے اوپر سنوارتی ہوگی۔ چوٹی گوندھ کر پیچھے اتنا لمبا زرکا لہریہ لگاتی ہوگی کہ میل دو میل تک لوگوں کو نظر آئے۔ لبوں پر لال روشنائی ایسا لپ سٹک۔ گالوں پر سُرخ غازہ، لمبے لمبے ناخنوں پر بوٹ پالش، ''دل کی جلن'' ''پریم کے خطوط'' پڑھتی ہوگی، اور سینما کی شایق تو ضرور ہوگی۔ دل کی آس، پرانا خاندان، نکمی دیدی، اس نے ضرور دیکھی ہونگی۔ ٹھیک ہے اور کیا چاہیے۔ بس چین ہی چین ہے[۴۶]

خوشی کے موقع پر گائے جانے والے گیت کرشن چندر کچھ یوں لکھتے ہیں جنہیں خواتین ڈھولک بجا کر گاتی ہیں:۔

منجھیں موڑیں، منجھیں دیاں سائیاں

سوہنے رانجھے نے مندراں پایاں

منجھیں موڑیں، منجھیں دیاں سائیاں

سوہنے رانجھے نے مندراں پایاں

رانجھا۔۔رانجھاتے رانجھا فقیر وے

ہیر لنگھ گئی دریاواں نوں چیر وے

جنہاں لایاں نی توڑ نبھائیاں

جنہاں لایاں نی توڑ نبھائیاں

سوہنے رانجھے نے مندراں پایاں[۴۷]

ناول میں چندرا اپنی ماں سے جھگڑتی ہے اور گھر واپس ہوتی ہے۔ چندرا کی ماں کی تنگدستی، غربت اور مجبوری اور پھر اس کی تمناؤں وخواہشوں کا اظہار ناول نگار نے اپنے طور پر کیا ہے۔ برسوں سے مصائب وآلام سہتے سہتے اس کی ماں اکتا چکی ہے اور اب وہ چاہتی ہے کہ ''چندرا'' بیاہی جائے اپنے گھر جائے اور پھر پنڈت سروب کشن، چندرا کی ماں کو دھان کا ایک کھیت خرید دے۔ پھر وہ ایک ہالی رکھ لے گی اور آرام سے زندگی بسر کرے گی۔ اس کی ساری عمر آرام اور سکھ کو ڈھونڈھتے گزری تھی۔ آرام اور سکھ تو اب کہاں؟ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بڑھاپے کے چار دن فاقہ کشی میں بسر نہ ہوں گے۔ چندرا کی ماں جانتی ہے کہ پنڈت سروب کشن کا بیٹا کریہہ صورت ہے، نامرد بھی ہے۔ لیکن چندرا کی ماں پھر بھی چندرا کا ہاتھ اسے تھمانا چاہتی تھی۔ چندرا بھی معاشرتی مظالم سے تنگ آ چکی تھی۔ لیکن وہ اپنی ماں کی طرح مفاہمت پر آمادہ نہیں چند روز کی خوشی کے لیے وہ دشمنوں سے مصالحت نہیں چاہتی تھی اسی سلسلے میں کرشن چندر کہتے ہیں:

> چندرا کا نظریہ یہ نہ تھا۔ اُسے گاؤں والوں، برادری، مہاجنوں، براہمنوں، سرکاری عہدیداروں، پنڈت سروب کشن، کسی پر اعتبار نہ تھا۔ سب ظالم تھے، چور، ڈاکو، اُچکے، بدطینت، انہوں نے زندگی بھر انہیں ستایا تھا اور آج وہ کس طرح، ان کے ہمدرد ہو سکتے تھے[۴۸]

ترقی پسندی کی اگر بات کی جائے تو کرشن چندر نے اپنے فکروفن کا آغاز ہی اسی تحریک سے کیا اور اس تحریک کے سرگرم رکن کی حیثیت سے مختلف سرگرمیوں کے دوران تجربات سے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو نکھارتے رہے۔ اور جب تحریک کو ضرورت پڑی تو بے لوث خادم کی حیثیت سے کئی موقعوں پر تحریک کے منصبوں پر فائز ہو کر خود تحریک کو سمت دینے کی ذمہ داریاں نبھاتے دکھائی دیئے۔ ان کی تحریروں میں ترقی پسندی کے فن کے جملہ عناصر کی بھرپور نمائندگی

دیکھنے کو ملتی ہے۔ جو کہ ان کے ناولوں کی تہذیبی فضا بھی ہے۔عوام دوست ہونے کی وجہ سے ادب کو عوام کی خدمت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سماج کی عکاسی کرتے ہوئے سیاسی جانب داری کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ کسانوں اور مزدوروں کی زندگی پیش کرتے ہوئے ان کی مظلومیت کی داستان سنانے میں کسی قسم کی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔ اور نہ ہی جابر زمینداروں و شاطر مہاجنوں کی عیاریوں کو پیش کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ بلکہ معاشی و معاشرتی و تعلیمی سطح پر ان کا معیار بلند کرنے اور ان کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنے کا وسیلہ بتاتے ہیں۔

ی۔ آگ اور شکست میں معاشی و معاشرتی اختلافات اور اشتراکات

i۔ معاشی اختلافات و اشتراکات:

عزیز احمد اپنے ناول آگ میں حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہاں تاجروں و سرمایہ داروں کا ایک سلسلہ ہے۔ جو کشمیری مزدوروں اور ان کی عورتوں کے استحصال و لوٹ کھسوٹ پر قائم ہے۔ اس ناول میں معاشی حالات کا فنی معیاروں پر تجزیہ کیا گیا ہے۔ کشمیر میں عزیز احمد کے بقول قالین بنائے جاتے ہیں۔ شالیں بنائی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے تاجر عام لوگوں سے سستے داموں خریدتے ہیں اور مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں اور بہترین زرمبادلہ کماتے ہیں۔ وہاں پر غربت، بے بسی، افلاس اور بھوک نے حسن بے مثال کو مجبور بنا دیا ہے۔ جو وہاں کے جاگیردارانہ نظام کی عطا کردہ ہے۔ بقول ڈاکٹر خالد اشرف:

> ناول کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور ایک شمول تاجر ''سکندر'' کے ذریعہ سے دکھایا گیا ہے۔ کہ کشمیری تاجر اور ڈوگر شاہی کے افسران کس طرح صدیوں سے غریب و ناخواندہ کشمیری مزدوروں اور کاریگروں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ کشمیری عوام اپنی جہالت اور غریبی کی وجہ سے نہایت غلیظ ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں اور بھیڑ بکریوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرتے ہیں اور اپنی عورتوں کی عزت کے دام وصول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں[۴۹]

یہاں یہ بات بڑی واضح ہو جاتی ہے کہ کس قدر معاشی حالات بگڑے ہوئے تھے کہ عورتیں دن رات کام کرنے کی بجائے اپنا جسم بھی کرایے پر بیچ دیتی تھیں تا کہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا جا سکے اور اس سب کے لیے ان کے مرد بھی راضی ہوتے تھے جو کہ خود بہت زیادہ کام نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ عزیز کے نزدیک ان میں تجارت کا شوق موجود تھا۔ اور یہ کرتے بھی تھے۔ اس کے علاوہ یہ کاروبار بھی کرتے تھے۔ قالینیں اور شالیں بناتے بھی تھے اور فروخت بھی کرتے تھے جو کہ ان کا سب سے بڑا کاروبار تھا۔ دنیا بھر کے لوگ آ کے خریدتے تھے۔ سبزیاں وغیرہ بھی اگاتے تھے اور

فروخت بھی کرتے تھے۔ اپنے آپ کو معاشی لحاظ سے بہتر کرنے اور زندگی کو آسان بنانے کے لیے یہ جیڈ کا سامان، مجسمے، گوتم بدھ کے بت، مورتیاں، چینی ترکستان، تاشقند اور بخارا کے بڑے بڑے آفتابے بھی بناتے تھے جن پر فارسی اور ترکی کے اشعار اور نقش و نگار کندہ ہوتے تھے کا کاروبار بھی بڑے شوق سے کرتے تھے۔ دوسری طرف اگر کرشن چندر کے ناول شکست کو دیکھا جائے۔ تو اس میں دیہاتی کشمیری عوام کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آج اگر کشمیری اتنے پریشان حال اور ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ تو اس کی سب سے بڑی وجہ اقتصادی صورت حال ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ طبقاتی سماج کی بنیاد ذرائع پیداوار کی غیر منصفانہ تقسیم پر ہے۔ جب تک یہ پیداواری وسائل چند ہاتھوں کی ملکیت رہیں گے اس وقت تک فاشزم استعماریت اور انسانوں کی انسانوں پر حکومت کا انسداد ممکن نہیں اور نہ ہی انسان ترقی کر سکتا ہے۔

کرشن چندر کے ہاں اپنے ناول شکست میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ کشمیری قالین اور شالیں اور اس طرح کی اور چیزیں بناتے ہوں جن سے وہ اپنی زندگی کو بہتر کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ ان کے ہاں کشمیری کھیتی باڑی کرتے ہیں مال مویشی اور مرغیاں وغیرہ بیچ کر اپنا گزر بسر کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ہاں طبقاتی کشمکش عروج پہ ہے۔ یہ چیزیں عزیز احمد کے ہاں نظر نہیں آتیں۔ عزیز احمد کے ہاں بھی عام کشمیری کھیتی باڑی کرتے ہیں لیکن وہ محض اپنی ضرورت کے لیے کرتے ہیں۔ جیسے چاول، لوبیا اور چند سبزیاں وغیرہ اور کرشن چندر کے ہاں ان سے لوگ زرمبادلہ کماتے تھے۔ کرشن چندر اپنے ناول میں انسانی مسائل، انسان کی غربت، بھوک، سرمایہ داری کا فریب، استحصال، سرمایہ و محنت کی کشمکش، سامراجی ذہنیت، حکمرانوں کی ریشہ دیوانیاں اور طبقاتی جدوجہد کو بہترین انداز سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسری طرف اگر عزیز احمد کو دیکھا جائے۔ تو وہ سماجی حالات، سیاسی استحصال، اقتصادی کسمپرسی، آزادی کا شعور بیدار کرنے اور نظام کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دونوں میں اگر کہیں اشتراک نظر آتا ہے تو اس میں سب سے پہلی چیز کھیتی باڑی اور مال مویشیوں کا پالنا ہے۔ اس کے علاوہ تجارت ہے۔ لیکن دونوں کا بیان کرنے کا اپنا طریقہ ہے۔ آگ اور شکست دونوں میں کہیں نہ کہیں مذہب کو اقتصادیات کے ساتھ بھی جوڑا گیا ہے۔ ہاں اگر وضاحت کے ساتھ معاشی لحاظ سے کسی کے ہاں اگر چیزیں ملتی ہیں تو وہ عزیز احمد اور ان کا ناول آگ ہے۔

ii۔ معاشرتی اشتراک و اختلافات:

عزیز احمد کے ناول آگ اور کرشن چندر کے ناول شکست میں کشمیر کی معاشرتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا گیا ہے۔ دونوں نے اس حوالے سے بہت محنت کی ہے کہ حقائق سامنے لائے جائیں۔ دونوں نے کشمیر میں بسنے والے لوگوں اور ان کی زندگیوں کو اصل حقیقت میں لانے کی بھرپور کوشش کی جس کے لیے انہیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہ درست ہے کہ دونوں کے جانچنے کا طریقہ کار اپنا ہے دونوں نے اپنے اپنے ناول میں جو معاشرتی منظر نامہ بیان کیا ہے۔ اس میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں دونوں کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن دونوں میں اہم ترین اشتراک غربت اور سماجی استحصال ہے۔ عزیز احمد اگرچہ کشمیری نہیں ہیں لیکن اس نے کشمیریوں کے رہن سہن، تہذیب، رسم و رواج معاشرت اور زندگی کے متعلق اتنی معلومات فراہم کی ہیں کہ انسان کی عقل دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ دونوں میں ایک مشترک بات تو یہ ہے کہ دونوں کے ہاں مال مویشی پالنے اور کھیتی باڑی کرنے کا رواج ہے۔ اور یہ دونوں کام مرد و خواتین مل کر کرتے ہیں ان میں سے زیادہ تر ریوڑ چراتے ہیں۔

عزیز احمد ناول آگ میں لکھتے ہیں:

> ''ادھر آگے شیو پورہ گاؤں ہے۔ ادھر گوجر لوگ بھی رہتا ہے۔ ڈھور ڈنگر گائے بکری چراتا ہے۔ جناب، گھاس چھیلتا، نکالتا ہے۔ جناب دودھ وغیرہ بھی بیچتا ہے''۵۰

مذہبی عبادت گاہوں کے حوالے سے بھی دونوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ دونوں کے نزدیک ایک بات مشترک ہے۔ کہ پہلے پہل مسجد اور مندر ساتھ ساتھ ہوتے تھے اور ہر ایک اپنی اپنی عبادت کرتا تھا کہیں کوئی جھگڑے کی فضا نہیں تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے اب سب سے زیادہ جھگڑے انہیں مقامات پر ہوتے ہیں۔ معاشرے میں عورتوں کے کام کے حوالے سے ایک پہلو جو دونوں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اس کو ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے اپنے مضمون عزیز احمد کا تصور تاریخ و تہذیب ناول نگاری کے تناظر میں کچھ یوں سامنے لاتی ہیں:

> کشمیر کے بازاروں میں صرف مزدور کشمیری عورتیں مزدوری کرتی اور چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ باقی تمام عورتیں خصوصاً اشرافیہ کے طبقے سے تعلق رکھنے والی عورتیں پردے میں رہتی ہیں نہ انہیں بیرونی سماج دیکھ سکتے ہیں اور نہ عام لوگ اس لیے 'آگ' میں کوئی ہیروئن نہیں ۵۱

دونوں ناولوں میں کہیں نہ کہیں اختلاف بھی ہے۔ کیونکہ ایک لکھنے والا مقامی ہے اور دوسرا مقامی نہیں ہے۔

شکست میں زیادہ تر شہری زندگی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اور وہاں کی زندگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ آگ میں دیہاتی زندگی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اور اس میں کشمیریوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شکست میں کرشن چندر بتاتے ہیں کہ زیادہ تر لوگ آپس میں مل کر کام کرتے ہیں اور ہنسی خوشی زندگی گزارتے ہیں حالانکہ آگ میں مل جل کر رہنے اور کام کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ ہر ایک اپنا کام خود کرتا ہے۔ یا کسی مزدور سے کرواتا ہے۔

ایک عجیب وغریب چیز جو دونوں میں مختلف دیکھنے کو ملی وہ ہے۔ گھوڑیوں، بھینسوں اور عورتوں کو ایک ہی طریقے اور ایک ہی قسم کے زیورات سے سنوارنا، شکست میں عورت کو گھوڑی کا نام دیا گیا ہے۔ اور اُسے جس طرح وہ اپنی گھوڑیوں اور بھینسوں کو سجاتے تھے عورت کو بھی بالکل اسی طرح سجاتے۔ اس بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ عورت کو بھی وہ گھوڑیوں اور بھینسوں کی طرح بیچتے تھے۔ حالانکہ ان کی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔ جبکہ آگ میں ایسی کوئی چیز کہیں نظر نہیں آتی جہاں عورتوں کو گھوڑیوں اور بھینسوں کی طرح سجایا جاتا ہوا اور بیچا جاتا ہو۔ ہاں البتہ یہ بات ضرور دیکھنے میں آئی ہے کہ زیادہ تر لوگ ہاؤس بوٹوں میں رہتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پانی میں گزرتا تھا۔ مچھلیاں وغیرہ پکڑتے تھے اور کھاتے تھے۔ جس کا کرشن چندر کے ناول شکست میں کہیں ذکر نہیں ملتا کہ لوگ پانی میں یا ہاؤس بوٹوں میں رہتے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عبدالمجید، خواجہ، ہندوستان کی اقتصادی تاریخ، دہلی، مٹیا محل، قدوسی پریس دہلی، ص ۱۷

۲۔ الک گھوش، ہندوستانی معیشت، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۷۴ء فروری، ص نمبر ۴۱

۳۔ ڈی ڈی کوسمبی، قدیم ہندوستان تہذیب و ثقافت، بک ہوم، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۶۵

۴۔ عزیز احمد، عزیز احمد کے چار ناول، گریز، ہوس، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، آگ، ص ۳۹۶ تا ۳۹۷

۵۔ ایضاً، ص ۳۹۹

۶۔ ایضاً، ص ۴۰۲

۷۔ ایضاً، ص ۴۰۹

۸۔ ایضاً، ص ۴۶۶

۹۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، عزیز احمد، ادب، تاریخ اور تہذیب ہند اسلامی کلچر کے عہد زوال کی چند جہات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۲۹۶

۱۰۔ عزیز احمد، عزیز احمد کے چار ناول، گریز، ہوس، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶، ص ۴۷۵-۴۷۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۶۶

۱۲۔ جواد یاسر، کشمیر و لداخ، الفیصل، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۵۰

۱۳۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، تاریخ کشمیر، سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء ص ۲۴۴

۱۴۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، تاریخ کشمیر، سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء ص ۲۵۱

۱۵۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، تاریخ کشمیر، ص، ۲۴۸

۱۶۔ ایضاً، ص، ۲۴۸

۱۷۔ میر، جی ایم، کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں، مکتبہ رضوان، آزاد کشمیر، ۲۰۰۱ء، ص ۲۴۶-۲۴۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۲۸

۱۹۔ محمد اسلم فاروقی، ڈاکٹر، عزیز احمد کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ، روشان پرنٹرز، ۲۰۱۵ء، ص ۹۰

۲۰۔ عزیز احمد کے چار ناول ص، ۵۲۴

۲۱۔ عزیز احمد کے چار ناول ص، ۵۲۶

۲۲۔ عزیز احمد کے چار ناول ص، ۵۰۳

۲۳۔ عزیز احمد کے چار ناول ص، ۵۵۹

۲۴۔ میر، جی ایم، کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ، رضوان پبلشرز میر پور، آزاد کشمیر، ۲۰۰۶ء ص ۱۱۸

۲۵۔ عزیز احمد کے چار ناول ص، ۵۲۶

۲۶۔ عزیز احمد کے چار ناول ص، ۵۲۶-۵۲۵

۲۷۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، آئینہ کشمیر، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۳۷

۲۸۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، آئینہ کشمیر، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۴۳

۲۹۔ ایم اے خان، کشمیر تاریخ کے آئینے میں، لالہ زار پبلشرز میر پور، آزاد کشمیر، ۱۹۹۱ء ص ۶۹

۳۰۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں۔ لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳۰

۳۰۔ میر، جی ایم، کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ، رضوان پبلشرز میر پور، آزاد کشمیر، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۷

۳۲۔ کرشن چندر، شکست، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۲

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۵

۳۴۔ ڈاکٹر صابر آفاقی، ص ۲۴۷

۳۵۔ ایضاً،ص۱۳۵

۳۶۔ ڈاکٹر صابر آفاقی،ص۸۰-۷۹

۳۷۔ کرشن چندر، شکست، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد،۲۰۰۲ء،ص۱۷

۳۸۔ ایضاً،ص۱۸

۳۹۔ ایضاً،۳۵-۳۴

۴۰۔ ایضاً،ص۴۸

۴۱۔ ایضاً،ص۵۲

۴۲۔ ایضاً،ص۹۹

۴۳۔ ایضاً،ص۱۲۶

۴۴۔ ایضاً،ص۱۲۶

۴۵۔ رفیق مسعود، ڈاکٹر، شیرازہ، سرینگر کشمیر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، جلد۴۵، شمارہ، ۸تا۱۱،ص۳۴۰

۴۶۔ کرشن چندر، شکست، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد،۲۰۰۲ء،ص۴۳

۴۷۔ ایضاً،ص۱۵۱

۴۸۔ ایضاً،ص۸۵

۴۹۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول،س ن،ص۲۹

۵۰۔ عزیز احمد، آگ،ص۵۲۵

۵۱۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، عزیز احمد کے ناول میں تاریخی اور تہذیبی عناصر ،ایک مطالعہ، تحقیقی زاویے، شمارہ۲،۲۰۱۳ء،ص۱۲۴

باب چہارم

شکست اور آگ میں کشمیر کی تہذیب وثقافت کا تقابل

ا شکست میں کشمیر کی تہذیب وثقافت

ب آگ میں کشمیر کی تہذیب وثقافت

ج آگ اور شکست میں پیش کیے جانے والے تہذیبی وثقافتی عناصر کا تقابل

۱۔ شکست میں کشمیر کی تہذیب وثقافت

اردو ناول کے جدید عہد میں شکست اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے بہت مشہور اور انفرادیت کا حامل ہے۔ یہ کرشن چندر کے تمام ناولوں میں سے فنی اعتبار سے بہت زیادہ پبلش ناول ہے۔ جسے پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کشمیر کی اس بیان کردہ زندگی اور تہذیب وثقافت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی زندگی اور وہاں کے رہنے والوں کی تہذیب وثقافت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اکثر جگہوں پر کشمیر کے باسیوں کی غربت اور استحصال کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ کیونکہ ناول میں روایتی جاگیردارانہ سماج کی کشمکش کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ناول میں بظاہر تو دو کہانیاں متوازی چلتی دکھائی دیتی ہیں۔ جن میں سے ایک شیام اور ونتی کا قصہ ہے اور دوسرا موہن سنگھ اور چندرا کی محبت کا قصہ ہے۔ لیکن انہی کے اندر وہاں کی مکمل تہذیب وثقافت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ شکست ایک ایسا ناول ہے جس میں کہیں کشمیر کے دلفریب اور قدرتی مناظر کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں اور کہیں کشمیر کے مظلوم عوام فرسودہ روایات میں جکڑے ہوئے اور معاشرتی ناانصافیوں سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ وہ ان سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ مگر تہذیب انہیں ایسا کرنے سے بعض رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں ثقافتی روایات کے خلاف بات ہے۔ کرشن چندر اپنے ناول میں کشمیر کی تہذیب وثقافت کو اس انداز سے پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ عام کشمیری جو کہ صدیوں سے مشکلات کا شکار ہے اس کے ضمیر کو بیدار کیا جائے۔ ڈاکٹر خالد اشرف اس حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''شکست کی اہمیت نئی اور پرانی قدروں کی آویزش کی وجہ سے ہے۔ فطرت کا حسن اور فطرت کی گود میں پلنے والے انسان کے کردار اور ضمیر کی بدصورتی اس ناول کا موضوع ہے۔ کرشن چندر کی ہمدردیاں محبت کرنے والی نئی نسل کے ساتھ ہیں لیکن وہ چونکہ ایک حقیقت نگار بھی ہیں اس لیے جانتے ہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ دیہی معاشرے میں دو محبت کرنے والے بغیر کسی روک ٹوک اور دباؤ کے ایک دوسرے کو آزادانہ طور پر چاہ سکیں اور ایک دوسرے کو اپنا کر بہتر زندگی گزار سکیں۔''(۱)

شکست میں دو کہانیاں ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہیں۔ اور انہیں سے کشمیر کی تہذیب وثقافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں میں محبت کا عنصر غالب ہے۔ سماج اور مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔

شکست کا انداز بیان شاعرانہ ہے۔ اس میں مختلف خوبصورت مناظر کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ لیکن

ناول کا موضوع نہایت سفاک اور الم ناک حقیقت پر مبنی ہے جس سے اس وقت کی تہذیب و ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسی تھی۔ محبت، مذہب، روایات اور دھرم کو سماج میں کیا حیثیت حاصل تھی۔ حیات افتخار لکھتے ہیں:

> ''اس ناول کا موضوع دراصل دو نوجوانوں کی محبت میں ناکامی کا مسئلہ ہے جس کا ذمہ دار ایسا سماج ہے جہاں پر مذہب، دھرم اور مذہبی روایات کے نام پر محبت جیسے انسان کے بنیادی جذبہ کا بھی استحصال کیا جاتا ہے اس موضوع کو کشمیر کے فطری حسن کے پس منظر میں پیش کر کے کرشن چندر نے فطرت کی خوبصورتی اور انسانی اعمال کی بدصورتی کے تضاد کو پیش کیا ہے۔''(۲)

اردو ناول میں کردار ہی انسان کی تہذیب و ثقافت اخلاقیات، سماج، مذہب، جذبات اور دیگر پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ کسی بھی معاشرے کے تمام پہلو سے اپنے آپ کو روشناس کرواتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسانی معاشرہ آگے بڑھتا ہے اور اس میں وہ تمام پہلو زیر بحث لائے جاتے ہیں جن پر کسی معاشرے کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں کو دیکھنے کے بعد جب ہم شکست کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہم براہ راست ایک معاشرہ یا اس کی تہذیب کے اندر سفر کر رہے ہیں۔ اس ناول میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کے حوالے سے بہت خوبصورت انداز سے بتایا گیا ہے کہ ان کے درمیان تعلقات گذشتہ بیس سالوں میں کشیدہ ہوئے ہیں ورنہ اس سے پہلے سب اکٹھے رہتے، عبادات کرتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔ حالانکہ یہاں پر ایک سوال بھی جنم لیتا ہے کہ آخر ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک ہی مذہبی مقام کیسے متبرک ہوسکتا ہے۔ تو اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ دراصل اس میں ہمارے بزرگوں نے نہایت دانشمندی سے کام لیتے ہوئے ان کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور تہذیب و ثقافت میں سمونے کی کوشش کی۔ یہاں برہیز کی قبر اور پانڈوؤں کے محل ساتھ ساتھ ہیں۔ انت ناگ میں مسلمانوں کی عبادت گاہ اور ہندوؤں کا مقدس تالاب ایک ہی جگہ پر ساتھ ساتھ ہیں۔ دونوں اپنے اپنے طریقے اور اپنی اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرتے ہوئے اخوت اور یگانگت محسوس کرتے تھے۔ دیہاتوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ مندر یا دھرم شالائیں اور مسجدیں آپ کو ساتھ ساتھ نظر آئیں گیں۔ یہ وہ وقت تھا جب کسی کا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں تھا سب مل جل کر خوشی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ اب یہ جھگڑے شہروں میں انہیں جگہوں پر زیادہ ہوتے ہیں جہاں مندر اور مسجدیں ساتھ ساتھ ہیں۔ لیکن یہ وبا ابھی کشمیر کے دیہاتوں تک نہیں پہنچی۔ یہاں سالانہ ایک پیر کا میلہ لگتا ہے وہاں بھی آپ یہاں کے لوگوں کی مشترکہ ثقافت دیکھ سکتے ہیں انسان اور سماج کا آپس میں کیا رشتہ ہے اور زندگی کیسی گزرتی ہے۔

شادی بیاہ کی رسومات کیسے ادا کی جاتی ہیں۔ مسلمانوں میں اس کا رواج کیا ہے اور ہندوؤں میں یہ کس رواج

کے ساتھ ہوتی ہیں۔ رہن سہن اور خاندانی نظام دونوں کا کیسا ہے۔ کیونکہ مسلمان عام طور پر رشتہ داروں میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ تاکہ اگر کوئی مسئلہ ہو بھی جائے تو خاندان کے بڑے بیٹھ کے دونوں خاندانوں کے درمیان صلح صفائی کروا سکیں۔ لیکن ہندوؤں کے ہاں ایسا ہرگز نہیں ہے وہ اپنی سے نیچ قوم کے لوگوں کے ساتھ شادی جیسا بندھن نہیں جوڑتے۔ کرشن چندر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''سماج بڑی بھاری طاقت ہے۔ سماج انسان کی اجتماعی عقل اجتماعی قوت کا دوسرا نام ہے۔ سماج سے انحراف کسی صورت میں اچھا نہیں ہوسکتا۔ میں آپ سے کہہ دیتا ہوں کہ براہمن لوگ ابھی سے چہ میگوئیاں کر رہے ہیں وہ سوچ رہے کہ کہ کس طرح موہن سنگھ اور چندرا کو الگ الگ کر دیا جائے اگر موہن سنگھ کو گاؤں میں رہنا ہے تو اسے برادری کے آگے سر جھکانا ہوگا۔''(۳)

شادی بیاہ کی رسومات کے حوالے سے تحسین جعفری کاشمیری اپنی کتاب کشمیر لوگ روایات کے آئینے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ان رسومات کو کشمیری ایک مقدس سماجی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ ان رسومات کی روح جذبہ اتحاد و یگانگت اور الفت و محبت ہوتا ہے۔ کیونکہ کشمیری مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کی ثقافت کی بنیاد ہی مذہبی تعلیمات اور مذہبی روایات پر رکھی گئی ہے۔ اگر ان رسومات میں کسی جگہ مذہب سے ہٹ کر کوئی بات آ گئی ہے تو وہ لاعلمی کا نتیجہ ہے۔''(۴)

شیام راستے پر چلتے چلتے سوچنے لگا کہ علی جو کہ باتیں کتنی ٹھوس ہیں۔ جیسے کسی ڈاکٹر کا نسخہ، اس کی باتوں میں جامعیت تو ہے لیکن حرکت نہیں ہے۔ کیا انسان حرکت، اضطراب اور بغاوت کے بغیر ترقی کر سکتا ہے۔ خود انسانی سماج نے پچھلے چند ہزار سالوں میں جو ترقی کی ہے کیا اسی حرکت اور بغاوت کا نتیجہ نہیں ہے۔ مذہب کے پتھر کیا باغی نہ تھے کیا انہوں نے اپنے سماج سے بغاوت نہیں کی تھی۔ کیا انہیں اپنے دور میں مختلف نام نہیں دیئے گئے۔ لیکن اگر زندگی جم کر بیٹھے کر رہنے کا نام ہے تو پھر موت کسے کہتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ اگر انسان کے دل میں اس فطری بغاوت کا شعلہ بلند نہ ہوتا، تو وہ شاید آج اسی طرح جنگلوں میں لنگور کی طرح دم لٹکائے درختوں پر چھلانگ رہا ہوتا۔ اپنے اندر آگے بڑھنے کے جذبے کے ساتھ انسان نے سماج سے بغاوت کی تو آج اس سطح پر ہے۔ اگر بغاوت کر کے آگے نہ بڑھتا تو آج تہذیب یافتہ نہ کہلاتا اور نہ ہی ثقافت سامنے آتی۔

کرشن چندر نے ناول کے مکالموں کے ذریعے کرداروں کی باطنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کے

ایک خاص عہد کو زندہ کر دیا ہے۔ مثلاً شیام اور پجاری کے درمیان مورتی کے حوالے سے ہونے والی گفتگو کشمیر کے ہندو طبقے کی توہم پرستی کو وہ کچھ یوں ظاہر کرتے ہیں۔

''اس نے پجاری سے پوچھا۔''یہ مورتی یہاں کیسے آئی؟ جی یہ پنڈت سروب کشن جی کے دادا کو زمین کھودتے ملی تھی۔۔۔ منیڈھ کو چوڑا کرنے کے لیے زمین کھود رہے تھے۔ ان کی کدالی کسی سخت چیز سے ٹکرائی اور زمین سے لہو کی دھار بہہ نکلی وہ کانپ گئے اور آہستہ سے مٹی پرے ہٹانے لگے جب انہوں نے مٹی پرے کی تو انہیں اس دیوی کا سر نظر آیا خون میں لت پت۔ لیکن یہ سر تو پتھر کا ہے شیام نے حیران ہو کر پوچھا۔ اس سے خون کی دھار کیسے؟''(۵)

ناول میں محبت کی کہانی بہت جاندار ہے جو کہ کسی بھی جگہ کسی تہذیب و ثقافت کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ اس ناول میں مختلف کرداروں کے خیالات اور جذبات و احساسات مکالموں کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر موہن سنگھ اور چندرا کے مکالموں کو اگر پڑھا جائے تو ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ موہن سنگھ سے کس قدر محبت کرتی ہے اور اس محبت کو پانے کے لیے سماج اور دھرم کی ہر پابندی توڑنے کے لیے تیار ہے جیسا کہ:

''لڑکی کہہ رہی تھی کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ دنیا کیا کہتی ہے۔ میری ماں خوش ہوتی ہے یا ناراض ہوتی ہے میرے لیے تم ہی سب کچھ ہو لیکن یاد رکھو اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو میں تمہارا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ دوں گی۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے۔ موہن سنگھ ہنس کر کہنے لگا۔ جان بوجھ کر انجان بنتی ہو۔ سو بار آزما چکی ہو۔ جب چاہے پھر آزما کر دیکھ لو۔ موہن سنگھ راجپوت ہے۔ اپنے قول کا سچا ہے اس کی محبت کوئی کچا دھاگہ نہیں۔''(۶)

اس طرح جب موہن سنگھ ہسپتال میں زخمی حالت میں پولیس کے نرغے میں ہوتا ہے تو چندرا بھاگنے کی ترکیب پر غور کرتی ہے۔ عام طور پر معاشروں میں اور خاندانوں میں سختیاں حد سے بڑھ جائیں اور تربیت کی کمی ہو تو اس طرح کی چیزیں سامنے آتی ہیں۔ حالانکہ جن معاشروں میں خاندانی سسٹم ٹھیک ہو تو وہاں اس طرح کے واقعات بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہی وہ واقعات تو ہیں جو اصل تہذیب و ثقافت سے مختلف ہیں اور یہی خرابی کا باعث بن رہے ہیں۔ کرشن چندرا اپنے ناول میں چندرا کے خیالات کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''وہ اچھا ہو جائے گا، چندرا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا بھاگنا تو کوئی مشکل نہیں، میں کوئی نہ کوئی سبیل ڈھونڈ لوں گا پھر ہم کہیں دور علاقے میں، کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے۔ کچھ عرصہ بھیس بدلے

رہیں گے اور جب شور شرابہ ختم ہو جائے گا۔ ہم پھر سے اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔''(۷)

ناول چونکہ انسانی زندگی، اردگرد پھیلے ہوئے معاشرے، اقدار اور انسانی رویوں کا عکاس ہوتا ہے اس لیے ناول نگار جہاں کرداروں کے باطنی اور خارجی رویوں کو سامنے لاتا ہے۔ وہاں معاشرت اور مناظر فطرت کو بھی بیان کرتا ہے۔ شکست بھی ایک ایسا ناول ہے جس کی کامیابی کا راز اس کی منظر نگاری میں پوشیدہ ہے جس کو کرشن چندر نے بڑے خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا زمانہ کشمیر میں گزارا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی تہذیب، ثقافت، جھلیں، آبشاریں، کوہسار، معاشرت، زعفران کے کھیت اور نسوانی حسن ان کے بیشتر ناولوں اور افسانوں کا موضوع بنا۔ شکست میں بھی کشمیر کا قدرتی حسن اس کی تہذیب و ثقافت، اونچے اونچے سرسبز پہاڑ، چیڑ اور چنار کے درخت، گیت گاتی آبشاریں، مترنم چشمے اور بل کھاتی ہوئی ندیاں کشمیر کا سچا اور حقیقی منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انوار پاشا شکست میں پیش کیے گئے منظر نامے کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''ناول کے پس منظر میں کشمیر کی حسین وادی ہے۔ لہٰذا شروع سے آخر تک حسن کی نیرنگیاں بکھری ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر پوری کتاب پیش کی جاسکتی ہے۔ کہیں سے کوئی حصہ اٹھا لیجئے۔ فطرت کی حسین عکاسی اور دلکش منظر نگاری ملے گی۔ جو شاید کشمیر کی وادی کے حقیقی حسن سے بھی زیادہ حسین لگتی ہو۔''(۸)

کرشن چندر نے نہ صرف کشمیر کے قدرتی مناظر کو بیان کیا ہے۔ بلکہ مختلف کرداروں کے ذریعے کشمیری لوگوں کے رہن سہن کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے سامنے کشمیری معاشرت کا نقشہ گھوم جاتا ہے۔ مثلاً پنڈت سروب کشن کو برہمن ہونے کی وجہ سے اس معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ وہ کشمیر کی دیہاتی زندگی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں کی موسمی رسومات ان کے علاقائی ناچ فصلوں کے پکنے کے ایام میں کسانوں کی خوشیاں، پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں بن جاتی ہیں۔

سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

''شکست میں فرد کے ذہن اور اس کے گرد و پیش کے ماحول کا اضطراب فطرت کی حسین دنیا میں پناہ لینے کی کشش کرتا ہے اور کبھی کبھی فطرت کا حسن آوارہ، اس حسن کی پرسکون آغوش، مضطرب انسان پر خود فراموشی طاری کر دیتی ہے اور زندگی میں حسن فطرت کے رومان کے علاوہ ہر حقیقت

کھوکھلی اور بے جان معلوم ہوتی ہے۔''(۹)

اس ناول میں کشمیر کی زندگی کا بیان ہے کہ وہاں کے رہنے والے لوگ کیسے اپنے شب و روز گزارتے ہیں۔ ان کی تہذیب و ثقافت کیا ہے۔ وہ کیسے رہتے ہیں۔ کرشن چندر کی زندگی کا ابتدائی زمانہ کیونکہ کشمیر میں گزرا۔ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے اردگرد افلاس، بے بسی اور مصائب کے مارے ہوئے کشمیریوں کو دیکھا اس لیے ان کے بیان میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ کرشن چندر کشمیر کے مناظر کے ذریعے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس خوبصورت منظر کے پس منظر میں کس قدر بدصورتی ہے۔ کشمیر کے اندر بسنے والے کشمیریوں کے مسائل کو بیان کیا جو صدیوں تک استحصال کا شکار رہے۔ کیونکہ اس وقت کشمیر کی تہذیب ہی ایسی تھی۔ کشمیر کا حسن اور کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی مجبوری اور بے چارگی کو اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ کشمیر کی حالت زندگی ان کے رسم و رواج اور سماج کے بارے میں علی عباس حسینی کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''کرشن چندر کے ناول شکست میں بھی تانا بانا رومانی ہے۔ اس رومان کو وادی کشمیر کے پرفضا منظر اور کرشن چندر کی دلکش تحریر نے اور بھی دلفریب بنا دیا ہے۔ وہاں کے تروتازہ درخت اور ان کی پھلوں پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیاں وہاں کی اونچی نیچی اور ان پر پرافشاں مانگ کی طرح چمکتے ہوئے رواں دواں چشمے اور ندیاں صاحت ہونے پر بھی شکست میں بولتی تصویریں بن گئی ہیں۔ لیکن اس فردوس گوش اور جنت نگاہ میں ایک افعی بھی ہے کالا، خطرناک، زہر سے پر، وہ ہے وہاں کا جاہل، پارینہ رسم و رواج کا جکڑا ہوا، چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بکھرا ہوا سماج۔ ان دیہاتوں کے نیم مردہ، بہام صفت باشندوں میں بھی اب اپنی زبوں حالی کا احساس پیدا ہونے لگا ہے۔ وہ ان زنجیروں کو جو انہیں صدیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی کھڑکھراتے ہیں، کبھی کبھی جھٹکنے دیتے ہیں لیکن کڑیاں مضبوط ہیں، آہنی حلقے ان کمزوروں کے ہاتھوں سے نہیں ٹوٹتے۔ یہی ان کی شکست ہے۔''(۱۰)

کرشن چندر کے ناول میں عورت کو کام کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کہ وہ کیسے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اپنے مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ سیداں کے ہاتھ میں درانتی ہے جس سے وہ گھاس کاٹتی ہے۔ اس کے علاوہ کبھی اس کے ہاتھ میں کدالی، کبھی گھاس کا گٹھا، ساگ، وہ کیونکہ خود مزدور تھی اس لیے اس کے ہاتھ میں بروقت کوئی نہ کوئی چیز ہوتی ہے۔ کام کی وجہ سے اس کی قمیض کہنیوں سے پھٹ چکی تھی۔ ہاتھ متواتر کام کرنے سے بدنما اور بدصورت دکھائی دے رہے تھے۔ بھورے، میٹالے، مینڈک کے ہاتھ پاؤں کی طرح، لیکن کہنیوں کے قریب جہاں پر قمیض پھٹی ہوئی تھی جلد

کی رنگت دودھ کی طرح صاف اور بے داغ دکھائی دیتی تھی۔ بے چاری سیداں سوچتی ہے کہ مزدور عورت کی زندگی اور حسن بھی ایک ڈھلتی چھاؤں کی طرح ہے۔ جو کہ دو دن میں کام کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ فطری حسن کسی چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ ہاں لیکن وہ یہ چاہتی ہے کہ اس کا حسن دیر تک قائم رہے کیونکہ وہ مزدور ہے۔ بڑے اور اوپر کے طبقے کی عورتیں تو سارا دن فارغ بیٹھی رہتی ہیں اور فیشنوں میں غرق رہتی ہیں۔ ایسی ہی عورت کے بارے میں کرشن چندر کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''شیام نے سوچا، اگر ایسی عورت کو دن بھر مشقت کرنے کے بعد پیٹ بھر کر کھانا بھی نہ ملے تو پھر؟ شیام نے آج تک ایسی عورت نہ دیکھی تھی جو کھانا کھائے بغیر اپنے حسن کی آب و تاب کو برقرار رکھ سکتی ہو۔ گو بعض لوگوں کے ذہن میں سچی خوبصورتی کی یہی معراج ہے۔''(۱۱)

سماج کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی بیوہ مر جائے تو کوشش کرتے ہیں اس کا مال ہتھایا جائے جیسا کہ چندرا کی ماں کے ساتھ ہوا سب سے پہلے تو اسے معاشرے میں تنگ کیا جانے لگا یہاں تک کہ فاقوں کی نوبت آ گئی لیکن وہ اس کا مقابلہ کرتی رہی۔ اس دوران اسے بہت دھمکیاں بھی ملیں کہ تم اپنے بیٹی چندرا کا بیاہ ہماری مرضی سے کرو ہم آپ کی تمام ضروریات کا خیال رکھیں گے لیکن وہ یہ سب دیکھ چکی تھی اس لیے اب اسے گاؤں والوں، برادری، مہاجنوں، براہمنوں، سرکاری عہدیداروں، پنڈت سروب کشن سمیت کسی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ سب ظالم تھے، چور، ڈاکو، اُچکے، بدنیت، انہوں نے زندگی بھر اسے ستایا تھا آج کیسے ممکن تھا کہ وہ سب اس کے ہمدرد ہو جاتے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی بیٹی چندرا کی خاطر آ جاتی حالانکہ چندرا اپنی ماں سے کہتی کہ یہ کبھی آپ کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی ماں کی خوش فہمی پر حیران بھی ہوتی۔

چندرا کا یہ خیال تھا کہ ان کے دھرم، ان کی برادری اور عزت کا سوال ہے اس لیے سب کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن چندرا ہے کہ وہ موہن کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ اچھا ہو جائے ہم دونوں اکٹھے رہیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ میری زندگی بھی تلخ کر دیں گے کیونکہ جو جہاں کی تہذیب ہوتی ہے ویسی ہی چیزیں وہاں ہو رہی ہوتی ہیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد موہن سنگھ مر گیا چندرہ سے یہ صدمہ برداشت نہ ہوا اور وہ پاگل ہو کر گلیوں کی خاک چھاننے لگی۔

گاؤں میں کام لوگ مل جل کر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ کشمیر کی ثقافت کا بہت ہی اہم پہلو تھا۔ جب بھی فصلیں تیار ہوتیں لوگ اپنی درانتیاں وغیرہ تیز کروا لیتے تھے اور ایک دوسرے کی فصل کاٹنے کے لیے باریاں طے کر

لیتے تھے۔ جس دن جس کی فصل کی کٹائی ہوتی تھی، اس دن اس کے ہاں صبح سے ہی ڈھول بجنا شروع ہو جاتے تھے۔ کام کرنیوالوں کے لیے زبردست کھانا، پینے کے لیے شربت اور لسی کا بندوبست کیا جاتا اور خوب ہلہ گلہ ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ شام تک چلتا تھا اگر کام مکمل ہو جاتا تو لوگ گھروں کو چلے جاتے اور اگر مکمل نہ ہوتا تو ادھر ہی کچھ سو جاتے اور کچھ ساری رات مختلف قسم کے شغل لگاتے۔ اس کام کرنے میں خواتین بھی اپنا پورا حصہ ڈالتی تھیں اور مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتیں تھیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس وقت کوئی تعصب اور تفرقہ نہیں تھا۔ براہمن، مسلمان، سکھ مرد اور عورتیں سب مل کر کام کرتے تھے۔ کٹائی کے دوران گروپوں میں مقابلے کروائے جاتے تھے جو کہ اور زیادہ دل چسپ بنا دیتے تھے۔ کرشن چندر اپنے ناول میں لکھتے ہیں:

> ''شربت اور لسی وغیرہ پی کر سب لوگ تیار ہو گئے ان لوگوں نے گھاس کاٹنے کے لیے سب سے پہلے گھاٹی کو چنا۔ جو اک ڈھلان کی صورت میں نیچے دھان کے کھیتوں سے جا ملتی تھی۔ یہاں سارے لیتری والوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصے کا سردار مسٹر گنگو بنا۔ دوسرے کا دُلا۔ دونوں کے پاس چالیس پچاس کے قریب آدمی تھے۔ ایک کو باغ کے سرے پر بٹھایا گیا اور دوسرے کو وسط میں اور کہا گیا جو پہلے اپنا حصہ مکمل کرے گا وہ دوسرے سردار کے کندھے پر بیٹھ کر پورے کھیت کا چکر لگائے گا۔''(۱۲)

شیام ابھی چھوٹا تھا لیکن جب اس نے یہ منظر دیکھا تو وہ گھر چلا گیا وہاں سے کپڑے تبدیل کر کے اور درانتی لے کر مسٹر گنگو کے پاس چلا گیا اور کہا مجھے بھی گھاس کاٹنا سکھاؤ۔ مسٹر گنگو نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا بابو صاحب آپ کو کاٹنے کی کیا ضرورت ہے کرسی پر بیٹھ کر ہمارا تماشہ دیکھو۔ لیکن شیام نے مسکرا کر جواب دیا نہیں مجھے کاٹنا سکھاؤ مسز گنگو نے کہا یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ جلدی تھک جاؤں گے۔ لیکن اس کے اسرار پر اس نے اسے درانتی چلانا سکھایا اور کہا اب آہستہ آہستہ شروع کرو خود بخود سے ہاتھ تیز ہو جائے گا۔ اس نے کام شروع کیا لیکن کچھ ہی دیر بعد اسے بہت زیادہ پیاس لگ گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو ونتی پانی پلا رہی تھی شاید عورت کی چھٹی حس کام کرتی ہے وہ فوراً شیام کو پانی پلانے آئی۔ اور اسے پانی دیا جو کہ اس نے جی بھر کے پیا۔ لیکن جب وہ درانتی چلا رہا تھا تو اس وقت اسے محسوس ہوا جیسے وہ اک نئی زبان، اک نئے ادب، ایک نئی تہذیب اور ایک نئی زندگی سے آشنا ہو رہا ہے۔ یہ ایک نئی دنیا تھی اس کے اپنے اصول تھے، جیسے درانتی ایک قلم اور زمین ایک تختی ہو۔

کرشن چندر ناول میں زمین کے بارے میں کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں:

''شاباش میرے بیٹے۔ درانتی چلائی جا، یہ تیری تہذیب کی بنیاد ہے تیرے مذہب کی خالق ہے، تیرے جسم کی روح ہے اسی سے تیری مسرتوں اور شادمانیوں کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں اس سے تیرے ادب کو رفعت اور تیرے فلسفے کو برتری حاصل ہوتی ہے۔ اس سے تری قوم کی آزادی اور تیری عورتوں کی عصمت محفوظ ہوتی ہے دنیا میں غمی اور قحط اور جنگ اسی وقت آتے ہیں جب انسان درانتی چلانا بھول جاتے ہیں۔''(۱۳)

شیام درانتی چلا رہا تھا اور اس کے ہونٹ خشک ہوتے جا رہے تھے۔ جو کہ پانی سے تر ہو جاتے تھے۔ لیکن ایک دم اس کے منہ سے سی کی آواز نکلی اور اس نے دیکھا تو درانتی اس کی انگلی کاٹ چکی تھی اور اس سے لہو بہہ رہا تھا۔ لیکن اس نے سر جھکا لیا اور گھاس کے خوشے کاٹنے لگا۔

یہاں پر ایک اور اہم بات یہ ظاہر ہوتی ہے ناول نگار کا انسانیت وصداقت اور عالمی بھائی چارگی پر مکمل ایمان ہے۔ یہ ایک ایسے سماج کی تمنا کرتے ہیں۔ جہاں پر نہ تو کوئی حکمران ہو اور نہ کوئی محکوم۔ جہاں پر امیر غریب کا کوئی امتیاز نہ ہو جہاں پر نہ کوئی مسلمان ہو اور نہ کوئی ہندو ہو اور نہ کوئی سکھ ہو اور نہ کوئی عیسائی، جہاں پر عورتوں، پسماندہ طبقوں پر کسی قسم کا ظلم نہ ہو، جہاں پر طبقاتی یا فرقہ وارانہ تفریق یا کشمکش نہ ہو جہاں پر آپس میں اختلاف ونفرت نہ ہو۔ بلکہ اس جگہ پر اتحاد، محبت، اخوت اور انسان دوستی کارفرما ہو۔

بقول کرشن چندر:

''میں ہندو مسلمان تو کیا دنیا بھر کے انسانوں کو بھائی سمجھتا ہوں اور انہیں الگ دیکھنے کی بجائے انہیں اکٹھا مل جل کر امن وآشتی سے ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوئے ایک بہتر تہذیب ایک بہتر نظام زندگی، ایک بہتر فلسفے کو تعمیر کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب تک ایک انسان دوسرے انسان کو بعینہ وہی حقوق نہ دے گا جو وہ اپنے تئیں محفوظ رکھنا چاہتا ہے دنیا میں کبھی امن وامان قائم نہیں ہوسکتا۔''(۱۴)

ناول نگار نے اپنی تخلیقات میں انسانی نقطہ نظر سے ہندو مسلم تفرقہ کے نظریہ کی سخت مخالفت کی ہے۔ انگریزوں نے پہلی مرتبہ ہندوستان میں اپنے خلاف متحدہ کوششوں کا سر کچلنے کے لیے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' والی جو پالیسی اپنائی تھی اپنے ناولوں میں جگہ جگہ انہوں نے اس برائی سے پردہ اٹھایا اور فرقہ ورانہ ہم آہنگی کا سبق دیا۔ اسی وجہ سے انہوں نے ہندوستان کی ایک صدی قبل والی زندگی کو ترجیح دی۔ جب کہ تمام فرقوں کے درمیان قومی یکجہتی قائم تھی۔ جس

کی نظر آج کے ہندوستان میں ملنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے یہ مشترکہ قومی کلچر کے نظریے کے قائل ہیں۔ جہاں پر ہر فرقے کو اپنی تہذیب اور کلچر کے تحفظ کا اختیار ہوگا اور انہیں آزادانہ فضا میں پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ تہذیبوں کے درمیان آپس کے لین دین اور ایک دوسرے کے صالح عناصر کو قبول کرنے کا عمل بھی جاری رہے گا۔ اسی بارے میں احمد حسن لکھتے ہیں:

> ''میرا نظریہ یہ ہے کہ برصغیر میں ایک سے زیادہ قومیں رہتی ہیں ایک سے زیادہ کلچر ہیں۔ ہماری فلاح و بہبود اسی میں ہے۔ کہ تمام قوموں اور ان کے مخصوص کلچروں میں رواداری پیدا کی جائے اور ان کی مخصوص قدروں کا تحفظ ہو۔''(۱۵)

جب سب پیر کے میلے پر جا رہے تھے تو شیام اور ونتی بھی اپنے اپنے گھوڑے پر ان کے ساتھ تھے۔ وہ اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے ان سے الگ ہو گئے اور بچھڑ گئے۔ اسی دوران دونوں نے آپس میں بہت ساری باتیں کیں۔ اور پھر آگے جا کے ان کے ساتھ مل گئے۔ یہ وہ لمحات تھے جب شیام کو ونتی سے محبت ہو جاتی ہے۔

جب سب میلہ دیکھ کر واپس آئے تو کیونکہ شیام ایک طالب علم تھا اس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ وہ ایک طرف اپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا اور دوسری طرف اسے موہن سنگھ کی موت اور ونتی سے جدائی کا بہت دکھ تھا۔ شیام ونتی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے ماں باپ کے ہاتھوں بہت مجبور تھا۔ کیونکہ اس کا سماج اور ونتی کا سماج اس رشتے کے خلاف تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ذات پات اور امیری غریبی تھی۔ جو کہ ایک دیوار کی طرح حائل تھی۔ ان دونوں کی دنیا لگ تھی وہ اپنے ماں باپ کا اقتصادی غلام تھا۔ وہ ونتی کے لیے بھاگ نہیں سکتا تھا اور ونتی کی رخصتی کے دن قریب آ رہے تھے جس کی شادی پنڈت سروب کشن کے بیٹے درگا داس کے ساتھ ہو رہی تھی۔ جو انتہائی بدشکل تھا۔ ڈھول بج رہے تھے تیاریاں عروج پر تھیں۔ شیام مجبور تھا اس نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر چلا چلا کر کہتے ہوئے یہ سنا کہ ونتی مر گئی ونتی مر گئی۔ شیام نے ماں کا ہاتھ جھٹک دیا شگنوں کا تھال دھڑم سے فرش پر جا گرا۔ ونتی سروب کشن کے گھر نہ تھی۔ وہ صبح سویرے ندی پر نہانے کے لیے گئی تھی اور پھر واپس نہ آئی تھی یہ سب اس نے اس لیے کیا کیونکہ وہ درگا داس سے خوش نہ تھی اس سے نفرت کرتی تھی۔ پھر وہ لمحہ بھی آیا جب ونتی کی سہلیاں، درگا داس اور شیام سب ساکت کھڑے ہو کر دیکھ رہے کہ ونتی کی چتا جل رہی ہے۔ لیکن کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری طرف چندرا ایک ایسا کردار ہے جس کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ لڑکی بڑی حرامزادی ہے کسی سے بیاہ نہیں کرتی کسی کے قابو میں نہیں آتی اس کی بیوہ ماں کو پٹواری تین ہزار روپے دیتا تھا اس قیمت پر یہ گھوڑی میری نہ

تھی۔ پر کمبخت بیوہ نہ مانی۔ گاؤں والوں نے دونوں ماں بیٹی کو گھر سے نکال دیا۔ اس کی ماں نے ایک غیر ذات آدمی سے شادی کر لی تھی۔ جو جموں سے یہاں آیا تھا۔ یہ چندرا اسی کی لڑکی ہے۔ چمار مر گیا۔ اب یہ لڑکی ہے اور اس کی ماں اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا۔ لوگ انہیں اپنے گھروں میں گھسنے نہیں دیتے۔ بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے ان کی۔ اگر بیوہ یہ لڑکی بیچ دے تو ان کے دن پھر جائیں۔ پر یہ بیوہ بڑی کم ذات ہے۔

''چندرا'' موہن سنگھ سے محبت کرتی ہے۔ موہن سنگھ ایک راجپوت گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اور چندرا ایک اچھوت کی لڑکی۔ موہن سنگھ اپنے عزم و ارادے کا پکا ہے اور چندرا اپنے اس سماج، برادری اور سماجی ٹھیکیداروں سے نفرت کرتی ہے اور اپنے باغیانہ خیالات کی وجہ سے وہ سماج سے بغاوت کر دینا چاہتی ہے۔

اسے گاؤں والوں، سرداری، مہاجنوں، سرکاری عہدے داروں، پنڈت سروب کشن کسی پر اعتبار نہ تھا۔ سب ظالم تھے چور، ڈاکو، اچکے، بدنیت۔

چندرا کو بھی بخوبی اپنی غربت اور اچھوت پن کا احساس تھا۔ مگر وہ اس کے باوجود موہن سنگھ سے محبت کرتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ گاؤں والے اسے برداشت نہیں کریں گے۔

چندرا کیا سوچ رہی ہے کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''ماں بیوقوف تھی، جو آج ان لوگوں پر اعتبار کر رہی تھی۔ جنہوں نے اس کی ساری مسرتوں کو اپنے وحشی پاؤں تلے روند ڈال تھا۔ جیسے بیل مکی کے بھٹوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیتے ہیں۔ گاؤں کے یہ وحشی بیل ان کے کبھی ہمدرد نہ ہو سکتے تھے۔ اور سروب کشن پر اعتبار کرنا گویا سانپ پر اعتبار کرنا تھا۔ اسے اپنی ماں کی خوش فہمی پر حیرانی ہو رہی تھی۔ وہ لوگ اپنا الوسیدھا کرنا چاہتے ہیں اور جب ایک بار موہن اور اس کے درمیان مغائرت کی لکیر آ گئی، تو وہ چندرا اور اس کی ماں کو یکسر ٹھکرا دیں گے۔'' (۱۶)

ثقافتی قدریں بعض اوقات انسان کو اس قدر مجبور کر دیتی ہیں کہ انسان پابند ہو کر رہ جاتا ہے، اب جیسا کہ شیام چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ پتا جی میں ونتی سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں ہشت، نالائق، پتا جی میں چاہتا ہوں کہ ونتی کا بیاہ درگاہ داس سے نہ ہو۔ وہ درگا داس کی بیوہ نہیں ہوگی سروب کشن کی ہوگی۔ میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں۔ پتا جی یہ معاملہ میرا ہے۔

کرشن چند شیام کے والد کا جواب کچھ یوں لکھتے ہیں:

''میں تمہارا معاملہ تم سے بہتر سمجھتا ہوں تحصیلدار صاحب نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی خواب گاہ کے اندر چلے گئے اور شیام نے دروازے سے کہا پتا جی، پتا جی، سنیے تو، پتا جی پتا جی اور وہ دروازہ کھٹکھٹاتا رہا اور دروازے نے کوئی جواب نہ دیا۔''(۱۷)

ب۔ آگ میں پیش کی گئی کشمیر کی تہذیب وثقافت

عزیز احمد کا ناول آگ اپنے نام کے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اس ناول کا موضوع دراصل وہ آگ ہے جس کی لپیٹ میں ساری وادی کشمیر ہے۔ ایک طرف عزیز احمد کشمیر میں آزادی کی تحریکوں کو آگ قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف غریب کشمیریوں کا معمولی معاوضے کے عوض خون نچوڑا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی تہذیب و ثقافت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں جو کشمیریوں کا استحصال ہو رہا ہے اسی حوالے سے اس ناول کا نام آگ رکھا گیا ہے۔

عزیز احمد نے کشمیر میں بھڑکنے والی ہر قسم کی آگ کو پیش کرتے ہوئے انقلاب اور بغاوت کی آگ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو رفتہ رفتہ پھیل رہی ہے اور یہ کسی بھی وقت بھڑک سکتی ہے یہی آگ ہی ہے جو کشمیر کی تہذیب وثقافت کو بہت زیادہ متاثر کر رہی ہے۔ عزیز احمد نے ناول میں ہندوستان میں عام طور پر اور کشمیریوں کی زندگی میں خاص طور پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کی سچی عکاسی کی ہے۔ آگ میں کشمیر کی مفلسی، غربت، بھوک اور نچلے اور محنت کش طبقے کو جن مسائل کا سامنا ہے۔ مکمل طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ ان کا صدیوں سے جو استحصال ہو رہا ہے اس کو سامنے لایا جا سکے۔ ناول نگار نے بھرپور کوشش کی ہے کہ کشمیر کی تہذیب وثقافت کو دنیا کے سامنے اجاگر کیا جا سکے۔ بظاہر تو یہ کشمیر کے ایک خاندان کی تین نسلوں کی کہانی ہے۔ تا کہ کشمیری زندگی کے تمام پیچ وخم اور اتار چڑھاؤ مختلف پس منظروں اور مختلف اوقات میں واضح ہو جائیں۔ غضنفر جو، سکندر جو اور انور جو کشمیر کے تین نسلوں کے نمائندے ہیں۔ ان کے عمل اور ردعمل سے پیدا ہونے والی کیفیات سے کشمیر کی ہمہ جہت تصویر سامنے آتی ہے۔

مزید یہ کہ کس طرح برطانوی راج سے تاجروں اور سرمایہ داروں تک کا ایک پورا سلسلہ ہے ۔ جو کشمیری مزدوروں اور ان کی عورتوں کے استحصال اور لوٹ مار پر قائم ہے۔ اس سماج میں شریف عورت وہ ہے۔ جو گھر کی چار دیواری میں بند رہتی ہے جبکہ زون اور فضلی جیسی غریب عورتیں خواجہ غضنفر جو اور اس کے بیٹے سکندر جو کی خاندانی داشتاؤں کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں سکندر جو اور اس کے برابر کے دوسرے امیر ہونے کی بنا پر معزز ہیں، اس لیے انکی بیویوں اور بیٹیوں کی طرف آنکھ اٹھانا بھی ناممکن ہے کیونکہ وہ سات پردوں میں رہتی ہیں اور تنگ و تاریک حویلیوں

میں محبوس ہو کر مریضانہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ عزیز احمد نے چونکہ کشمیر کی شہری زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اسی میں ظہری صاحب کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ جو کہ بظاہر تو غریبوں کے حامی نظر آتے ہیں اور انکے دکھ درد کو سمجھنے کے دعوے کرتے ہیں۔ لیکن ڈوگرہ حکومت کی ملازمت حاصل کرنے پر ہندوستانی اور کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کو ''واہیات'' قرار دیتے ہیں۔

عزیز احمد نے ناول آگ کے ذریعے جہاں ہندوستانی معاشرہ میں عورت کی مظلومیت کا ذکر کیا ہے وہیں اس کے استحصال اور اس پر کیے جانے والی زیادتیوں کے خلاف آواز بھی بلند کی ہے۔ دھوپ میں اس کا سردی، گرمی کا ستایا ہوا چہرہ، پسینے اور جلدی بیماریوں کے عرق سے چمک اٹھتا اور کہیں جائے پناہ نہ ملتی تو بارش میں اس کے کپڑے شرابور ہوتے بہار اور جاڑوں میں اس کے کپڑوں سے پندرہ گز کے فاصلے تک تعفن کی بو آتی اس کی میلی کشمیری ٹوپی اس کے سر پر منڈھی ہوئی اس کے میل سے داغ دار نظر آتی ہے۔

عزیز احمد نے چونکہ وہاں قیام کے دوران قریب سے ان کی زندگی کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہاں کے قدرتی حسن اور دلفریب نظاروں کے ساتھ وہاں کے نچلے طبقے کی زندگی کی بے بسی کو بھی محسوس کیا ہے۔ کشمیر میں لوگ زمین سے زیادہ پانی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ غریب عوام کی ہاؤس بوٹوں کے کنارے زندگی اور کشمیری جھیلوں میں ان کی ضروریات زندگی کی گندگی کو عزیز احمد نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جہلم کی روانی، اس کے شفاف پاکیزہ پانی کو جو صرف پگھلی برف تھا۔ بزدلی کی عفونت بھر دی، جہلم کو اپنے معاشرتی نظام کو طرح متعفن کر دیا اور جہلم بھی یہ بھول گئی کہ وہ کوہ ہمالیہ کی بیٹی ہے اور آزاد ہے اور جس طرح عورت طوائف بن جاتی ہے۔ اسی طرح ان جھوٹے نگوں سے ان ہاؤس بوٹوں شکاروں، کچن بوٹوں، ڈونگوں کی جھوٹی چمک سے وہ جو کشمیر کی حسینہ تھی، کشمیر کی قحبہ بن گئی۔

یہاں کی تہذیبی اور معاشرتی قدریں کچھ ایسی ہیں کہ یہاں پر جو لداخی رہتے ہیں ان کے چھوٹے قد، چھوٹی آنکھیں، چپٹے ناک اور چپٹے چہرے ہوتے ہیں۔ ان کی کچھ عجیب روایات کے متعلق عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''جن کے یہاں پر بڑے بھائی کی بیوی، اس سے دو چھوٹے بھائیوں یعنی اپنے دو چھوٹے دیوروں کی بھی بیوی ہوتی ہے۔ اگر یہ ''افزائش نکاح'' اس کی اپنی خوشی یا ناخوشی پر منحصر ہے۔''(۱۸)

یہ لداخی تبت مارکہ کے بدھ مت مذہب کے قائل ہیں۔ ''گن پا'' جو ان کی خونقاہیں ہیں ان میں لاکھوں کا سونا ہے۔ ہر خاندان کسی نہ کسی ''گن پا'' کو اپنا ایک لڑکا اور ایک لڑکی سپرد کرتا ہے۔ لڑکے بڑے ہو کر ''لاما'' اور لڑکیاں ''مو'' کہلاتی ہیں اور یہ سب لاسا کے لامائے اعظم کی معتقد ہوتی ہیں۔ یہ لوگ نہاتے نہیں ہیں کیونکہ لداخ میں پانی کم

یاب ہے۔

قالین بافی چونکہ کشمیروں کا ایک خاص پیشہ اور معیشت کا اہم ذریعہ تھا جس سے وہ بہت زیادہ زرمبادلہ کماتے تھے ان میں ایک خواجہ غفنفر جو بھی تھا جسے قالینوں کا کمال علم تھا۔ لیکن وہ بہت احتیاط سے سب کام کرتا تھا۔ وہ قالینوں کی پہچان کے ساتھ ساتھ اپنے گاہکوں کے مزاج اور ضروریات کو بھی پڑھ لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد ایک بہت بڑا تاجر بن گیا۔ انہیں دنوں دو انگریز کمپنیاں میسرز مچل اینڈ کمپنی اور میسرز ہیڈ و اینڈ نافی کمپنیاں کشمیر میں کھل گئیں اور بڑے پیمانے پر قالین بنانے کا کام شروع کر دیا۔ لیکن ان کی وجہ سے غفنفر جو کے کاربار کو ذرا بھی نقصان نہ ہوا۔ پہلے تو وہ اچھے قالین یہاں سے خریدتا اور آگے یورپی کمپنیوں اور مختلف لوگوں کو دہرے داموں بیچتا۔ یہاں تک کہ یہ خبر ان دو کمپنیوں کے انگریز مالکوں کو ہوگئی انہوں نے غفنفر جو کے قالین بیچنا بند کر دیئے۔

اس کے جواب میں غفنفر جو نے اپنے ایک پنڈت دوست سے مشورے کے بعد قالین سازی کے میدان میں قدم رکھا اور بہت جلد کامیاب ہوگیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ ان کمپنیوں میں کام کرنے والے کاریگروں سے سستے داموں قالین خود بنوا لیتا۔ بعض اوقات وہ اسے بہترین ڈیزائن بھی دے دیتے۔ غفنفر جو نے قالین سستے داموں فروخت کرنا شروع کر دیے۔ جس سے خواجہ صاحب کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور آپ لکھ پتی بن گئے۔ اس کے علاوہ غفنفر جو کے پاس تاریخی عجائبات قیمتی پتھروں پر بنی اہم اشیا پر مشتمل تھا جس کے بارے میں عزیز احمد اپنے ناول ''آگ'' میں کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''بڑے بڑے چینی مرتبانوں اور گلدانوں کے بھی کافی اچھے نمونے ان کے یہاں تھے۔ بدھ کے ہاتھی دانت اور جیڈ کے چھوٹے چھوٹے مجسمے جو تبت اور لداخ کے اعلیٰ کاریگری کے نمونے تھے۔ جیڈ کا ذخیرہ ان کے پاس خصوصیت سے بڑا اچھا تھا۔ جیڈ کے بھکشو، سبز جیڈ کا بنا ہوا چھوٹا سا چیکن کے مینار کا چربہ، نیلے جیڈ کا شطرنج کا فرش اور اس پر ہاتھی دانت کے مہرے۔''(۱۹)

ان کے پاس بہت سے قیمتی پتھروں کے چینی اور تبتی زیورت بھی ہوتے تھے جو کشمیر کے سیاح ضرور خریدتے تھے۔ آثار قدیمہ ہو یا عورتوں کے لباس یہ اپنی مثال آپ تھے اور پوری دنیا میں مشہور تھے۔

ایک طرف غربت بہت زیادہ تھی اور دوسری طرف مرد کام کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے بس وہ اس انتظار میں رہتے تھے کہ عورت کہیں سے کچھ لائے گی تو وہ اس پہ گزارا کر لیں گے۔ خواتین دن بھر کام بھی کرتیں تھیں اور پھر غیر مردوں کے پاس جا کر رات گزارتی تھیں۔ معاشرے میں تہذیب کی حالت اس قدر گر چکی تھی کہ خود شوہر اپنی بیویوں کو

دوسرے مردوں کے پاس بھیجتے تھے اور پیسے وصول کرتے تھے۔ اسی طرح کے ایک واقعے کی طرف عزیز احمد اپنے ناول میں کچھ یوں ذکر کرتے ہیں۔

''رجبا نے ذون سے پوچھا۔ خواجہ صاحب سے اور کتنے روپے لائی۔ ذون نے دس روپے کا نوٹ اپنے پوز کی گرہ کھول کر نکال کے اس کے سامنے رکھ دیا۔ رجبا نے اپنی بیوی کو گالیاں دینا شروع کیں حرام زادی، رنڈی تو اس بڈھے سے اس سے زیادہ روپیہ نہیں لے سکی اور ساتھ ہی گوشت کوٹنے کی لکڑی کا دستہ اس کی طرف پھینک کے مارا۔ ذون بھی اس پر چیخنے لگی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ رجبا ان چیخوں سے ذرا ذرا سہما بھی کہ ہمسایوں کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ گالیاں بڑبڑاتا رہا اور کہا تو نوجوان ہے اس بڈھے سے نخرے کر کے کچھ اور نہیں لے سکتی تھی'' ۲۰

نیا سال جب بھی شروع ہوتا تو ان کا نوروز ہوتا بیساکھی کی ابتداء ہو رہی ہوتی تھی۔ جس میں سب لوگ خوشی خوشی شرکت کرتے تھے۔ یہ ایک میلہ ہوتا تھا جو ہر سال سجایا جاتا تھا۔ قریب ایک نہر کے کنارے دور دور تک ڈونگوں اور شکاروں کا سلسلہ تھا۔ لیکن حسب معمول آج مسلمان بہت کم آئے۔ یہاں پر دونوں طرف بھنے ہوئے چنے، تال، مخانے، لڈو تل والی چیزیں، کھجوریاں، پکوڑے اور اس طرح کی چیزیں بک رہی تھیں اور لمبے لمبے، چغے پہنے، پگڑیاں باندھے ننگے پاؤں پھرتے ہوئے پنڈت اور اس طرح کے سبز لیکن ذرا صاف پھرن پہنے ہوئے بنڈ تانیاں یہ سب سامان خرید رہی تھیں اور شالا مار میں داخل ہو رہی تھیں۔ یہ ایک قسم کا ثقافتی میلہ ہوتا تھا۔ جو ہر سال نوروز کے موقع پر لگایا جاتا تھا۔ اس میں بہت دور دور سے لوگ شرکت کرتے تھے۔ دریائے جہلم ان سب کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہاں سے یہ سب لوگ اپنی ضروریات پوری کرتے تھے چاہیے مرد تھے یا عورتیں صبح صبح سب اپنی جہلم کو گندہ کرنے، کلنے پر کام کے لیے اسی کا پانی استعمال کرتے۔ پینے کے لیے اور نہانے کے لیے، برتن دھونے کے لیے اور باقی کاموں کے لیے بھی، اسی کے کنارے کنارے کچھ لوگ اپنے شکار تلاش کرتے کیونکہ عورتیں یہاں پر آتیں تھیں۔ یہاں پر ہی زیوروں سے لدی، بھنیدی بوڑھی ادھیڑ عمر اور جوان عورتیں جہلم میں اپنے بچوں کو آپ دست دے رہی ہوتی تھیں اور اسی پانی سے کھانے کے برتن بھی دھوتی تھیں۔ ان کے ہاں شادی بیاہ کی رسومات بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھیں ہاں لیکن ایک بات تھی شادی وغیرہ کے معاملات جو باپ کے خاندان کے بڑے اور والد کر دیتا اسے ماننا پڑتا۔ ان کے ہاں دولہا کو پیسے دینے کا رواج بھی تھا جو بھی جتنے پیسے دیتا اسے ایک کاپی پر نوٹ کر لیا جاتا اور یہ روایت چلتی رہتی۔ یہ ایک قسم کی امداد تصور کی جاتی تھی کیونکہ شادی والے گھر میں اخراجات بہت زیادہ ہوتے تھے۔

اسی امداد کے حوالے سے تحسین جعفری کاشمیری اپنی کتاب کشمیر لوک روایات کے آئینے میں لکھتے ہیں کہ کشمیری ایک دوسرے کی امداد کر کے بوجھ ہلکا کرنے کی کس طرح کوشش کرتے ہیں۔

''شادی بیاہ کے موقع پر امداد باہمی کا جو جذبہ اہل کشمیر میں ہے شاید ہی کسی دوسری جگہ پایا جاتا ہوگا

ایام بندی یعنی شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے بعد فریقین اپنے اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو تاریخ سے مطلع کرتے ہیں اور دعوت شمولیت دیتے ہیں۔ اطلاع ملنے کے ساتھ ہی ہر گھر سے شادی کے اخراجات کے لیے بطور امداد نقد یا جنس کچھ نہ کچھ ضرور بھیجا جاتا ہے۔ یہ امداد بطور قرض نہیں ہوتی، صرف بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن رسم یہ ہے کہ اس میں کچھ اضافہ کر کے بھیجنے والے کی اسی قسم کی تقریبات پر واپس کر دی جاتی ہے اس طرح وقتی طور پر لڑکی یا لڑکے کے والدین کا کافی بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' (۲۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''بعض گھرانوں میں یہ رسم بھر ہے کہ جب شادی والے گھروں کے عزیز و اقارب آنا شروع ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے ساتھ دولہا یا دلہن کے لیے جن کے ہاں بھی انہیں جانا ہو، زیورات، کپڑے، تیل، گھی، بلکہ چاول اور مینڈھے یا بکرے یا دنبے بھی لے جاتے ہیں۔'' (۲۲)

ناول آگ میں عزیز احمد نے جہاں کشمیر کی زندگی میں پھیلی ان کی گندگیوں کو پیش کیا ہے وہیں زندگی کے بیان کے ساتھ انہوں نے وہاں کی تہذیبی و معاشرتی پہلوؤں کو بھی خوب اجاگر کیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کا رہن سہن، بات چیت، لباس، طرزِ معاشرت، شادی کی تقاریب مہمان داری کی تفصیلات اس انداز سے بیان کی ہیں کہ ناول کے ذریعے ہم کشمیری تہذیب سے واقفیت آسانی سے حاصل کر پاتے ہیں۔ سکندر جو کی شادی کے موقع پر کشمیری دعوت کی تفصیل کچھ اس طرح دیکھنے کو ملتی ہے:

مہمانوں کے آگے بڑے بڑے دسترخوان سجائے گئے۔ جن پر کھانے کے آداب چھپے ہوئے تھے مہمانوں کے ہاتھ دھلائے گئے اور پھر ان کے سامنے بڑے بڑے ٹرے میں کھانا رکھا گیا۔ یہ ٹرے اتنے بڑے تھے کہ ایک چار لوگوں کے لیے کافی تھا۔ چاولوں کے ساتھ گوشت بھی رکھا گیا تھا اور پیالوں میں سالن بھی۔ جس میں مٹر کا شوربہ، آلو کا قورمہ گوشتابہ، کوفتے، مرچوں کا سرخ قورمہ، ساگ وغیرہ وغیرہ اور پھر چاولوں کے لقمے کے ساتھ گوشت کا پہلا نوالہ بسم اللہ کر کے منہ میں رکھا۔ نوکر چھوٹے چھوٹے پیالوں مین دوسرے سالن دینے لگے۔ مٹر کا شوربہ، آلو کا قورمہ، گوشتابہ، کوفتے، مرچوں کا سرخ قورمہ، ترکاری کا ساگ اور آب گوشت، ہر طبق میں چار چار آنکھوں کی انگلیاں بے تکلفی سے چاولوں اور گوشت اور قورمہ کو ایک کرتی جاتیں۔

یہاں پر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ڈھور ڈنگر گائیں اور بکریاں چراتے ہیں۔ ان کے لیے چارے کا بندوبست کرتے ہیں۔ دودھ بیچتے ہیں۔ جانور بیچتے ہیں۔ اور سردیوں میں ان کی اون سے کمبل اور کپڑے خود تیار کرتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کاروبار کرتا ہے۔ اور ہاؤس بوٹو میں اپنی زندگی گزارتا ہے، مطلب کہ وہ ہروقت پانی میں رہتے ہیں۔ جہاں تک کشمیر کی رعایا کا سوال ہے۔ تو اس میں سے بہت سے تو گھروں سے جب کچھ پوچھا جاتا تو وہ بتانے سے گھبراتے تھے۔ کہ شاید یہ مسلمان ہوگا یا مسلمان نہیں ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگ ڈرتے تھے کیونکہ کچھ عرصہ قبل یہاں پر بہت زیادہ خونریزی ہوئی تھی، مسلمانوں پر بہت زیادہ سختیاں تھیں مسجدیں بند کروادی گئیں تھیں اس کی وجہ یہاں کے پنڈت لوگ تھے جو پولیس کو کہہ دیتے تھے کہ انہوں نے گائے کو مارا ہے۔ تو پولیس کاروائی کرتی اور بہت سارے لوگوں کو ایسے بے گناہ سزا ہوئی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلے پنڈت لوگ کم ہوگئے۔ اب اس طرح کے واقعات نہیں ہوتے۔

یہاں کشمیر کے متوسط طبقے کے مسلمان نچلے طبقے کے مسلمانوں سے تعصب تو زیادہ نہیں رکھتے لیکن پھر بھی غریب طبقے کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں اور جھک کے ملتے ہیں۔ اور ہوسکے تو ہاتھوں کو بوسہ بھی دیتے ہیں۔ غریب مزدور لوگ عبرت بھری زندگی، مہاجنی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام سے اچھی طرح واقف ہیں اور انہیں اپنی مشکلات کا احساس بھی ہے۔

جندون کی بارشوں کے بعد موسم بہت خوش گوار تھا اور جہلم کا پانی بھی چند دن پہلے تک کافی اوپر آ گیا تھا اب دو سے تین فٹ نیچے آ چکا تھا۔ جس جگہ سے پانی کم ہوگیا تھا وہاں آج زمین دلدل بنی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ندی کے اس پار ممدا بازار سے سودالا کے مہادا خاکروب کو حسب دستور آواز دے رہا تھا۔ ''مہادا ہا مہادا'' اور خاکروب اپنے غلاظت بھیکنے والے شکارے کو ندی کے اس پار کھینچے کے لیے کچن بوٹ سے الگ کر رہا تھا۔ ادھر ندی کے کنارے نوراں کی بیٹی شعبانا کالے کوئلے سے دانت مانجھ رہی تھی۔ اور اس کے سرخ سرخ خوبصورت گال کسی جل پری کے چہرے کی طرح ندی کے پانی میں چمک رہے تھے۔

دوسری طرف میجر صاحب اپنی ہاؤس بوٹ سے نکل کر بند ندی کے دھارے کی مخالف سمت چل رہا تھا۔ سینے سے بانس اڑاتے بار بردار ڈونگوں کے ہانجی گنجے سروں والے مرد، میلی کچیلی گھیر دار پھیرن پہنے ہوئے عورتیں اور جو دہ، پندرہ برس کے بچے ڈونگوں کو ندی کے دھارے کے خلاف پامپور اور انت ناگ کی طرف جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ بنگلے بھی تھے اور ایک راستہ بھی تھا جہاں سے موٹر یا تانگہ گزر سکتا تھا۔ میجر صاحب ان مکانوں کے نام پڑھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے ان بنگلوں کے نام کچھ یوں تھے۔ نسترن، انجم، امرت محل، کوشلیا، بھون، یہ وہ بنگلے تھے جن میں والیان ریاست، ان کے اسٹاف کے لوگ، پنجاب کے بڑے برے زمیندار، لکڑیوں کے بڑے بڑے ٹھیکے دار، بمبئی کے مشہور تاجر ٹھہرے ہوئے تھے اور زبردست لباس زیب تن کرتے تھے۔ جن میں ریشمی شلواریں، جارجٹ کے

چھابے کی ساڑیاں، سلیک، اونی بل اور، وغیرہ وغیرہ۔

جب اس کی دوسری طرف ندی میں ہاؤس بوٹوں کا ایک سلسلہ تھا۔ جن میں مانڈے، ہائیڈ پارک، میریتا، اپالو، یہاں کچن بوٹ سے نکل کر ندی کے کنارے دولڑکیاں سفید پوز اور میلے کالے پھیرن پہنے ہنستی اور ایک سیاح پارٹی کے نوجوانوں سے آنکھ ملاتی ہوئی جا رہی تھیں۔ جب کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا مرد کچن ہاؤس بوٹ سے ان کو ہنستا ہوا دیکھ لیتا اور کشمیری میں ان کو گالی دے دیتا تو یقیناً ان کی یہ ہنسی بند ہو جاتی۔ وہ کھیتوں اور درختوں کے جھنڈ سے گزر کر اب مکانوں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں جو کہ ایک کھلی جگہ تصور کی جا سکتی ہے۔ وہیں پر کچھ ادھیڑ عمر کشمیری عورتیں اپنے گھیر دار پھیرنوں میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کہ ادھر ایک نوجوان گول مٹول لڑکی پانی کا گھڑا بھر کے ایک دومنزلہ مکان کے نچلے دروازے سے اندر جا رہی تھی۔ اوپر ایک کھڑکی سے میلے کچلے سرخ پوز اور میلے زیور کے ہالے میں ایک چاند سا خوبصورت چہرہ باہر جھانکتا ہوا نظر آیا۔ اور ساتھ ہی اوپر حصے کے گڑگڑانے کی آواز بھی آئی۔ پھر اچانک ایک سیاہ ڈاڑھی والا بڑا سا عمامہ پہنے کھڑکی میں دکھائی دیا۔ اور ساتھ ہی وہ خوبصورت صورت غائب ہوگئی۔ یہ یہاں کی تہذیب وثقافت کا عکس ہے جو کہ مختلف صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔

عزیز احمد اپنے ناول میں کچھ اس طرح دیکھتے ہیں:

> ''برگِ کو کنار کے ایک طرف بنگلے تھے اور دوسری طرف جہلم کے ہاؤس بوٹ، اور پھر وہ سیڑھیاں اترے اور مڑے اور ایک پھاٹک کے اندر داخل ہوئے۔ سامنے صحن پر سبزے کا سوفیٹ سے زیادہ چوڑا قالین بچھا ہوا تھا اور قالین کے حاشیے پر پتی کے پھولوں کے تختے ٹکے ہوئے تھے۔ سبزے پر کہیں کہیں کو کنار بھی اکا دکا تھے۔ مگر ان کے لیے مالی نے ایک بڑا سا تختہ الگ ہی کر دیا تھا۔ چناروں کے نیچے سبز رس دار گھاس نستران کے چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ نسترن کے قالین سے ذرا ہٹ کے ایک لمبا سا میز تھا جس پر کیک، پیسٹری، سینڈوچ، سفید دال، سموسے، تلے ہوئے گوشت کے ٹکڑے نمکین پستے، بادام، اخروٹ اور دنیا بھر کی چیزیں چنی ہوئی تھیں اور کچھ ہی دور کچھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن پر دس پندرہ لوگ بیٹھے تھے جو کہ میجر صاحب کو آتا دیکھ کر کھڑے ہوگئے او اس کی تعریف کرنے لگے کہ کشمیری زبان میں جناب کی شاعری سے بچہ بچہ واقف ہے۔''(۲۳)

مشاعروں کا اہتمام بھی بڑے بہترین انداز سے کیا جاتا ہے۔ مختلف شعراء اپنی شاعری کے ذریعے ماحول کو

گرماتے ہیں۔ جن میں میجر صاحب، قاضی عبدالصمد، کرم دین وقار جو کہ ایک کالج کے پرنسپل تھے۔ خواجہ وحید الدین کرمانی، وائس پرنسپل، پنڈت کنول رام، جو کہ بہت بڑے شاعر تھے اردو نہ صرف اچھی بول لیتے تھے بلکہ بہترین لکھ بھی سکتے تھے۔ پنڈت پریم چند چھاگل ان کی کس کس بات کی تعریف کی جائے کیونکہ یہ ریاست کے صوبہ گرجستان کے گورنر تھے اور عراقی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے فن کار تھے۔ چاہے غزل ہو یا نظم داد دینے والے زبردست داد دیتے تھے۔

ظہری کو اگر لوگ شاعر کہتے تو بعض اوقات وہ غصہ کرتے۔ سکندر جو نے کہا۔ ہمارے جناب منسٹر کی ایسی غزل کشمیر بلکہ ہندوستان میں اور کوئی نہیں بنا سکتا۔ ادھر سے پریم چند چھاگل نے میر سے کہا وہی بہار یہ قصیدہ عنایت ہو جو آپ نے مہاراج کی مدح میں لکھا تھا۔ ہاں جناب ہاں وہ ایک اتفاق تھا۔ میر نے جھک کے سلام کیا اور ظہری کو کہا شعر ملاحظہ ہو:

> ''قالین نسترن پر یہ نغمے طیور کے حوروں کو ہائے کس نے غزل خواں بنا دیا لالے کو سرخ خلعت دربار کس نے دی نسرین کو کس نے باغ کا دربان بنا دیا نخوت سے خار نے جو کیا سر کبھی بلند اس کو شکست و یخت کا عنوان بنا دیا۔'' (۲۴)

میر جمن چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہنے لگے یہ نسترن کے پھول چنار ہی کے سائے میں اگتے ہیں۔ جہاں چنار کی شاخوں کے درمیان سے زیادہ دھوپ چھن کے آتی ہے وہاں یہ نسترن زیادہ نہیں اُگے ہیں۔ دیکھئے چادر گل، چادر نسترن کے بارے میں جو مرضی کہہ لیجئے یہ چنار ہی کے سائے میں پھیلتی ہے اور صاحب یہ چنار معجزوں کا درخت کہا جاتا ہے۔ یہاں جولائی اگست میں جتنی بھی دھوپ ہو اور آپ لاکھ تھکے ہارے ہوں آپ چنار کے نیچے آجائیں ایسے محسوس ہوگا جیسے آپ کسی جنت میں آگئے ہیں۔ ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہاں ایک شریف کشمیری گھرانے کی عورت کو کون دیکھ سکتا ہے کیونکہ وہ ہارون الرشید کے بغداد کی خاتون کی طرح نقاب لیے خرید و فروخت کا کام نہیں کرتی صرف کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہے اور اس کی ٹوپی، سر سے لٹکتا ہوا کپڑا ایسا میلا ہوتا ہے۔ جیسے اس کی نوکرانیوں کا۔ کیونکہ وہ علم، آزادی، سورج کی روشنی، تازہ ہوا، مرد کی نگاہوں اور سچی محبت سے محروم ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیر کے شرفاء ریاست کے غلام ہیں اور شرفاء کی بیویاں شرفاء کی غلام ہیں۔

دوسری طرف مزدور عورتوں کا طبقہ ہے جو کہ بیچاری ہر وقت کام میں لگی رہتی ہیں اور بازاروں کھیتوں وغیرہ میں کام کرتی ہیں۔ جبکہ امیر طبقے کی عورتیں ڈونگوں میں بیٹھ کر باغوں کو تو ضرور جاتی ہیں لیکن باہر کام سے نہیں۔ ان کے

مردان کے ساتھ ہونے کے باوجود ان کی اٹھتی ہوئی ہر نگاہ پر احتساب کرتے ہیں۔

انور جو اور سکندر جو کے بارے میں عزیز احمد اپنے ناول ان کے ناشتے اور حجامت کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''انور جو اپنے کمرے میں جا کے اپنی بیوی مریم سے لپٹ کر جلدی جلدی شیو کرنے لگتا ہے پھر حمام کرنے چلا جاتا ہے اور خواجہ سکندر جو وہیں بالا خانے کے دالان میں شیو کرنے کے لیے گرم پانی اور شیو کا سامان منگواتے۔'' (۲۵)

انور جو جو کہ مسلسل اپنے والد کی عیاشیاں اور کرتوت دیکھ رہا تھا وہ اس سے تنگ آ چکا تھا کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ کاروبار پھیلنے کی بجائے سکڑ رہا ہے۔ کیونکہ اس کا والد اس عمر میں بھی عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا تھا جس سے وہ شرم محسوس کرتا۔

ایک دن اس سے رہا نہ گیا اور اس نے میجر صاحب کو اپنا دکھڑا سنایا۔ اور ایک ایسے مخصوص جملے کے ساتھ کہ اسے سب سمجھ آ جائے۔ میجر صاحب آپ نے میرا سوٹ دیکھا ہے نا۔ کتنا صاف استری کیا ہوا لگتا ہے۔ لیکن آپ نے میری بنیان نہیں دیکھی کہ وہ کتنی گندی ہے۔

بڑے خواجہ صاحب رات کے بارہ ایک بجے سے پہلے گھر نہیں آتے، ہم لوگ رات دیر تک ان کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور جب بچے بھوک سے نڈھال ہو جاتے ہیں تو والدہ انہیں کھانا کھلا کر سلا دیتی ہے۔ لیکن خود بارہ بجے رات تک انتظار کرتی رہتی ہے۔ اور جب وہ آ جاتے تو کہتے میں باہر سے کھانا کھا کے آیا ہوں۔ والدہ اکیلے اکیلے روتے ہوئے کھانا کھا لیتیں اور کبھی ویسے ہی سو جاتیں۔ ان کو ہماری والدہ سے ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ ہماری بوڑھی دادی اور پھوپھی خدا ان سے اپنی پناہ میں رکھے ہر وقت کان بھرتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ گھر کا ماحول عجیب ہو کے رہ گیا تھا۔ میجر نے انور جو کو سمجھانے کی کوشش کی کہ باپ کے ساتھ بگاڑ اچھا نہیں وہ آپ کو تمام جائیداد سے عاق بھی کر سکتا ہے۔ ہاں اگر آپ کو یہ پریشانی ہے کہ یہاں سردیوں میں کاروبار کون سنبھالے گا تو آپ عبدالرب کو بوڑھا نہ سمجھیں وہ آج بھی آپ سے بہتر کام کر سکتا ہے۔ اور اگر دیکھا جائے تو آج بھی وہی سارا کام کرتا ہے۔ آپ تو صرف دستخط کرتے ہیں۔

لیکن ایک عجیب صورت حال اس وقت دیکھنے میں آئی جب ایک غریب لڑکی بھوک کی وجہ سے نڈھال ہو کر گر پڑی تھی۔ اس کو دکھانے کے لیے ڈاکٹر کو بلا لیا گیا اور اس کا بھائی اس کے کھانے کے لیے بازار سے کچھ خرید رہا تھا جو

اسے چار آنے کی غذا چودہ آنے میں مل رہی تھی اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جب وہ واپس پہنچے گا تو اپنے سامنے بے جان جسم پائے گا جس کے جسم پر میلے کچلے کپڑے تھے اور کانوں میں بالیاں بھی نہیں تھیں۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں فرنگیوں اور امیر لوگوں کے کتے سیروں دودھ پیتے ہیں اور ایک اجنبی لڑکی کے کھانے کے لیے، سوکھی روٹی کا ٹکڑا نہیں ملتا۔

عزیز احمد اپنے ناول میں اس کے حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں:

''اب اس نو سال کی لڑکی کو روٹی کے ٹکڑے کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ اس کا بھائی جو ابھی تک کھانے کی چیزیں لے کے واپس نہیں آیا اور جو راستے میں آدھے سے زیادہ خود کھا چکا ہے اس کی واپسی کی بھی اسے فکر نہیں۔ اس میلے کچیلے سرخ لباس میں، اسے نیند آ گئی ہے۔ اب پانچ سال بعد وہ نہ کبھی جوان ہوگی، نہ لال لال عروسی جوڑا پہنے گی، اس کی خوبصورت آنکھیں جوانی میں کسی طرف نہ اٹھیں گیں۔ کسی کو دیکھ کر شرم سے نہ جھکیں گیں اسے بھوک کی نیند آ گئی ہے۔ اس کی زلفوں میں زعفران کی بتیاں اب کبھی الجھنے نہ پائیں گیں۔''(۲۶)

ج۔ آگ اور شکست میں پیش کیے جانے والے تہذیبی و ثقافتی عناصر کا تقابل

اردو ناول میں شکست ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ جس میں کشمیر کے قدرتی حسن، فرسودہ نظام، معاشرتی ناانصافیوں اور تہذیب و ثقافت پر بات ہوتی ہے۔ کرشن چندر نے اپنے ناول میں خوبصورت اور حسین کشمیر کے اندر صدیوں سے کچلے اور سہمے ہوئے کشمیریوں کی تہذیب و ثقافت اور مسائل پر بہت بہترین انداز سے بات کی ہے۔ کرشن چندر اپنے ناول میں محبت کرنے والی نئی نسل کے حوالے سے آزادانہ طور پر بات کرتے ہیں۔ تاکہ وہ مل جل کر بہتر زندگی گزار سکیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے تعلقات کے حوالے سے بہت خوبصورت انداز سے بات کی گئی ہے۔ ان کی آپس کی مذہبی عبادت گاہیں کیسی اور کہاں تھیں۔ ان میں کیا کچھ ہوتا تھا۔ دونوں میں مختلف قوموں کے بسنے والے لوگوں کے آپس کے تعلقات کیسے تھے۔

سالانہ پیر کا میلہ کشمیر میں ہوتا تھا اس کو یہ سب مل کر کیسے کامیاب بناتے اور شرکت کرتے تھے۔ انسان اور سماج کا آپس میں کیا رشتہ ہے اس پر خوبصورت انداز سے بات ہوئی ہے۔ ان دونوں قوموں میں خوشی اور غمی کے پروگرامات کیسے ہوتے تھے ان پر تفصیل سے بات ہوئی ہے۔ رہن، سہن، خاندانی نظام کیسے آگے بڑھتا تھا۔ صلح صفائی کے حوالے

سے کیسا نظام رائج تھا اپنے سے چھوٹی قوموں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ موہن سنگھ اور چندرا کی محبت کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔ کہ کس طرح معاشرے میں ان کے اوپر پابندیاں ہیں لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

ناول میں باطنی اور معاشرتی رویوں کے ساتھ ساتھ معاشرت اور مناظر فطرت پر بھی بڑی تفصیل سے بات ہوئی ہے۔ کشمیر کی خوبصورتی وہاں کی جھلیں، آبشاریں، کوہسار، زعفران کے کھیت اور وہاں کا نسوانی حسن ہی ہے جس سے یہاں کی تہذیب و ثقافت پروان چڑھی۔ کشمیر کی دیہاتی زندگی، لوگوں کا رہن سہن، کام کاج، روایات، معاشرتی اقدار، رسومات، فصلوں کے پکنے کے ایام اور کسانوں کی خوشیاں ان سب پر بڑی خوبصورتی سے بات کی گئی ہے۔ لوگوں کے شب و روز، افلاس، مصائب اور بے بسی کو بہت گہرائی سے دیکھا گیا ہے۔

ناول میں عورت کے کام کرنے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کہ وہ کیسے کھیتوں میں کام کرتی ہے اور مرد اسے کیسے اور کس کام کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کا رہن سہن کیسا ہے۔ اس کے دن کیسے گزرتے ہیں اور وہ ان مشکل حالات میں کیسے گزارا کرتی ہے۔ وہ بھی حسین ہے اس کا بھی امیر لوگوں کی عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کرنے کو دل کرتا ہے لیکن وہ کس کے ہاتھوں مجبور ہے۔ تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

گاؤں کے لوگ کیسے اپنے کام کاج مل کر کرتے ہیں اور اس کے لیے ان کی کیا ترتیب اور طریقہ کار ہوتا ہے اس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان دیہاتی لوگوں کا رہن سہن کیسا ہوتا ہے اس کو خوبصورت انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

ہندو مسلم تفرقے کے اوپر بات ہوتی ہے۔ جسے کرشن چندر نے مسترد کیا ہے۔ وہ ہمیشہ مشترکہ قومی کلچر کے نظریے کے قائل رہے ہیں اور رواداری پر زور دیا ہے۔

شکست کے جملوں میں بڑی گہرائی پائی جاتی ہے۔ ان میں اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت کا عنصر بھی ہے۔ جس سے قاری دیر تک ان کے سحر میں کھویا رہتا ہے۔ آگ میں پیش کی جانے والی تہذیب و ثقافت کے کون کون سے اجزا پر بات آئی ہے۔

آگ عزیز احمد کے ناولوں میں سے ایک بہترین ناول ہے جو کہ کشمیر پر لکھا گیا ہے۔ اس کی کشمیر کی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کشمیر میں بھڑکنے والی ہر قسم کی آگ کو پیش کیا گیا ہے۔ عزیز احمد نے ہندوستان اور خاص طور پر کشمیری زندگی میں جو رفتہ رفتہ انقلاب آ رہا تھا اس کی سچی عکاسی کی

ہے۔

آگ چونکہ ایک ہی خاندان کی تین نسلوں کی کہانی ہے۔ اس لیے عزیز احمد نے کشمیری زندگی کے تمام پیچ و تاب اور اتار چڑھاؤ کے مختلف منظروں کو ایسے پیش کیا ہے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ مصنف نے اس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ کہ کس طرح کشمیری تاجر اور ڈوگرہ شاہی کے افسران غریب اور ناخواندہ کشمیری مزدوروں کو لوٹتے رہے۔ کس طرح کشمیری اپنی جہالت اور غریبی کی وجہ سے نہایت غلیظ ماحول میں زندگی بسر کرتے رہے اور بھیڑ بکریوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنی عورتوں کے دام وصول کرنے پر بھی مجبور تھے۔ ہندوستانی معاشرے میں عورت کی مظلومیت کا ذکر کیا ہے کہ اس کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کی جاتیں اور اس کا استحصال کیا جاتا۔

عزیز احمد نے چونکہ وہاں رہ کر بہت ہی قریب سے کشمیری تہذیب و ثقافت کا جائزہ لیا ہے۔ تو ان سے بہتر اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔ قدرتی حسن کا مشاہدہ ہو، نچلے طبقے کا استحصال ہو، غریب لوگوں کے شب و روز کا پانی میں گزرنا ہو۔ جہلم کی روانی اور اس کے اردگرد میں پیش آنے والے معاشرتی واقعات ہوں ہر طرح چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں کی تہذیبی قدریں کیسی ہیں لوگ کیسے ہیں کیسے زندگی گزارتے ہیں۔ ان سب پر بات کی ہے۔ آپس کے خاندانوں کے تعلقات کے علاوہ خانقاہوں اور مذہب پر بہت خوبصورت انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

کشمیریوں کی قالین بافی کی صنعت بہت مشہور ہے اور دنیا بھر میں اس کا نام ہے۔ اس کے علاوہ شال بافی میں کشمیریوں نے کس طرح ترقی کی ہے۔ اس دوران انہیں کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔ ان کے ڈیزائن کا بنانا اور پھر مارکیٹ میں فروخت کرنا۔ ان مختلف مراحل کو عزیز احمد نے اپنے ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

قیمتی پتھروں سے چیزیں بناتے تھے اور ان کی تجارت کرتے تھے، عورت اور مرد کے درمیان تعلقات اور رہن سہن کا انداز کس قدر تھا۔ شب و روز کیسے گزرتے تھے۔ عورت پر کس قدر سختیاں کی گئی تھیں۔

نیا سال کس طرح شروع ہوتا اور اس میں کیا کیا پروگرامات ہوتے۔ نئے سال کے آغاز میں ان کا نوروز ہوتا جس کا عزیز احمد نے اپنے ناول میں ذکر کیا ہے۔ اس میں دور دور سے لوگ شرکت کرتے اس میں ضروریات زندگی کی ہر چیز دستیاب ہوتی۔ اسے بیساکھی کی ابتدا بھی کہا جاسکتا ہے۔ عزیز احمد نے بھی جہلم کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کے قریب بسنے والے لوگ اور ان کا رہن سہن بڑے بہترین انداز سے پیش کیا ہے۔

کشمیریوں کی شادیاں کیسے ہوتی تھیں اور یہ اس میں کیا کیا چیزیں کرتے شادی والے گھر میں کیا کیا ضروری ہوتا جو کیا جاتا۔ یہاں تک کے ناول نگار نے شادی کے اخراجات اور رشتہ داروں کی روایات کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔

کشمیری مہمان داری کے حوالے سے بہت مشہور ہیں اور ان کا ایک اپنا طریقہ ہے۔ اس کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غریب کس طرح ڈھور ڈنگر گائیں اور بکریاں چراتے ہیں ان کے لیے چارے کا بندوبست کرتے ہیں۔ سردیوں میں ان کی رہائش کا انتظام کرتے ہیں اور ان کی اون سے کیا کچھ تیار ہوتا ہے جو وہ تیار کرتے ہیں۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کاروبار کرتا ہے اور ہاؤس بوٹوں میں رہتا ہے۔ کشمیر کی رعایا کی ہر بات اس حوالے سے بھی کی گئی ہے کہ شروع شروع میں وہ کس قدر ڈرتے تھے۔ تاکہ خونریزی نہ ہو۔ کیونکہ اس وقت پنڈتوں کی اجارہ داری تھی۔

ناول نگار یہ بھی لکھتا ہے کہ کشمیر کے متوسط طبقے کے مسلمانوں نے (نچلے طبقے کے مسلمانوں سے) کبھی تعصب نہیں برتا تھا لیکن پھر بھی وہ بہت زیادہ عزت کرتے تھے اور جھک کر ملتے تھے۔ سرمایہ دارانہ اور مہاجنی نظام پر بھی بات کی گئی ہے۔ محلوں اور عام گھروں میں رہنے والی خواتین کے شب و روز میں کیا فرق ہے۔ اور دونوں پر کس قسم کی سختیاں ہوتی ہیں اور کیا کیا کام کرتی ہیں۔ تفصیلی بات کی گئی ہے۔ تاجروں کی تجارت نوجوان لڑکیوں کے گزر بسر اور باہر کے مناظر دیکھنے کے لیے گھومنا پھرنا سب چیزوں کو عزیز احمد نے اپنے ناول میں جگہ دی ہے۔ معاشرے میں مشاعروں کا اہتمام اور مشاعروں کی مختلف موضوعات پر شاعری لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنی کیونکہ شاعری کسی معاشرے کا عکس ہوتی ہے۔ اس میں مختلف شاعر پیش پیش رہے۔ میجر صاحب، ظہری، خواجہ انور اور سکندر جو کے حوالے سے بھی بہت بہترین انداز سے ناول نگار نے معلومات لکھنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے شب و روز کیسے گزرتے تھے جو کہ کشمیر کی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کرنے میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳

۲۔ حیات افتخار، کرشن چندر کے ناولوں میں ترقی پسندی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۹۱

۳۔ کرشن چندر، شکست، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۵۵

۴۔ کاشمیری، تحسین جعفری، کشمیر لوک روایات کے آئینے میں، لوک ورثہ، پبلی کیشن، اسلام آباد، ص ۱۸۸

۵۔ کرشن چندر، شکست، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۶۵-۶۴

۶۔ ایضاً، ص ۴۰

۷۔ ایضاً، ص ۱۹۳

۸۔ انور پاشا، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو ناول، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۱-۱۰۰

۹۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۹۱

۱۰۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۴ء، ص ۴۸۳

۱۱۔ کرشن چندر، شکست، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۶۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۱۵۔ احمد حسن، کرشن چندر کے سماجی اور ادبی نظریات، آج کل، ۱۹۷۷ء، ص ۹

۱۶۔ کرشن چندر، شکست، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۸۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۰۹

۱۸۔ فاروقی، طاہر منصور، عزیز احمد کے چار ناول، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۳۹۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۱۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۱۵

۲۱۔ تحسین جعفری کاشمیری، کشمیر لوک روایات کے آئینے میں، لوک ورثہ پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۸۵-۱۸۴

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۳۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۴۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۴۶-۵۴۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۹۲

باب پنجم

ماحصل

تاریخ کشمیر:

ہزاروں سال پہلے سرزمین کشمیر ایک وسیع جھیل تھی جس کا نام ستی سر تھا۔ اسے ہر طرف سے اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ جھیل کا پانی خشک ہونے کے بعد وہاں زندگی نے جنم لیا۔ اس سلسلے میں مسلمان اور ہندو علیحدہ علیحدہ داستانیں بیان کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے بتائے ہوئے ادوار میں بھی صدیوں کا فرق پایا جاتا ہے۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ کشمیر تاریخی اعتبار سے ان علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ جنہیں کرہ ارض پر قدیم ترین قرار دیا گیا ہے۔ ریاست کشمیر میں جموں، لداخ، گلگت، پونیال، ہنزہ، سری نگر اور یاسین کے علاقے شامل ہیں۔ گلگت کے شمال مغرب میں واقع چترال کی چھوٹی سی ریاست کبھی کشمیر کے راجاؤں، مہاراجاؤں کی سیر گاہ ہوا کرتی تھی۔ کشمیر کی وادی ہمالیہ میں گھری ہوئی ہے۔ ان پہاڑوں میں بیس درے ایسے ہیں۔ جن کے ذریعے وادی میں داخل ہوا جاسکتا ہے۔ کشمیر اور جموں مجموعی طور پر ۸۶ ہزار ۲۴ مربع میل پر محیط ہے۔ وادی صرف ۸۴ میل لمبی اور ۲۰ سے ۲۵ میل چوڑی ہے جو کہ کہا جاتا ہے کل رقبے کا دس فیصد ہے۔ ریاست بنیادی طور پر تین مختلف علاقوں پر مشتمل ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تینوں علاقے اپنے موسموں اور سرزمین کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ثقافت، تہذیب اور زبان کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

جنوب کی جانب جہاں پنجاب کے چٹیل میدان، ہمالیہ کی سر بہ فلک چوٹیوں کے قدم چومتے ہیں۔ جموں اسی طرف واقع ہے جو کہ ایک زمانے میں ہندو اور ڈوگرہ رجواڑوں کے عروج کا مرکز رہا تھا۔ شمال کی جانب خطرناک پہاڑی دروں، منجمد ڈھلوانوں اور جنگلات سے اٹے ہوئے قدرتی دریاؤں اور نالوں کی دوسری طرف قراقرم اور پیر پنجال کے عظیم سلسلہ ہائے کوہ کی حفاظت میں سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند بیضوی سطح مرتفع کی صورت میں ہمالیہ وہ دلہن جو اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ موجود ہے۔ جسے وادی کشمیر کہا جاتا ہے۔ برف پوش چوٹیوں، چنار کے جنگلات، نیلگوں آسمان کی طرح شفاف، جھیلوں، گنگناتے جھرنوں، بل کھاتے دریاؤں اور گل سوسن کے باغات سے مرصع اس آفاقی شاہکار کو ''جنت ارضی'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

ریاست کے تیسرے حصے کو لداخ کہا جاتا ہے۔ جو زنسکار کی چوٹیوں کے آس پاس شمالی مشرقی سرحد پر سطح سمندر سے ۲۳ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ لداخ کو بدھ مذہب کی بھولی بسری داستان بھی کہا جاتا ہے۔ جہاں اب بھی پہاڑی غاروں میں قدیم بدھ عبادت گاہیں موجود ہیں۔ سرخ لباس والے بدھ بیراگی، پیلے لباس والے سادھو اور بدھ عبادت گاہوں پر لہراتے ہوئے مخصوص جھنڈے جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ اسی مناسبت سے لداخ، گلگت اور بلتستان وغیرہ کے علاقوں کو ''تبت خورد'' کہا جاتا ہے۔

کشمیر کے جھیل سے وادی بننے کے بارے میں مختلف روائتیں مشہور ہیں۔ مسلمانوں کے بقول اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اور کرہ ارض کے شہنشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک بار اپنے تخت پر سوار لشکر کے ساتھ ہوا کے دوش پر سفر کررہے تھے۔ کہ ان کی نظر برف سے اٹے ہوئے بلند پہاڑوں میں گھری ایک وسیع وعریض جھیل پر پڑی جس کا منظر دیدنی تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جھیل اور اس کے گردونواح کے مناظر سے متاثر ہوئے۔ اپنے علم سے انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جھیل کی تہہ میں ایک زرخیز زمین اور شاداب وادی ہے۔ جہاں انواع واقسام کے بیج بکھرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی طرح اس جھیل کا پانی نکال دیا جائے تو زمین پر گویا جنت وجود میں آجائے گی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی حوالے سے ایک مجلس منعقد کی جس میں انسانوں کے علاوہ جن اور دیو بھی تھے۔ انہوں نے اس مجلس میں یہ کہا کہ اگر اس پانی کو نکال دیا جائے ہاں لیکن تہہ میں جو بیج موجود ہیں وہ بہنے نہ پائیں یہ کام کون کرے گا۔ اور جو یہ کام کرے گا اس کی ہر تمنا پوری کردی جائے گی۔ کاشو نامی جن جو کہ اس مجلس میں موجود تھا اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میری خواہش یہ ہے کہ میر نامی پری جس سے میں عشق کرتا ہوں پانی نکلنے کے بعد میری اس سے شادی کروائی جائے گی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے خواہش پوری کرنے کا یقین دلایا اور اس کاشو جن نے بارہ مولا کے قریب ایک جگہ سے پہاڑ کاٹ دیا جہاں سے پانی کی ندی جاری ہوگئی۔ یہی ندی ماضی کا دریائے وتاست اور آج کل دریائے جہلم کہلاتی ہے۔ جھیل چونکہ میلوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ جن نے سوچا کہ اس کے خالی ہونے میں کافی عرصہ لگے گا اتنی دیر سو لیا جائے۔ چنانچہ جن پہاڑ کے ساتھ ٹیک لگا کر سو گیا جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جھیل خالی ہوچکی ہے اور بیج بہہ کر باہر جارہے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے بیج واپس پھینکنا شروع کردیے جو کہ ہر طرف پھیل گئے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی کشمیر میں پھولوں اور پھلوں کی بہتات ہے۔

کاشو جن اپنا کام مکمل کرنے کے بعد خوشی خوشی حضرت سلیمانؑ کی مجلس میں حاضر ہوا۔ حضرت سلیمانؑ کو اپنا قول یاد تھا انہوں نے فوراً میر پری کو بلایا اور کاشو سے اس کی شادی کردی۔ اسی وجہ سے اس خطے کا نام کاشومیر پڑ گیا جو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر بن گیا۔ حضرت سلیمانؑ ۹۲۴ قبل مسیح سے ۹۶۴ قبل مسیح تک پیغمبری اور بادشاہت کے مرتبہ پر فائز رہے۔ اس لحاظ سے جھیل کا کشمیر بننا اسی عہد کی یادگار ہوسکتا ہے۔

لیکن دوسری طرف ہندو عقائد اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ راج ترنگنی کا مصنف لکھتا ہے کہ وادی کشمیر ایک زمانے میں بڑی جھیل تھی جس میں ہندو مذہب کے بنیادی دیوتا شو کی بیوی پاربتی دیوی اپنی خوش نما کشتی میں شمال کی

جانب واقع ہرمکھ پہاڑ سے جنوب کی جانب کنسا ناگ جھیل تک سیر کیا کرتی تھی جس کی وجہ سے جھیل ستی سر کہا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے ایک زمانے میں جھیل کے اردگرد بسنے والے لوگوں کو جل دیو نامی ایک شیطان تنگ کیا کرتا تھا۔ برہما دیوتا کا پوتا کیشیا ان کی مدد کے لیے آیا لیکن جل دیو نامی شیطان کیشیا کو دھوکا دے کر پانی کے اندر چھپ گیا۔ اس موقع پر شو دیوتا نے ان کی مدد کی اور ستر شول کی مدد سے بارہ مولا کے مقام پر پہاڑ کو کاٹ ڈالا۔ جس سے جھیل کا پانی نکلنے لگا یہ جگہ موجودہ سری نگر کے قریب بتائی جاتی ہے۔ جب اسے باہر نکالنے کی کوشش ناکام ہوگئی تو پاربتی دیوی نے ایک پہاڑ اس کے اوپر الٹا دیا تاکہ وہ اس کے نیچے دب کر مر جائے۔ بعد میں اس ڈھلوان پر پاربتی دیوی کی پوجا کی جاتی تھی۔

جب پانی جھیل سے نکل گیا۔ زمین ابھر آئی اور شیطان ہلاک ہوگیا۔ تورشی نے ہندوستان کے لوگوں کو آکر وادی میں بسنے کی ترغیب دی۔ انہی لوگوں نے پہلی بار وادی کو کیشا مر اور کیشا بورہ کے نام سے پکارا جو رفتہ رفتہ کشمیر بنا۔ کشمیر بذات خود ایسی زمین کے لیے استعمال ہوتا ہے جو زمین سے نکلی ہو۔ ''کا'' پانی اور ''شمیرا'' سے نکلی ہوئی۔ پرانے زمانے میں یونانی اسے ''کس پیریا'' اور چینی سیاح جس کا نام ہن زانگ تھا۔ اس کے بقول اب کشمیریوں نے کشمیر کو اپنی زبان میں کاشیر کہنا شروع کر دیا ہے۔

ایسے میں اگر پاربتی دیوی کے جھیل میں سیر کرنے کی کہانی کو اگر سچ تسلیم کر لیا جائے تو یہ واقعہ کم از کم ۸۰۰۰ قبل مسیح کا بنتا ہے۔ لیکن ہندو تاریخ میں کشمیر کا پہلا تذکرہ مہا بھارت جنگ سے ذرا پہلے کیا گیا ہے۔ جس میں کشمیر کو محض شمالی ہند میں واقع پہاڑوں میں گھری ایک وادی قرار دیا گیا ہے۔ جس کے راستے پر خطر بتائے جاتے ہیں۔ لیکن کشمیر سے اب تک کے ملنے والے آثار قدیمہ سے یہ دریافت ہوا ہے۔ کہ یہ ۳۰۰۰ قبل مسیح تک کے ہیں۔

آگ:

ناول آگ میں کشمیر کے مختلف طبقوں کی گفتگو، ان کی عادات، ان کی زندگی اور زندگی میں پیش آنے والی تبدیلیوں کا ذکر ملا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ناول ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۵ء تک کے زمانی عرصہ میں کشمیری معاشرت اور تہذیب کا سچا نمائندہ ہے۔ اس ناول میں مصنف نے تین نسلوں کی کہانی بیان کی ہے جو کہ خواجہ غضنفر جو، خواجہ سکندر جو اور خواجہ انور جو کے توسط سے ممکن ہوئی ہے۔ یہ تینوں نسلیں اپنے مزاج اور سوچ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

ناول میں ایک طرف کشمیر کی مقامی سیاست اور دوقومی نظریے کے حوالے سے مسلم لیگ اور کانگرس میں کشمکش کا بیان ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر ہٹلر، اسٹالن گراڈ جاپان اور جرمنی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ مقامی اور بین

الاقوامی تحریکوں کا احاطہ کرتے ہوئے آگ کا کینوس وسیع ہو جاتا ہے۔ ناول میں واقعات کا تنوع ہے۔ اس میں جہاں کشمیر کے تاجر پیشہ اور امراء کی زندگی کو بیان کیا گیا ہے وہاں غریب کشمیریوں، ہانجیوں اور ہاتوؤں کی زندگی کی سچی عکاسی کی گئی ہے۔

عزیز احمد نے اپنے ناول میں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔ کئی مقامات ناول میں ایسے ہیں جہاں قاری کی دلچسپی اور تجسس میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ناول کے آغاز ہی میں جب قافلہ درہ زوجی لا کے پرخطر اور تنگ راستوں پر سفر کر رہا ہوتا ہے تو قاری بھی اس کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اسی طرح ناول میں جب مصنف کشمیری کھانوں، رسوم و رواج، رہن سہن، کشمیری عوام کی مصروفیات اور طرزِ زندگی کو بیان کرتا ہے تو قاری بھی کشمیری معاشرت کو جاننے میں دلچسپی لیتا ہے۔

''آگ'' میں کشمیر کے مناظر کے ساتھ ساتھ کشمیر کے مختلف طبقوں کی گفتگو، ان کی عادات، ان کی زندگی اور نئے عہد میں ان کی زندگی میں جو جو تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں ان سب کو بیان کیا گیا ہے۔ کشمیر آنے والے سیاحوں کی زندگی کی جھلکیاں، سیاست کے میدان میں پرورش پانے والے نئے نظریات اور ان کا ہندوستان اور کشمیر میں جو ردعمل دیکھا گیا ہے اس کا احساس بھی ہے۔

ناول کے تمام کردار کشمیر کے مخصوص ماحول اور معاشرے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں ان میں سے پہلا کردار جو ہمارے سامنے ہے۔ وہ ہے ''غضنفر جو'' کا غضنفر جو کشمیر کا مشہور تاجر اور قالین فروش ہے۔ اس کی عمر پینتالیس یا پچاس سال کے قریب ہوگی۔ مگر داڑھی کے کھچڑی سفید بالوں پر حنا کا سرخ رنگ ایسا غالب تھا کہ سیاہ بال بھی ملگجے سرخ معلوم ہوتے تھے۔ بسیں ترشی ہوئی تھیں اور مونچھیں شرعی اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ سر پر گنج تھا اس لیے باقی بال بھی منڈوا دیئے تھے اور ہر وقت پگڑی باندھے رکھتے تھے۔

یہ کردار قدیم روایات کا پابند ہے لیکن جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ انگریز سیاح کشمیر میں سیاست کی غرض سے آ رہے ہیں۔ تو ان سے لین دین کے لیے ایک کشمیری پنڈت سے انگریزی سیکھ لیتا ہے۔ یہ ایک پیشہ ور تاجر ہے جو نہ صرف اپنے کاروبار کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا ہے۔ بلکہ گاہکوں کو مرعوب اور متاثر کرنے کے فن سے بھی آشنا ہے۔

ناول کا دوسرا کردار ''سکندر جو'' کا ہے۔ یہ ملک التجار غضنفر جو کا بیٹا اور ناول کا مرکزی کردار مانا جاتا ہے۔ سکندر جو علی گڑھ کا تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل نوجوان ہے۔ ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے کشمیر کے ایسے مستمول فرد کو پیش

کیا ہے۔ جس کی ساری زندگی عیاشیوں میں گزری۔ یہ عشق فضلی سے کرتا ہے لیکن شادی دوسری جگہ کر لیتا ہے اور بعد میں میموں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ ناول کا تیسرا کردار انور جو کا ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان اور سکندر جو کا بیٹا ہے۔ ابتداء میں انور جو بھی اپنے والد اور دادا کی روش پر چلنے لگا لیکن ایک واقعے نے اسے بدل دیا جب وہ ایک لڑکی کو بھوک کی وجہ سے دم توڑتے دیکھتا ہے۔ وہ اپنے باپ کی عیاشیوں کو ناپسند کرتا ہے۔ انور جو کشمیر کے سیاسی حالات سے آگاہی رکھتا ہے اور ہندوستان میں ابھرنے والی آزادی کی تحریکوں سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ قائداعظیم سے بھی بہت عقیدت رکھتا تھا۔

ناول میں کردار شعبانا ہانجی کا ہے۔ یہ ڈونگا چلاتا ہے۔ اور اکثر غضنفر جو کے خاندان اور ان کے مہمانوں کو سیر کے لیے لے کر جاتا ہے وہ کشمیر کے مسائل پر اپنے فہم کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ شروع میں اس کے پاس ڈونگا ہوتا ہے۔ مگر کچھ عرصے بعد وہ ہاؤس بوٹ خرید لیتا ہے۔ وہ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات سے بھی باخبر رہتا ہے۔ یہ گفتگو کا بہت ماہر ہے اور ہر جگہ اپنی دخل اندازی ضروری سمجھتا ہے۔ یہ غضنفر جو کا خاص آدمی ہے۔ یہ وہ کردار ہے جس کے ذریعے عزیز احمد نے کشمیر کی زندگی کو پیش کیا ہے۔

ظہری صاحب غضنفر جو کے دوست ہیں یہ علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں اور کشمیریوں کی اس حالت کا علاج جمہوری حکومت کے قیام کے ذریعے دیکھتے ہیں۔ یہ جمہوریت کے نعروں کے ساتھ انقلابی نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ لیکن جب انہیں ملازمت مل جاتی ہے۔ تو یہ جمہوری حکومت کا نعرہ ترک کر دیتے ہیں۔

میجر صاحب کا کردار بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تاریخ فلسفہ، ادب اور دیگر علوم پر عبور رکھتے ہیں۔ یہ باصول اور دیانت دار انسان ہیں جو اعلیٰ درجے کی سیاسی بصیرت رکھتے ہیں۔ ناول میں بہت سے کشمیری مسائل سے آگاہی اسی کردار کے حوالے سے ہوتی ہے۔ کشمیر کی سیاست کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو اس میں ایک اہم کردار کا نام آتا ہے۔ مہتاب جنگ جوڑ توڑ کے ماہر ہیں۔ یہ پہلے ظہری صاحب کو سرکاری ملازمت کے عوض سرکار کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں اور کشمیری لیڈر شیخ عبدالرحمٰن کو بھی تقریباً ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ ممدا ناول میں کبھی کبھی جھلک دکھاتا ہے۔ یہ کشمیری ملازموں کی وفاداری اور مالک پرستی کی زندہ علامت ہے۔

ناول میں کچھ ایسے کردار بھی ہیں جو تھوڑے عرصے کے لیے ناول میں سامنے آنے کے باوجود اپنا بھرپور تاثر چھوڑتے ہیں۔

ناول کے نسوانی کرداروں میں ایک کردار خواجہ غضنفر جو کی بیوی ''کلثوم'' کا ہے۔ یہ کشمیری گھرانے کی روایتی

گھریلو خاتون کا کردار ہے۔ یہ غضنفر جو کی دوسری بیوی ہے جو اکثر لڑتی رہتی ہے۔ ناول نگار نے اس کردار کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش نہیں کیا اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ کشمیری خواتین پردہ کرتی ہیں۔ اور گھروں سے باہر نہیں نکلتیں۔

ناول میں ایک کردار زون کا ہے جو کہ ایک ایسی کشمیری عورت ہے جو اپنی غربت مٹانے کے لیے اپنے حسن کو فروخت کرنے پر مجبور ہے۔ اس کا ماموں زاد اسے بلیک میل کر کے اس سے جسمانی تعلق قائم کرنا چاہتا ہے اور انکار پر اس کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اس کے حسن کو بگاڑ دیتا ہے۔ اس کردار کے حوالے سے عزیز احمد نے ایک ماں کے جذبات واحساسات کو بیان کیا ہے۔

جب زون کا شوہر اپنی بیٹی فضلی کو کمائی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے تو زون اس کی ایک نہیں چلنے دیتی کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے ساتھ میرے جیسا کھیل کھیلا جاسکے۔ ''فضلی'' زون اور رجبا کی بیٹی کا کردار ہے۔ یہ اپنی ماں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ بارہ برس کی عمر میں اس کی شادی ایک نان بائی قادرا کے ساتھ ہو جاتی ہے لیکن وہ اسے کچھ عرصے بعد چھوڑ کر دوسری شادی کر لیتا ہے اور یہ اپنی ماں کے پاس آ جاتی ہے۔

''نور فشاں'' شعبانا ہانجی کی بیوی کا کردار ہے۔ یہ خالص گھریلو عورت ہے جو عام طور پر گھریلو کام کاج میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ سیاحوں میں مسز اشیلے مسٹر ہنری اشیلے کی بیوی کا کردار ہے جو میم صاحب کی صورت میں ناول میں ظاہر ہوتی ہے اس کے انداز بتاتے ہیں کہ اس کے لیے اپنے جسم کو کسی کے سامنے پیش کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اور سکندر جو کے معاملات فوری طے ہو جاتے ہیں۔

مجموعی طور بر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عزیز احمد نے اپنے کرداروں کو بہت عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے اور تمام کردار اپنے اپنے طبقے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں خاص طور پر مقامی لوگوں کے کردار جو ان کے معاشرتی اور سماجی تمدن میں رکھ کر پیش کیے گئے ہیں۔

عزیز احمد نے جہاں بھی مکالمہ نگاری سے کام لیا ہے وہاں بھی بہت مہارت ظاہر ہوتی ہے مکالموں کے ذریعے ہی ہم کرداروں کے ماحول، حالات وواقعات اور جذبات واحساسات سے واقف ہوتے ہیں۔

عزیز احمد نے آگ میں کشمیر کے فطری حسن کو بیان کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ انہوں ے اتنے کمال کے ساتھ منظر کشی کی ہے کہ سارا ماحول قاری کے سامنے سمٹ آتا ہے اور وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اس ماحول کا حصہ ہے اس کے علاوہ کشمیری مسلمانوں کی تہذیب کی بھی واضح تصویریں ملتی ہیں اور یہ محض تاریخ یا واقعات کا بیان نہیں بلکہ ایک

فنکار کے اپنے محسوسات و ناشرات ہیں۔حسن کو ناول کا روپ دیا گیا ہے۔

عزیز احمد نے خود بھی کہا ہے کہ ناول میں کردار و واقعات کے بیان کی بجائے اصل چیز کشمیری معاشرت اور اس کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی مضمرات کا بیان ہے جس کی وجہ سے آگ کو کشمیر کی تہذیبی تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے۔

ناول میں زبان و بیان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پلاٹ خواہ کتنا ہی منظم و مربوط کیوں نہ ہو مواد کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، کردار کتنے ہی بھرپور کیوں نہ ہوں، مناظر جس قدر بھی حسن رکھتے ہوں اگر مصنف کو زبان پر عبور نہیں تو ہر چیز اپنا حسن کھو دیتی ہے۔ آگ کی زبان سادہ، صاف اور رواں ہے۔ مصنف نے مختلف طبقات کے لسانی فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور تمام واقعات و تفصیلات کو تشریح اور بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ انداز قاری کے مزاج پر گراں نہیں گزرتا بلکہ وہ اس کے کرداروں کے اندرونی جذبات و احساسات کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنے لگتا ہے۔

شکست:

کرشن چندر کا پہلا ناول ''شکست'' ہے۔ جو کہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس کا موضوع طبقاتی کشمکش اور رومانوی عشق و محبت کی داستان ہے۔ اس ناول کے اندر فرسودہ نظام کے مقابلے صحت مند فکر اور تازہ ذہن رکھنے والے نوجوان کی فطری وسطی محبت کی شکست میں جدید دور کے انتشار، بے چینی اور کرب کو پوری طرح سے پیش کیا گیا ہے۔

شکست کی کہانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بڑے سلیقے سے ناول کے مختلف واقعات کو یکجا کر کے ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اس ناول میں دو کہانیاں ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہیں اور ان میں بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ان دونوں کا المناک انجام انہیں ایک دوسرے سے مربوط کر دیتا ہے۔ اور اس طرح ان دونوں کہانیوں میں دوری اور بعد ختم ہو جاتا ہے۔ ناول کا کینوس نہ صرف محدود ہے بلکہ اس میں کوئی ندرت بھی نہیں ہے۔ اس ناول میں ایک عام سی کہانی ہے جس میں محبت کرنیوالے سماج کے ضابطوں کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔

ناول میں کرشن چندر نے دیہاتی کشمیری زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ ''شکست'' کے اندر کرداروں کے ذریعے اس نظام اور فرسودہ روایات کو توڑنے کی در پردہ خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ یہی اظہار اور فکر کی تبدیلی ناول میں ترقی پسند عناصر کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ کرشن چندر کا یہ ناول ایک حد تک رومانوی بھی ہے اور اصلاحی بھی، جو سماج میں زمانہ قدیم سے رائج ذات پات اور سماجی بندھنوں کی درجہ بندی کے خلاف تحریر کیا گیا ہے۔ ''شکست'' میں عصری مسائل، بے چینی اور سماجی کرب کو بہترین انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ناول محض نوجوان مرد اور عورت کی داستان نہیں بلکہ اس عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ شیام اس ناول کا ہیرو ہے۔

شیام اور علی جو دونوں کردار سماجی و سیاسی تبدیلیوں اور معاشرتی خرابیوں، پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ شیام اشترا کی فلسفے کا علمبردار ہے اور علی جو کو اس کی متواتر تبلیغ کرتا رہتا ہے۔ ''شکست'' دراصل محبت کرنے والوں کی آویزش ہے۔ کرداروں کی محبت کی ناکامی کا ذمہ دار سماج اور اس کی روایت پسندانہ مذہبی تنگ نظری ہے۔ طبقاتی کشمکش اور مذہبی اجارہ داری، رسم و رواج میں جکڑے ہوئے انسان مسلسل استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اسے بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثلا چندرا اپنے محبوب موہن سنگھ کو نہیں مل سکتی کیونکہ مذہب کے اجارہ دار سروب کشن کو یہ پسند نہیں کہ راجپوت نسل خراب ہو، اسی طرح شیام برہمن ہے اور وہ نیچ ذات اور سماج کی دھتکاری ہوئی ونتی سے شادی نہیں کرسکتا اور نہ اس کی خودکشی پر کوئی افسوس کرتا ہے۔

اس ناول میں کرشن چندر اپنے کرداروں کے ذریعے معاشرتی مسائل بیان کرتے ہیں۔ مثلاً شیام ترقی پسند اور اشترا کی خیالات کی وجہ سے طبقاتی کشمکش، خودغرضی، سماجی جبر و استحصال، عدم مساوات وغیرہ سے نجات کا طالب ہے۔ اور علی جو ایک عملی انسان نظر آتا ہے۔ اس کے کوئی نظریاتی مقاصد بڑے نہیں ہیں وہ دنیا دار آدمی ہے۔ جبکہ شیام عملیت پسندی سے عاری ہے۔

کرشن چندر اس ناول میں ہندوستان میں پیدا ہونے والی سیاسی، سماجی اور اخلاقی تبدیلیوں کے لیے ایک نئے ذہن کی تیاری میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ناول کے بعض کردار سماجی حقیقت نگاری کے آئینہ دار ہیں۔ کرشن چندر انسان دوست ہے۔ اور زمانے کے حالات کو پہچانتا ہے۔ وہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اقدار کے بدلنے سے ذہنوں میں آنے والی تبدیلیوں سے آگاہ ہے۔ اس لیے وہ یہ سمجھتا ہے کہ سماج کو روایتی اقدار کو ترک کرنا ہوگا۔

''شکست'' میں شروع سے آخر تک فطرت کی نگینیاں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ ناول میں فطرت نگاری اکائی ہی بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ کرداروں کا جزو بن کر کلیت میں بدل جاتی ہے۔ اس طرح چندرا اور ونتی کے کردار اس پس منظر سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھے جاسکتے۔ بعض اوقات تو واقعات کا تأثر اور اثر انگیزی بھی تمام تر اس پس منظر سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کی اہمیت اور قدر قیمت کشمیر کے پس منظر میں جدید نسل اور جدید خیالات کی پیش کش اور فرسودہ سماج سے اس کی آویزش پر منحصر ہے۔

آگ میں کشمیر:

ناول میں عزیز احمد نے کشمیر میں بھڑکنے والی ہر قسم کی آگ کو خوبصورت انداز سے پیش کرتے ہوئے انقلاب اور بغاوت کی اس آگ کی طرف اشارہ کیا ہے جو رفتہ رفتہ پورے کشمیر میں پھیل رہی ہے اور یہ کسی بھی وقت بھڑک سکتی

ہے۔ ہندوستان اور کشمیری زندگی میں رفتہ رفتہ جو انقلاب آ رہا ہے عزیز احمد نے اپنے ناول میں اس کی سچی عکاسی کی ہے۔ آگ میں کشمیر کی مفلسی، غربت، بھوک اور نچلے محنت کش طبقے کی زندگی کو پیش کرنے کے ساتھ اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کر کے اس استحصال کو بھرپور طریقے سے نمایاں کیا ہے جو وہاں صدیوں سے جاری ہے۔ ناول کا اصل موضوع کشمیر میں بھڑکتی ہوئی مختلف قسم کی آگ اور اس کا پس منظر ہے۔ یہ ناول ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۵ء تک کے زمانی عرصے پر محیط ہے ''آگ'' کشمیر کے ایک خاندان کی تین نسلوں کی کہانی ہے۔ عزیز احمد نے اس کو اس انداز سے پیش کیا ہے تا کہ کشمیری زندگی کے تمام پیچ وخم اور اتار چڑھاؤ مختلف پس منظروں اور مختلف اوقات میں واضح ہو جائیں۔ غضنفر جو سکندر جو اور انور جو کشمیر کے تین نسلوں کے نمائندے ہیں۔ ان کے عمل اور ردعمل سے کشمیر کی ہمہ جہت تصویر سامنے آتی ہے۔

اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح کشمیری تاجر اور ڈوگرہ شاہی کے افسران غریب اور ناخواندہ کشمیری مزدوروں اور کاریگروں کو لوٹتے رہے ہیں۔ کشمیر کے عوام اپنی جہالت اور غریبی کی وجہ سے نہایت غلیظ ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بھیڑ بکریوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرتے ہیں یہاں تک کہ اپنی عورتوں کے دام وصول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ناول میں کشمیری عوام کی غریبی اور اس کے پس پشت جاگیردارانہ ومہاجنی نظام کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو بہترین انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ ''آگ'' میں کشمیری عوام کی غریبی اور جہالت کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھایا گیا ہے۔ کہ مسلم کانفرنس کی شکل میں ایک سیاسی قوت وادی کشمیر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جما رہی ہے۔ یہ سیاسی قوت ایک ڈوگرہ شاہی کے مظالم کو چیلنج کر رہی ہے تو دوسری طرف ڈوگروں اور مقامی سرمایہ داروں کے اصل آقاؤں یعنی انگریزوں کے خلاف بھی سینہ سپر ہے۔ اس میں ظہری صاحب جیسے درمیانے طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ بھی ہیں۔ جو ابتدا میں جمہوریت پسند نظر آتے ہیں یہ ایک طرف کشمیر کے غریبوں کے دکھ درد سمجھنے کا دعوی کرتے ہیں اور دوسری طرف کشمیری عوام کی جہالت اور پسماندگی کا غم بھی کرتے ہیں یہ کشمیری مزدوروں اور تاجروں کی بھوک، غریبی اور افلاس کو دیکھ کر اپنے خون میں حرارت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ڈوگرہ حکومت کی ملازمت حاصل کرنے پر ہندوستانی اور کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کو پاگل پن قرار دیتے ہیں۔

''آگ'' میں کشمیر کے مناظر کے ساتھ ساتھ کشمیر کے مختلف طبقوں کی گفتگو، ان کی عادات ان کی زندگی اور نئے عہد کی زندگی میں جو تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ ان سب کو خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔ اس میں کشمیر میں آنے والے سیاحوں کی زندگی کی جھلکیاں، سیاست کے میدان میں پرورش پانے والے نظریات اور ان کا ہندوستان اور کشمیر میں جو ردعمل سامنے آ رہا ہے اس کا احساس بھی ہے۔

عزیز احمد نے آگ میں کشمیر کے فطری حسن کی منظر کشی مختصر الفاظ میں ایسے کی ہے کہ قاری کے سامنے سارا منظر سمٹ آتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اس سارے منظر کا ایک حصہ ہے۔ ناول میں کشمیری مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کی بھی واضح تصویر ملتی ہے جو کہ محض تاریخی واقعات کا بیان نہیں بلکہ ایک فنکار کے اپنے محسوسات اور تاثرات ہیں۔ یہی وجہ ہے ''آگ'' کو کشمیری تہذیبی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔ غضنفر جو کے گھر سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیریوں کے مکانات دو یا تین منزلہ ہیں۔ گلیاں تنگ ہیں اور مکانوں کی منزلوں کے چھجے چولی ہوتے ہیں۔ جن پر زیادہ تر محرابوں کی شکل کے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح کشمیری کھانے اور ان کے آداب بھی بتائے گئے ہیں۔

کشمیری عورتوں کی زندگی اور ان کے روزمرہ کے معمولات کو ناول میں بہترین انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں امیر و غریب دونوں طبقوں کی عورتوں کا ذکر ہے۔ پہلے طبقے میں وہ مقامی عورتیں ہیں جو مزدور پیشہ اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ عورتیں بغیر پردے کے آزادی کے ساتھ کھیتوں، باغوں اور دریاؤں میں اپنے شوہروں کے ہاتھ بٹاتی ہیں اور دوسرے طبقے میں غضنفر جو کی بیوی کلثوم، سکندر جو کی بیوی بتول اور انور جو کی بیوی شامل ہیں۔ لیکن دونوں یکساں طور پر مظلوم اور بے بس ہیں۔ بلکہ غریب طبقے کی عورت کی غلامی دہری ہے وہ سرمایہ دار کی بالواسطہ اور مرد کی بلاواسطہ لونڈی ہے۔

ناول میں ایک طرف افلاس اور غربت میں اضافہ کرنے والوں کی زندگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جو روز بروز امیر سے امیر ہوتے چلے جارہے ہیں یہ اپنے سرمائے سے کشمیری غریبوں کی محنت، عزت اور حمیت کو کوڑیوں کے مول خرید لیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی امارت میں اضافہ کرنے کے لیے ہر جائز ناجائز کام کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ دوسری طرف ناول میں عام کشمیری مسلمانوں کی حالت زار کا بیان ہے جو استحصالی طبقے کے سامنے اپنے آپ کو، اپنے وجود کو، اپنی روح کو بے بس محسوس کرتے ہیں۔

عزیز احمد نے جہاں کشمیر کے دوسرے معاشرتی مسائل کو بیان کیا ہے وہاں جنس کا بیان بھی ہے۔ اور اسے بھی مفلسی سے منسلک کیا ہے مثلاً زون کا شوہر رجبا اپنی بیوی کو خواجہ غضنفر جو کے پاس بھیجتا ہے تو اس کا مقصد اس کے ذریعے پیسے حاصل کر کے اپنی غربت کو ختم کرتا ہے۔ مصنف نے کشمیری عوام کے استحصال اور افلاس کا اصل سبب ان کی جہالت کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اسی جہالت کے سبب وہ بھیڑوں کی طرح چراگاہوں سمیت خرید لیے جاتے ہیں اور نہایت غلیظ اور گھناؤنے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی جہالت کی بدولت وہ مار کھاتے ہیں، بھوکے رہتے ہیں اور دانستہ اپنی عورتوں کی عصمت سرمایہ داروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ ''آگ'' میں کشمیری تہذیب و معاشرت کی سچی تصویر ملتی ہے اور مجموعی طور پر کشمیر کی ایک ایسی تصویر سامنے آتی ہے جو بڑی بھرپور اور متاثرہ کن ہے۔

شکست میں کشمیر:

''شکست'' کشمیر کی زندگی کا بیان ہے۔ کرشن چندر کی زندگی کا ابتدائی زمانہ کشمیر میں گزرا، انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے اردگرد افلاس، بے بسی اور مصائب کے مارے ہوئے کشمیریوں کو دیکھا اس لیے ان کے بیان میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ کرشن چندر کشمیر کے مناظر کے ذریعے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس خوبصورت منظر کے پس منظر میں کس قدر بدصورتی ہے۔ انہوں نے خوبصورت کشمیر کے اندر بسنے والے ان کشمیریوں کے مسائل کو بیان کیا ہے جو صدیوں سے استحصال کا شکار رہے ہیں۔ اس طرح کشمیر کا حسن اور کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی مجبوری اور بے چارگی ہی اس ناول کا موضوع ہے۔ اس موضوع سے کرشن چندر خود بھی بے حد متاثر تھے اور اس کا احساس ناول پڑھتے ہوئے بھی ہوتا ہے۔

کرشن چندر نے نہ صرف کشمیر کے قدرتی مناظر کا بیان کیا ہے۔ بلکہ مختلف کرداروں کے ذریعے کشمیری لوگوں کے رہن سہن کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے سامنے کشمیری تہذیب و ثقافت کا نقشہ گھوم جاتا ہے۔ مثلاً پنڈت سروپ کشن کو برہمن ہونے کی وجہ سے اس معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس کے گھر کا نقشہ کچھ اس طرح سے بیان کیا گیا ہے پنڈت سروپ کشن کا دومنزلہ مکان مہنڈرا اور موضع دھرہ کی بیچ کی گھاٹی میں ایک بلند جگہ پر واقع تھا۔ یہاں سے ساری وادی کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ غالباً وادی کی سطح مرتفع پر یہ سب سے اونچی جگہ تھی اور برہمنوں کا سردار ہونے کی وجہ سے اس کی شان کے شایان تھی۔

کرشن چندر کشمیر کی دیہاتی زندگی کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں کی موسمی رسومات، ان کے علاقائی ناچ، فصلوں کے پکنے کے ایام میں کسانوں کی خوشیاں، پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویر بن جاتی ہیں۔

اس ناول کے شروع سے آخر تک فطرت کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ناول میں فطرت نگاری اکائی ہی بن کے رہ جاتی ہے بلکہ کرداروں کا جزو بن کر کلیت میں بدل جاتی ہے۔ اس طرح چندرا اور ونتی کے کردار اس پس منظر سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھے جاسکتے۔ بعض اوقات تو واقعات کا تاثر اور اثر انگیزی تمام تر اس پس منظر سے وابستہ ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کی اہمیت اور قدر و قیمت کشمیر کے پس منظر میں جدید نسل اور جدید

خیالات کی پیش کش اور فرسودہ سماج سے اس کی آویزش پر منحصر ہے۔

کرشن چندر کا اپنا بچپن چونکہ کشمیر میں گزرا تھا اس لیے کشمیر کی وادیاں، کوہسار، آبشاریں، ناریل کے درخت، بل کھاتی پگڈنڈیاں ان کی شخصیت میں اس طرح رچ بس گئے تھے جو کشمیر کے موضوع پر لکھنے والے ہمیں دوسرے ناول نگاروں کے ہاں نظر نہیں آتے۔

''شکست'' کے مطالعہ سے کرشن چندر کے بنیادی میلانات اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے جنھوں نے آگے چل کر ایک واضح صورت اختیار کر لی تھی۔ مثلاً وہ یہاں ایک ایسی حکومت کے خواہاں تھے جہاں ظلم و تشدد نہ ہو لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ایسی حکومت کہیں بھی نہیں تو وہ ذہنی خلفشار کا شکار ہو جاتے ہیں اور ناول کے کردار شیام کی طرح سوچتے ہیں۔

کرشن چندر نے اپنے اشتراکی نقطہ نظر اور ترقی پسندانہ فکر کی عملی صورت موہن سنگھ اور چندر کے کرداروں میں پیش کی ہے۔ شیام تعلیم یافتہ اور اشتراکی تعلیمات سے واقف ہونے کے باوجود اپنے میں بغاوت کی قوت نہیں پاتا جبکہ موہن سنگھ اور چندرا ان پڑھ اور اشتراکیت سے عدم واقفیت کے باوجود بھی عملی طور پر ترقی پسند اور انقلابی ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مصنف نے یہاں یہ بتایا کہ حالات کے خلاف بغاوت کا جذبہ وہ باطنی قوت ہے جو خود بخود سماجی ناانصافی اور ظلم کے خلاف ردعمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔

''شکست'' ایک ایسا ناول ہے جس میں کشمیر کا قدرتی حسن خاص طور پر اونچے اونچے سرسبز پہاڑ، چیڑھ اور چنار کے درخت، برف پوش چوٹیاں، گیت گاتی ہوئی آبشاریں مترنم چشمے اور بل کھاتی ہوئی ندیاں کشمیر کا مکمل اور سچا منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ کرشن چندر کے اس ناول کی جان اس کے اسلوب میں ہے۔ ناول میں ان کا شائستہ اور لطیف اسلوب بیان بھی تلخ حقیقتوں کو بہت حد تک کم کر دیتا ہے۔ جس سے قاری کے اعصاب پر یہ ناول بوجھ نہیں بنتا۔

سفارشات

☆ اس مقالے میں قبل از تقسیم کشمیر کی تہذیب و ثقافت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ اس سلسلہ کو آگے بڑھایا جائے۔

☆ اردو افسانوی ادب میں کشمیر ایک اہم موضوع کے طور پر ظاہر ہوا ہے اس موضوع کو مختلف جہات سے تحقیق کا کام عمل میں لایا جانا چاہیے۔

☆ موجودہ صورت حال میں کشمیر جس کرب ناک حالت سے دو چار ہے اسے تاریخی پس منظر میں پیش کیا جانا چاہیے۔ تاکہ مظلوم کشمیریوں کی دوسو سالہ اذیت ناک زندگی جس طرح ادبی پہلوؤں سے عیاں ہوئی ہے کا تحقیق وتنقیدی احاطہ ہو سکے۔

☆ گو کہ پاکستان میں ''کشمیریات'' ایک اہم موضوع کے طور پر موجود ہے اور مختلف جامعات میں تاریخ، سیاست، ذرائع ابلاغ اور زبان و ادب کے شعبہ جات اس پر تحقیقی اور تنقیدی کام کر رہے ہیں اسی شدت سے اردو ادب میں بھی تحقیق وتنقید کے ذریعے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ مذکورہ مقالے کشمیر کی ثقافت کی ذیل میں ذرائع معاش کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو کہ صنعت وحرفت پر مبنی ہے اور زرعی اجناس سبزیوں اور پھلوں کی کاشت اہم ذریعہ ہے اس موضوع کو لے کر الگ سے بھی تحقیق وتنقید کا کام ہوسکتا ہے۔

☆ مذکورہ مقالہ دو ناولوں تک محدود تھا اسے دیگر اصناف سخن مثلاً افسانہ، شاعری، سفرنامہ کی ذیل میں بھی تہذیبی و ثقافتی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ آنے والے محققین ادب کے لیے رستہ ہموار کر دیا گیا ہے۔

☆ کشمیر کے سیاسی وسماجی مسائل اس کی معاشرت سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ انہیں اردو ادب میں تحقیق کے ذریعے پیش کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ آنے والے محققین کے لیے یہ ایک اہم موضوع ہوسکتا ہے۔

☆ زبان کسی تہذیب و ثقافت کا اہم جزو ہوتی ہے۔ لسانیات کے ماہرین کے لیے کشمیر میں بولی جانے والی زبانوں پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔

☆ جامعات کی سطح پر اردو ادب اور کشمیر کے تعلق کے حوالے سے سیمینارز اور کانفرنسوں کی بے پناہ ضرورت ہے۔ اس امر کی طرف توجہ دی جانی چاہیے۔

☆ کوئی بھی کام کبھی مکمل نہیں ہوتا اس میں بہتری کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ آئندہ کوئی اور محقق تمام کمی کوتاہی دور کرسکتا ہے۔

کتابیات

☆ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اول، س ن

☆ احمد حسن، کرشن چندر کے سماجی اور ادبی نظریات، آج کل، ۱۹۷۷ء

☆ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، ادب اور انقلاب، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۹ء

☆ اسلوب احمد، انصاری، اردو کے پندرہ ناول، علی گڑھ یونیورسٹی بک ڈپو، علی گڑھ، طبع اول، ۲۰۰۳ء

☆ اشتیاق احمد، مرتبہ: کلچر (منتخب تنقیدی مضامین)، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۷ء

☆ اشرف، کمال، تنقیدی تھیوری اور اصلاحات، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء

☆ اعتزاز احسن، سندھ ساگر اور قیام پاکستان، مترجم: مستنصر جاوید، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء

☆ اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر، کرشن چندر کی ناول نگاری، ناشر: از خود مصنف بہ تعاون مہارا اردو اکادمی (انڈیا) طبع دوم، ۲۰۰۷ء

☆ الک گھوش، ہندوستانی معیشت، ص نمبر ۴۱، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۷۴ء فروری

☆ انور پاشا، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو ناول، ۱۹۳۶ء-۱۹۴۷ء

☆ انور سدید، نیرنگ خیال، ستمبر، اکتوبر، جلد ۵۹، شمارہ ۶۵۹-۶۵۸، راولپنڈی، ۱۹۸۲ء

☆ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اشاعت چہارم، ۱۹۹۹ء

☆ ایم اے خان، کشمیر تاریخ کے آئینے میں، لالہ زار پبلشرز میر پور، آزاد کشمیر، ۱۹۹۱ء

☆ بازغہ قندیل، اردو ناول میں زوال فطرت انسانی کی تمثیلات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۱۲ء

☆ بخاری، مُنیر احمد، کشمیر حقائق کے آئینے میں، احباب پبلیشرز لاہور ۱۹۹۸ء

☆ تاراچند، ڈاکٹر، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، مجلس ترقی ادب لاہور ۲۰۰۰ء

☆ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

☆ تحسین جعفری، کشمیری، کشمیر لوک روایات کے آئینے میں، الفیصل پرنٹرز، لوک ورثہ، ۲۰۱۳ء

☆ جگدش چندر ودھاون، کرشن چندر، شخصیت اور فن، نگار شات، لاہور، ۱۹۹۳ء

☆ جگدیش چندر ودھاون، کرشن چندر: شخصیت اور فن، نگار شات، لاہور، ۱۹۹۷ء

☆ جلالپوری، علی عباس، روح عصر، تخلیقات لاہور ۲۰۱۰ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۷ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء

☆ جواد یاسر، کشمیر و لداخ، الفیصل، لاہور، سن ۲۰۱۴ء

☆ حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر، ادب: علمی و فکری زاویے، نفیس اکیڈمی، کراچی، باراول، جنوری ۱۹۹۴ء

☆ حمیداللہ، صاحبزادہ، موئف: فن اور تکنیک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

☆ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، عزیز احمد، ادب، تاریخ او رتہذیب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء

☆ حیات افتخار، کرشن چندر کے ناولوں میں ترقی پسندی، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۲ء

☆ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۰۵ء

☆ خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۱۹۹۲ء

☆ خاور جمیل، ادب، کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی کراچی ۱۹۸۶ء

☆ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، خطباب اقبال، بک کارنر جہلم ۲۰۱۴ء

☆ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر و دیگر، مدیر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد چہارم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع دوم، ۲۰۱۰ء

☆ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر و دیگر، مدیر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد پنجم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع دوم، ۲۰۱۰ء

☆ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، طبع دوم، ۱۹۶۴ء

☆ ڈی ڈی کوسمبی، قدیم ہندوستان تہذیب و ثقافت، بک ہوم، لاہور، ۲۰۱۲ء

☆ رابرٹ بریفالٹ" (مترجم، عبدالمجید سالک) تشکیل انسانیت، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء

☆ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اردو میں تاریخی ناول نگاری، ابلاغ، لاہور، ۱۹۹۴ء

☆ رفعت اقبال، ڈاکٹر، خرد افروضی اور روشن خیالی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۱۲ء

☆ رفیق مسعود، ڈاکٹر، شیرازہ، سرینگر کشمیر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، جلد ۴۵، شمارہ، ۸ تا ۱۱

☆ روتھ بنی ڈکٹ، قدیم تہذیب اور جدید انسان، مترجم: قاسم محمود، ڈاکٹر، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۶۴ء

☆ زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریک علیحدگی کا آغاز، نگارشات، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۵ء

☆ زوار حسین، تہذیب، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۰ء

☆ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، دانیال لاہور ۲۰۱۷ء

☆ سبط حسن، سید، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، کراچی، تیرہویں بار، ۲۰۰۹ء

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، مضمون، کلچر کی لہریں، مشمولہ: ادب اور کلچر مکتبہ عالیہ لاہور، س ن

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، داستان اور ناول: تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، داستان اور ناول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

☆ سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر، عزیز احمد کی ناول نگاری، موڈرن پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی، پہلی بار، ۱۹۸۶ء

☆ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری: اردو ناول کی تاریخ و تنقید، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۶ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، سنگ میل لاہور، ۲۰۰۱ء

☆ سید علی حیدر، ڈاکٹر، اردو ناول: سمت و رفتار، شبستان، شاہ گنج، الہ آباد ۱۹۹۹ء

☆ شمیم احمد، ناول نگاری کا غالب رجحان۔ تخلیقی ادب، جلد: ۲ مینا پریس کراچی ۱۹۸۰ء

☆ شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر، اردو ناول کے اسالیب، تخلیق کار پبلیشرز، دہلی، ۲۰۰۵ء

☆ شہزاد حسین (مرثیہ) افسانے، نذر سنز لاہور ۱۹۹۲ء

☆ صابر آفاقی، ڈاکٹر، تاریخ کشمیر، سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء

☆ صالحہ زرین، ڈاکٹر، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ (ابتدا سے ۱۹۴۷ء)، ادارہ نیا سفر، الہ آباد (انڈیا)،

☆ عبدالسلام صدیقی، کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۴ء

☆ عبدالسلام، اردو ناول بیسویں صدی میں، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۳ء

☆ عبدالسلام، ڈاکٹر، فن ناول نگاری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اول، ۱۹۹۹ء

☆ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، کا وان ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء

☆ عزیز احمد، جون ۲۰۰۵ء، برصغیر میں اسلامی کلچر (ترجمہ) جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

☆ عزیز احمد، نسل اور سلطنت (تاریخ اور سیاسیات میں نسل کا تصور) انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۱

☆ عزیز احمد، عزیز احمد کے چار ناول، گریز، ہوس، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

☆ عقیلہ بشیر، ڈاکٹر، عزیز احمد کے ناولوں میں عورت کا جنسی اور رومانوی پہلو اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاؤالدین زکریا۔ یونیورسٹی ملتان

☆ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۴ء

☆ عمر زبیری، پروفیسر، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، دارالشعور لاہور ۲۰۰۹ء

☆ فاروقی، محمد احسن، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، لکھنو: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۲ء

☆ فاروقی، طاہر منصور، عزیز احمد کے چار ناول، الحمد پبلی کیشنز، حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶ء

☆ قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء

☆ کرشن چندر، طوفان کی کلیاں، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۶ء

☆ کرشن چندر، شکست، طبع اول، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء

☆ کے، کے، کھلر، اردو ناول کا نگار خانہ، لاہور: فینس بکس، ۱۹۹۱ء

☆ گیلانی، ذوالفقار ارشد، تاریخ کا سفر، علم دوست پبلی کیشنز، س ن

☆ محمد اسلم فاروقی، ڈاکٹر، عزیز احمد کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ، ۲۰۱۵ء، روشان پرنٹرز

☆ محمد اشرف ٹاک، ولی محمد اسیر کشتواڑی، ماہنامہ شیرازہ، سرینگر، کشمیر، جلد نمبر ۴۵، شمارہ نمبر ۸ تا ۱۱، سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینٹ لینگویجز

☆ محمد اویس قرنی، کرشن چندر کی ذہنی تشکیل، ملاقات پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

☆ محمد عبدالمجید، خواجہ، ہندوستان کی اقتصادی تاریخ، دہلی، مٹیا محل، قدوسی پریس دہلی

☆ محمد مجیب، دنیا کی تاریخ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۰۹ء

☆ محمد عارف، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۱ء

☆ مفتی عکسی، پاکستانی ثقافت، الفیصل لاہور، ۲۰۱۴ء

☆ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، لاہور: فکشن ہاوس، ۲۰۱۲ء

☆ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر (تنقید) مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی، لاہور، طبع ثانی، اپریل ۲۰۰۷ء

☆ میر، جی ایم، جموں کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں، مکتبہ رضوان آزاد کشمیر ۲۰۰۱ء

☆ ناصر عباس، نیر، مابعد نو آبادیات: اردو کے تناظر میں، کراچی: دی ٹائمز پریس، ۲۰۱۳ء

☆ نعیم مظہر اور فوزیہ اسلم، اردو ناول: تفہیم و تنقید، پاکستان: ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۰۵ء

☆ وزیر آغا، ڈاکٹر، مضمون، ثقافت، ادب اور جمہوریت، مشمولہ: کلچر، از اشتیاق احمد (مرتب) بیت الحکمت لاہور، ۲۰۰۷ء

☆ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

☆ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، آندھرا پردیش، ۱۹۷۳ء

International Islamic Univ.
CE
LI
ISLAMABAD